اس دنیا کی زندگی تو صرف کھیل تماشہ ہے۔ آخرت کا گھر ہی حقیقت میں باقی رہنے والا ہے۔ کاش لوگ اس حقیقت کو جان لیتے! (العنکبوت: ۶۴)

And the life of this world is nothing but a sport and play, and surely the next abode is everlasting if they knew.

وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

الاحسان

کتابی سلسلہ

الہ آباد

کتابی سلسلہ

4

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلہ

الاحسان

کتابی سلسلہ الہ آباد

سرپرست: داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی

مدیر: حسن سعید صفوی

مرتبین

مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی، رفعت رضا نوری

معاونین

محمد عمران ثقافی، عارف اقبال مصباحی، کتاب الدین رضوی

شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)
E-mail :alehsaan.yearly@gmail.com
shahsafiacademy@gmail.com

سلسلۂ مطبوعات شاہ صفی اکیڈمی نمبر (۶)

کتابی سلسلہ: الاحسان (شمارہ نمبر۔۴)

مدیر: حسن سعید صفوی

ترتیب: مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی، رفعت رضا نوری

سال اشاعت: مارچ ۲۰۱۳ء / ربیع الآخر ۱۴۳۴ھ

کمپوزنگ: رکن الدین سعیدی

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ / خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

قیمت فی شمارہ:	Rs.100
لائبریری اور سرکاری اداروں کے لیے:	Rs. 225
بیرونی ممالک:	$ 20

Alehsaan (*A Journal on Islamic Spirituality*)
Published by: Shah Safi Academy, Jamia Arifia
Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P.(India)212213
Ph:8382923993/9026981216-Email:alehsaan.yearly@gmail.com

اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!

انتساب

بانی سلسلۂ صفویہ، شیخ الاسلام، مخدوم الانام

حضرت شیخ عبد الصمد مخدوم شاہ صفی قدس سرہٗ

(وفات: ۱۹ محرم الحرام ۹۴۵ھ / ۱۷ جون ۱۵۳۸ء)

کے نام

جن کے توسط سے چشتی، قادری اور سہروردی فیضان حضرت میر عبد الواحد بلگرامی، شاہ برکت اللہ مارہروی، مولانا عبد المجید قادری بدایونی، سید عبد الرحمٰن لکھنوی، مخدوم شاہ خادم صفی صفی پوری، مخدوم شاہ عارف صفی الہ آبادی اور امام احمد رضا قادری بریلوی تک پہنچا۔

مشمولات

غزل

ہر ذرہ یہاں آئینۂ حسن ازل ہے
ہر شے میں یہاں اس کی ہی تصویر نقل ہے

مے خانے میں گم رہنے دے یہ وجہ سکوں ہے
واعظ تری دنیا میں فقط بحث و جدل ہے

دستار مشیخت کو تو جا رکھ کے کہیں آ
اے شیخ! یہ مے خانے کا دستور عمل ہے

ایمان اسے کہتے ہیں جس میں کہ ہو تصدیق
احسان جسے کہتے ہیں وہ حسن عمل ہے

اک چیز جو سعیدؔ ہے وہ حسن عمل ہے
باقی تمام علم و عمل کارِ دغل ہے

○○○

ابتدائیہ

طریقت شریعت کے بغیر حرام ہے جب کہ شریعت طریقت کے بغیر ناتمام۔ اسی طرح علم بے معرفت ایک وبال ہے اور بغیر علم کے معرفت کا حصول ایک امر محال ہے۔ حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی کی سرپرستی میں شائع ہونے والا مجلہ کتابی سلسلہ ''الاحسان'' کا مقصد اسی فکر کو عام کرنا اور اس کی طرف جذبۂ عمل کو تحریک دینا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ''الاحسان'' شریعت وطریقت کا نقیب اور اس حوالے سے اہل علم و دانش کے لیے علمی مکالمے کا ایک سنجیدہ پلیٹ فارم ہے۔ تصوف کو تمام تر داخلی کوتاہیوں اور خارجی اتہامات سے پاک کر کے عصر حاضر کی پریشان ومضطرب روح کو راحت وسکون فراہم کرنا اور تشنگان علم وعرفان کے لیے نہایت صاف وشفاف مشرب عطا کرنا بھی ''الاحسان'' کی ترجیحات میں شامل ہے۔

....

صوفیہ نے اخلاق کی بلندی اور کردار کے حسن پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اسلام نے اخلاق کے ہنر سے ہی دنیا کو فتح کیا اور اس کا یہی ہنر آج بھی عصر حاضر کی پریشان خاطری کی تسکین اور اس کے روحانی درد کا درماں فراہم کرسکتا ہے۔ ارباب فکر ودانش اور صاحبان بصیرت نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ عصر حاضر کی مسیحائی تصوف اور صرف تصوف کرسکتا ہے۔ ایسے میں تصوف پر کام کرنا اور اس کے فروغ کی کوشش کرنا اسلام کا اخلاقی مطالبہ اور مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔ چوں کہ تصوف اور صوفیہ کو بدنام کرنے میں معاندین نے علمی حملے بھی کیے ہیں جن کا جواب نہایت علمی انداز میں دیا جانا چاہیے۔ مجلہ الاحسان گزشتہ سالوں میں یہی فریضہ انجام دیتا رہا ہے۔ لیکن چوں کہ تصوف کے حوالے سے غلط فہمیوں کا دائرہ صرف اردو ادب تک محدود نہیں، عربی اور

انگلش زبانوں میں بھی یہ زہر گھولا گیا ہے، اس لیے حضرت داعی اسلام نے اس سال سے الاحسان کو عربی زبان میں بھی شائع کرانے کا فیصلہ کیا۔ الاحسان کا پہلا عربی شمارہ نہایت معیاری مواد اور جاذب نگاہ پیش کش کے ساتھ شائع ہو چکا ہے جسے شاہ صفی اکیڈمی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اب ان شاء اللہ العزیز تسلسل کے ساتھ الاحسان عربی کی اشاعت جاری رہے گی۔

....

الاحسان عربی کی اشاعت کا بنیادی مقصد عالمی سطح پر احیائے تصوف کے مشن کے لیے ذہن سازی اور علمی دلائل سے محبت کے ساتھ تصوف یا اسلام کے اخلاقی پہلو کے حوالے سے اپنوں اور بیگانوں کے شبہات کا ازالہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الاحسان عربی کے بیک کوَر پر حضرت داعی اسلام کے اس پیغام کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا:

تعالوا الی تکوین عالم جدید
عالم الأمن و السلام و عالم الروح و الدین
و الی احداث ثورة اسلامیة علی مبدأ الصوفیة الصافیة
فان طریقھم ھو خیر الطرق و سیرتھم أحسن السیر
فلا أحب ثورة الا اذا کانت علی طریقھم الذی ھو عین الشریعة المحمدیة

”آؤ ایک نئی دنیا آباد کریں
امن و سلامتی کی دنیا، روحانیت اور دینداری کی دنیا
اور صوفیہ صافیہ کے نقش قدم پر ایک اسلامی انقلاب برپا کریں
کیوں کہ صوفیہ کا طریقہ ہی سب سے اچھا اور انہیں کا کردار سب سے اعلیٰ ہے
اس لیے مجھے صرف وہی انقلاب پسند ہے جو صوفیہ کے طریقے پر ہو جو کہ عین شریعت محمدی ہے“

الاحسان عربی کی اشاعت کے پیچھے احیائے تصوف کے عظیم مشن کے ساتھ علما و مشائخ عرب و عجم کے بیچ پیدا گہری خلیج کو بھی پاٹنا ہے۔ اسی لیے پہلے شمارے سے ہی اس بات کی کوشش کی گئی کہ عرب و عجم کے اساطین کے مقالات و مضامین شامل ہوں تا کہ اس گلوبلائزیشن کے دور میں علما و مشائخ اہل سنت علاقائیت کے اسیر نہ رہ جائیں۔ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے۔ اہل سنت جو صوفی المشرب ہیں دنیا کے تمام گوشوں میں آباد ہیں۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ کم از کم انفجار معرفی Explosion of Information کے اس عہد میں ان کے بیچ کسی قسم کا کوئی فاصلہ نہ رہنے پائے۔ مجلہ الاحسان عربی اپنے اس ہدف میں کتنا کامیاب ہے، اس کا اصل فیصلہ تو قارئین کریں گے البتہ اس کی مجلس شوریٰ کے ارکان پہ نظر کریں تو بھی اس کے کینوس کی

وسعت وہمہ گیریت کا ایک اجمالی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مجلہ الاحسان عربی کی مجلس شوریٰ میں مصر سے یہ نام شامل ہیں:

(۱) ڈاکٹر مفتی علی جمعہ مفتی اعظم مصر (۲) ڈاکٹر عبدالہادی القصبی شیخ المشائخ سلاسل صوفیہ قاہرہ (۳) ڈاکٹر شیخ محمد مہنا مشیر قانون شیخ الازہر واستاذ انٹرنیشنل لا جامعہ ازہر (۴) ڈاکٹر طٰہ حبیشی صدر شعبہ تحقیدہ وفلسفہ، جامعہ ازہر۔ (۵) شیخ جمال فاروق استاذ دعوہ کالج، جامعہ ازہر (۶) ڈاکٹر ابراہیم الہدہد ڈین آف عربک ڈپارٹمنٹ، جامعہ ازہر (۷) شیخ محمد خالد ثابت معروف ادیب و مصنف انصاف الامام احمد رضا وبانی دارالمقطم مصر

الاحسان عربی کی مجلس شوریٰ میں ہندوستان سے جو نام شامل ہوئے ہیں وہ اس طرح ہیں: (۱) شیخ ابوبکر احمد بانی جامعہ مرکز الثقافۃ السنیہ، کیرالا (۲) پروفیسر مسعود انور علوی صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (۳) پدم شری پروفیسر اختر الواسع صدر شعبۂ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی (۴) شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب آستانہ عالیہ قادریہ بدایوں (۵) حضرت مولانا عبدالحفیظ مصباحی سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ مبارک پور اعظم گڑھ (۶) خطیب الہند مولانا عبیداللہ خان اعظمی سابق ممبر پارلیامینٹ حکومت ہند (۷) ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد منعمی خانقاہ منعمیہ متن گھاٹ پٹنہ (۸) ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی استاذ شعبۂ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد (۹) پروفیسر مصطفیٰ شریف ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد۔

مجلس شوریٰ میں شامل ناموں کا تنوع الاحسان کے وسیع کینوس کی تفہیم کے لیے کافی ہے۔ رہے مضامین ومواد تو یہ قابل دید ہیں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ؟

....

مجلہ الاحسان عربی ایڈیشن کے پہلے شمارے کے ساتھ حضرت داعی اسلام نے اس سال جامعہ ازہر مصر کا دورہ کیا۔ یہ دورہ دعوتی وتبلیغی بھی تھا اور تعلیمی اور سفارتی بھی۔ حضرت ۱۳ر فروری سے ۲۳ر فروری تک مصر میں مقیم رہے۔ اس دوران صبح سے شام تک طلبۂ جامعہ ازہر بطور خاص وہ طلبہ جن کا تعلق برصغیر ہند و پاک سے ہے، کی آمد ورفت کا سلسلہ لگا رہا۔ گروہ در گروہ طلبہ آتے، حضرت کی صحبت فیض میں بیٹھتے، ان کے ناصحانہ کلمات سماعت کرتے اور خوب حظ اٹھاتے ۔حضرت کی مجلس کا ایک عام اثر یہ ہے کہ طالب جب تک آپ کی مجلس میں شریک رہتا ہے اس پر آخرت کی فکر غالب رہتی ہے۔ یہی وہ سب سے خاص بات ہے جو ہر نو وارد کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ یہ روحانی کیف اس سفر کی ہر مجلس میں بھی طاری رہا۔

طلبہ کے علاوہ بڑی تعداد میں جامعہ ازہر کے اساتذہ اور مصر کے علما ومشائخ بھی تشریف

لاتے رہے۔ جو ممتاز علما حضرت کی قیام گاہ پر حضرت سے ملنے آئے ان میں چند کے نام یہ ہیں:

(۱) ڈاکٹر طٰہٰ حبیشی، صدر شعبۂ عقیدہ وفلسفہ، کلیہ اصول الدین، جامعہ ازہر

(۲) ڈاکٹر جمال فاروق، استاذ کلیۃ الدعوۃ، جامعہ ازہر

(۳) ڈاکٹر فتحی حجازی، استاذ عربی کالج، جامعہ ازہر

(۴) ڈاکٹر جمال رجب سید بی، استاذ فلسفۂ اسلامی، نائب صدر کلیۃ التربیہ، جامعہ سویس

(۵) ڈاکٹر حسن نجار، استاذ عربی کالج جامعہ ازہر

(۶) شیخ یحیٰ کتانی، مدرس جامع ازہر، قاہرہ

مجمع اللغۃ العربیہ قاہرہ مصر کے چیئرمین اور شیخ الازہر کے مشیر فنی ڈاکٹر شیخ حسن شافعی جو مصر کے ممتاز ترین علما و مشائخ میں سے ایک ہیں ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ حضرت کی گفتگو سے بہت محظوظ ہوئے۔ انہوں نے حضرت سے اجازت وخلافت طلب کی اور آپ نے انہیں مختلف سلاسل کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ان کے علاوہ معروف محدث خطیب عرب شیخ ڈاکٹر احمد عمر ہاشم، شیخ ڈاکٹر مہنا مشیر قانون شیخ الازہر اور معروف قلم کار شیخ خالد ثابت اور بعض دوسرے علما و مشائخ سے بھی ملاقاتیں رہیں۔

۱۹ فروری کو دوپہر (ہندوستانی وقت سے ۵ تا ۶ بجے شام) کو شیخ الازہر سے ملاقات کا Appointment تھا۔ حضرت تشریف لے گئے اور شیخ الازہر سے ارگھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو رہی۔ اس ملاقات کی رپورٹ خود شیخ الازہر کے آفس (مشیخۃ الازہر) نے اپنی ویب سائٹ پر باتصویر شائع کی۔ یہاں اس رپورٹ کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

”ہمیں یقین ہے کہ جامعہ ازہر عالم اسلام کو فرقہ پرستی سے بچا سکتا ہے
شیخ احسان اللہ بنام الامام الاکبر

۱۹ فروری ۲۰۱۳ء/ ۴۹:۵ بجے

شیخ الازہر الامام الاکبر ڈاکٹر احمد طیب نے شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی شیخ طریقت سلسلۂ چشتیہ نقشبندیہ اور بانی جامعہ عارفیہ الہ آباد الہند اور ان کے وفد کا استقبال کیا۔ یہ ملاقات جامعہ ازہر اور جامعہ عارفیہ کے درمیان تعلیمی وتدریسی میدانوں میں تعلقات کی استواری اور استحکام کے حوالے سے تھی۔ وفد نے طلبۂ جامعہ عارفیہ کے لیے ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکالر شپ کا مطالبہ کیا۔ اسی طرح وفد نے جامعہ عارفیہ میں تدریسی فرائض انجام دینے کے لیے ازہر سے اساتذہ بھیجنے کی گزارش کی۔ وفد نے جامعہ ازہر کے خصوصاً درجات اعدادیہ وثانویہ کی کتابیں بھی طلب کی تاکہ جامعہ عارفیہ کے نصاب میں ان سے استفادہ کیا جا سکے۔ اس کے ساتھ شیخ

احسان اللہ نے یہ بات زور دیتے ہوئے کہی کہ ازہر کی وسطیت اور اعتدال پسندی اسے عالم اسلام کی قیادت کے قابل بنا دیتی ہے اور ہمیں اس بات کا مکمل یقین ہے کہ ازہر عالم اسلام کو فرقہ بندی کی مصیبت سے بچا سکتا ہے۔

ہندوستان مین رائج نصاب تعلیم میں جامعہ ازہر کی کتابوں سے استفادہ کرنے کے لیے شیخ احسان اللہ کی طرف سے کتابوں کی درخواست پیش کرنے کے ساتھ ہی شیخ ازہر نے درجات اعدادیہ و ثانویہ کی کتابوں کا ایک سیٹ انہیں گفٹ کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے جامعہ عارفیہ میں تدریس کے لیے جامعہ ازہر کے اساتذہ بھیجنے کا بھی وعدہ کیا۔ یہ کام کاغذاتی کاروائی کی تکمیل کے بعد ہو جائے گا۔ شیخ ازہر نے اس کے ساتھ اس بات کا بھی اظہار کیا کہ ازہر ہر طرح سے جامعہ عارفیہ کے تعاون کے لیے تیار ہے۔'' مزید کے لیے وزٹ کریں:

http//:www.onazhar.com/page2home2.php?page=3page1=4page2=:

http://www.facebook.com/shahidulafaaque

اس خبر کو معمولی رد و بدل کے ساتھ الاہرام، رائی نیوز، محیط، ENN، الشروق، الموجز، خبری ڈاٹ کوم، نقابۃ السادۃ الاشراف، Gulfmedia.com، شبکۃ مصدر الخبر الاخباریہ، اخبارک، مصرس، المصریون، الیوم السابع، Yahoo اخبار، انقلاب، صحافت، سہارا، ہمارا سماج، یونائٹیڈ بھارت، آج، ڈیلی نیوز، ہندوستان اور دیگر اخبارات اور ویب سائٹس نے بھی اپنی مختلف اشاعتوں میں شائع کیا۔ اس طرح یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں الاحسان کا عربی ایڈیشن ہند و مصر کے مابین دینی و علمی تعلقات کی استواری میں کلیدی کردار ادا کرے گا۔

....

زیر نظر مجلہ، کتابی سلسلہ ''الاحسان'' کا چوتھا شمارہ ہے جو اپنی ضخامت کے اعتبار سے پچھلے شماروں کے بہ نسبت نصف ہے۔ یہ عجیب اتفاق رہا ہے کہ پچھلے تینوں شمارے ۴۰۸ صفحات پر مشتمل تھے اور تازہ شمارہ تقریباً نصف کم ہو کر ۲۱۶ رصفحات کو محیط ہے۔ اب تک الاحسان کا دورانیہ سالانہ تھا، اہل علم و قلم کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے اب یہ مجلہ ششماہی کر دیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ قارئین الاحسان کو اب لمبے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ہر چھ ماہ بعد الاحسان کا تازہ شمارہ ان کی میز پر ہوگا۔

وقفۂ اشاعت اور ضخامت کو کم کرنے کی وجہ سے ناچار ہمیں کئی ایک کالم حذف کرنا پڑے لیکن اس کے ساتھ ہم نے معیار کو ممکنہ حد تک مزید اچھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ الاحسان چوں کہ ایک علمی مجلہ ہے اور اب تک کی اشاعتوں میں اس کا علمی باب تحقیق و تنقید بہت وقیع ہوتا

رہا ہے۔اس بار بھی اس کی وسعت اور علمیت پر مزید توجہ دی گئی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی ان پر مزید توجہ دی جاتی رہے گی ۔ یہ اور بات ہے کہ معیار کی فکر ہمیں بہت سارے مضامین کی اشاعت سے روک دیتی ہے جس کی وجہ سے ذاتی طور پر بعض احباب کو یقینا تکلیف بھی ہوتی ہو گی لیکن ہمیں اپنے باذوق قارئین اور علم دوست اہل قلم سے امید ہی نہیں یقین ہے کہ انہیں الاحسان کا بہتر سے بہتر سفر اچھا لگے گا اور اس سلسلے میں وہ ہمیں معذور ہی نہیں ماجور بھی سمجھیں گے۔

اعلی صوفیانہ شاعری کے نئے نمونے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس جاتی ہیں۔اس لیے بادہ وساغر کے کالم کو حذف کرنا پڑا۔ ویسے بھی علمی پرچے میں شعر کے لیے صفحات نکالنا بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔شعری ذوق کے حامل قارئین کی تسکین کے لیے حضرت داعی اسلام کی ایک غزل شائع کردی گئی ہے جس کا سلسلہ جاری رہے گا۔اس کے علاوہ بحث ونظر، شناسائی ،صوفی ادب، زاویہ اور پیمانہ حذف کردیے گئے ہیں۔ان میں بہت سارے کالمز برائے وزن شعر بھی معلوم ہوتے تھے۔ بادۂ کہنہ کو تذکیر کے ساتھ ضم کردیا گیا ہے اور حجم بھی مختصر کر دیا گیا ہے اور پوری توجہ تحقیق وتنقید کے کالم پر مرکوز رکھی گئی ہے۔

....

تحقیق وتنقید کے کالم میں اس بار سات مقالات شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے آپ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، پروفیسر بدیع الدین صابری کا مقالہ ’’عصر حاضر میں ذکر الٰہی اور مراقبے کی اہمیت‘‘ جدید دور میں روح تصوف کی اہمیت وافادیت کی وضاحت ہے۔موصوف نے علمی اور سائنٹفک اسلوب اختیار کرتے ہوئے ذکر وفکر کی پیش کش میں نقل وعقل دونوں کا استعمال کیا ہے۔ ہماری طرف سے بہت سے شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں۔ مفتی مطیع الرحمن مضطر رضوی دینی، علمی اور فقہی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ایک فقیہ تصوف کی حمایت میں جب ہوتو پھر کہنا ہی کیا۔موجودہ زمانے کا جبری مطالبہ ہے کہ فقہ وتصوف کے بیچ حائل خلیج کو اب پھر پاٹ دی جائے۔موصوف نے اس سمت پیش قدمی کردی ہے اور علمی کروفر سے کی ہے۔ پروفیسر یسین مظہر صدیقی ہر بار کی طرح اس بار بھی ایک گراں قدر مقالے کے ساتھ شریک بزم ہیں۔ انہوں نے حقیقت تصوف کی نقاب کشائی کے ساتھ موافقین ومخالفین کی بے اعتدالیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔اب اس کوشش میں موصوف خود کس قدر اعتدال پر قائم رہے ہیں اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی نے صوفیہ کے دامن کو ایک غلط تہمت سے دھلنے کی کوشش کی ہے۔ مستند تاریخی حوالوں سے صوفیۂ کرام کے جہادی کارناموں کو پیش کر کے ایک نہایت علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ اس کے لیے جماعت صوفیہ کی طرف سے قابل

مبارک باد ہیں۔ مولانا شاہ ہلال احمد قادری نے ایک معاصر اسکالر ڈاکٹر الطاف اعظمی کے تصوف پر کیے جانے والے بعض اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ڈاکٹر اعظمی کا مقالہ معارف اعظم گڑھ کے شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ استدراک کے عنوان سے مولانا ہلال قادری صاحب نے اس کا جواب لکھا جسے معارف نے شائع کیا۔ بعض نکات جو مزید لکھنے سے رہ گئے تھے انہیں پھر سے لکھ کر انہوں نے ہمیں عنایت فرمائے۔ اس عنایت خسروانہ پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ البتہ ایک معذرت ان سے ہم ضرور کریں گے کہ ان کا مقالہ طویل تھا، ہم نے اس کی تلخیص شائع کی ہے۔ اسی طرح تصوف کی حمایت میں جہاں کہیں ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ اسلوب کسی قدر سخت ہو گیا ہے تو ہم نے اسے ذرا سہل کر دیا ہے۔ مولانا طفیل مصباحی مدیر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کا مقالہ ''تصوف شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی نظر میں'' بھی شایان شمارہ ہے۔ الاحسان کی محفل میں یہ ان کی دوسری حاضری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ دراز رہے گا۔ آخری مقالہ ذیشان احمد مصباحی کے قلم سے ہے۔ عنوان ہے ''مسئلہ اجتہاد و تقلید امام شعرانی کی نظر میں، میزان الشریعۃ الکبریٰ کے حوالے سے'' مقالے کا عنوان موضوع کی حساسیت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ تقلید بے بصارت اور اجتہاد بے بصیرت کے اس دور میں اس حوالے سے عارف ربانی امام عبد الوہاب شعرانی کے افکار کی اشاعت شریعت و طریقت کی بڑی خدمت ہے۔ مولانا ذیشان احمد مصباحی نے اپنے مقالے سے اشاعت افکار شعرانی کی بنا رکھ دی ہے۔ مزید کے لیے قارئین الاحسان کے اگلے شمارے کا انتظار کریں، اگلا شمارہ عارف ربانی امام عبد الوہاب شعرانی کے فکر و فن کے حوالے سے ہوگا۔

....

مکتوبات کا کالم الاحسان کے اول روز سے بڑا وقیع اور علمی رہا ہے۔ اس میں بہت سی قیمتی باتیں، آرا، تنقیدی و اصلاحی تبصرے اور تصوف کے حوالے سے نادر خیالات اور مشورے مل جاتے ہیں۔ گذشتہ شمارے میں عالی جناب ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کا خط مجلے میں شامل کئی مقالوں پر بھاری رہا اور بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کو شریعت و طریقت کا علم ورثے میں ملا ہے۔ کچھوچھہ کی شاخ آستانہ جائس رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ شیخ طریقت حضرت سید نعیم اشرف جائسی نور اللہ مرقدہ کے لخت جگر ہیں۔ اس وقت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ عربی کے استاذ ہیں۔ تحریر و تقریر ہر دو کی استاذانہ صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ علمیت و برجستگی اور سلاست و روانی ان کی تحریر و تقریر ہر دو کی خصوصیت ہے۔ معاصر علما میں وسعت مطالعہ، قوت فیصلہ، حاضر جوابی اور اعتدال و میانہ روی میں ان کی

مثال مشکل سے ملے گی ۔ موصوف نے اپنے مقالہ نما مکتوبات کے ذریعے یقینا الاحسان کی ثقاہت اور علمیت میں اضافہ کیا ہے۔ ان کی بعض آرا سے یقینا کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ احیائے تصوف کی اس صدی میں اس قسم کے مردان فکر و دعوت کے علم و فکر سے بے نیاز رہ کر احیائے تصوف کا کام تکمیل آشنا نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے پچھلے شمارے میں ایک بات کہی تھی کہ ''صوفی کا کام جیتنا ہوتا ہے لوگوں کو ہرانا نہیں'' یہ جملہ اس لائق ہے کہ عصر حاضر کے تصوف موافق دعاۃ و مبلغین اپنے لیے حرز جاں بنائیں۔ ادارہ الاحسان اکیسویں صدی میں احیائے تصوف کے حوالے سے آں موصوف سے اس جملے کی تشریح و تفصیل پر مشتمل ایک وقیع مقالے کی گزارش کرتا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ اگر آں موصوف یہ کام کر جاتے ہیں تو اس کی حیثیت احیائے تصوف کے ایک منظم ایجنڈے کی ہو جائے گی۔

....

آخر میں ہم اپنے ان قلم کاروں کی جناب میں بڑے ادب سے معذرت خواہ ہیں جن کے مقالات موصول ہونے کے بعد بھی کسی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔ آئندہ اشاعت میں ان کی شمولیت پر غور کیا جائے گا۔ اس حوالے سے بطور خاص حضرت سید شاہ شرف الدین نیر میاں قادری مدظلہ العالی زیب آستانہ عالیہ قادریہ مجہر شریف اورنگ آباد بہار سے ہم معذرت خواہ ہیں جن کا تحریری انٹرویو ادارے کو موصول ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود اسے شامل اشاعت نہیں کیا جا سکا کیوں کہ ضخامت کم کرنے کے سلسلے میں بعض دوسرے کالمس کے ساتھ شناسائی کے کالم کو بھی حذف کرنا پڑا۔ ہم آئندہ کسی اشاعت میں اس کی شمولیت کی کوشش کریں گے۔ ہمیں اس پر کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ خود ادارہ الاحسان کے بعض ذمہ داروں کی تحریریں بھی شامل اشاعت نہیں ہو سکی ہیں۔

....

تحدیث نعمت اور شکر کرم کے طور پر اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ داعی اسلام عارف ربانی حضرت شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کی شخصیت عصر حاضر کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی ہے جس پر زمانے کو بھی شکر گزار ہونا چاہیے۔ حضرت شیخ کی شخصیت اہل علم کے لیے تفسیر تصوف نظری اور اہل دل کے لیے تصویر تصوف عملی ہے۔ حضرت شیخ کی اولین ترجیح دلوں کو جیتنا ہے۔ وہ حکمت و موعظت کے ہر خوب صورت طریقے کو استعمال کر کے دلوں کو جیتتے ہیں اور پھر ان دلوں کو خالق و مالک کی رضا کی طلب میں لگا دیتے ہیں۔ ان کا مشرب محبت ہے جس کا قبلہ ذات وحدہ لاشریک اور راستہ طریق سلف صالحین ہے۔ وہ ایک بلند پایہ صوفی اور محب

صوفیہ ہیں۔ وہ تاریخ اسلام کے اکابر صوفیہ کو اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ صوفیہ کے بارے میں ایک بات متواتر کی حد تک مشہور ہوئی کہ ان کا مشرب محبت تھا لیکن اس محبت کا قبلہ کیا تھا اس طرف توجہ نہیں دی گئی اور جنہوں نے توجہ دی انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر تحویل قبلہ کر دی جس کا حق انہیں نہیں تھا۔ یہ عمل بعض ظاہر داروں نے بھی کیا جو ممکن ہے کہ اپنے اس عمل میں مخلص رہے ہوں لیکن انہیں صوفیہ کا صحیح عرفان نصیب نہیں تھا اور بعض صوفیہ کی محبت کا دم بھرنے والوں نے بھی کیا جو زینت دنیا کی تلاش میں فقر کا جھوٹا ڈھونگ رچنا چاہ رہے تھے۔ اس طرز فکر و عمل نے صوفیہ کی صحیح تصویر کو کبھی صاف ہونے نہیں دیا یا یوں کہیں کہ لوگوں کی نگاہوں پر پردہ ڈال دیا جس نے صوفیہ کی واضح تصویر کو بھی مدھم رکھا............ داعی اسلام حضرت شیخ ابو سعید صفوی مدظلہ العالی اس بات کے خواست گار ہیں کہ صوفیہ کی حقیقی تصویر سامنے لائی جائے۔ مخالفین کی غلط فہمیاں دور کی جائیں اور موافقین کی نیتوں کو صاف کیا جائے۔ اس کے لیے ایک انقلاب برپا ہو جو صوفیہ کے مشرب محبت پر ہو جس کا قبلہ ذات حق اور راستہ ان پاک نفوس کا ہو جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔ اللہ کے مغضوب و مردود اور فاسق و گمراہ بندوں کا راستہ نہ ہو۔

....

داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے احسانات کا شکر ادا کرنے سے اشہب خامہ عاجز ہے۔ اس لیے ہم صرف اس دعا پر اکتفا کرتے ہیں کہ مولیٰ! ہم پر ان کے سایے کو دراز فرمادے۔ ہمیں اپنی زندگیوں میں وہ انقلاب لانے کی توفیق عطا فرمائے جس کی تمنا انہیں ہمہ وقت رہتی ہے، تاکہ ان کی پسند کے مطابق ان کے زیر سرپرستی صوفیہ صافیہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے احیائے تصوف کے مشن میں ہم بھی اپنی سی کوششیں کر گزریں۔ گو کہ ہمیں اپنی اوقات معلوم ہے تاہم ہماری آرزو ہے کہ یوسف کے خریداروں میں ہمارا نام بھی شامل ہو جائے۔

اللہ بس باقی ہوس!!

حسن سعید صفوی

تذکیر

شیخ ابو طالب مکی
ترجمہ: مدثر رضا مصباحی

ایمان کے درجات

ہماری عقل کے مطابق ایمان کے درجات کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے تم سے اِنَّ عِندِی فُلاناً کہا تو اس قول کو سننے کے بعد تمہیں ایک علم حاصل ہوا کہ فلاں شخص اس کے پاس ہے لیکن یہ علم یقینی نہیں ہے کیوں کہ ممکن ہے کہ فلاں شخص اس کے پاس موجود رہا ہو لیکن وہ اس وقت اس کے پاس موجود نہ ہو، ٹھیک اسی طرح ایک مسلم کا ایمان ہے، یہ علم خبر ہے خبر نہیں، پھر تم میرے پاس آئے اور پردہ کے پیچھے سے اس کا کلام سنا تو تم کو معلوم ہو گیا کہ وہ میرے پاس موجود ہے کیوں کہ تم نے اس کا کلام سنا اور اس کے ذریعے اس کے موجود ہونے پر دلیل قائم کر لیا مگر پھر بھی یہ علم تحقیقی نہیں، اس لیے کہ باہم آوازوں میں مشابہت ہوتی ہے اور بدن انسانی بھی ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہوتا ہے، اگر میں اس کے بعد تم سے یہ کہوں ''فلاں شخص'' میرے پاس نہیں تھا بلکہ اس سے آواز میں مشابہت رکھنے والا دوسرا شخص تھا تو ایسا احتمال ہونے کی وجہ سے تم تردد میں مبتلا ہو گے اور تمہارے پاس نہ ایسا کوئی عینی یقین ہوگا جو میرے قول کی تردید کر سکتا ہو اور نہ ہی کوئی دیدہ شہادت جس سے میری بات کا انکار ہو سکے، اسی طرح عام مومنین کا ایمان ہے، بہ خدا یہ ایمان کی ایسی خبر ہے جس میں یقینی استدلال کے ساتھ ظن کا بھی امتزاج موجود ہے اور بہر حال یہ عارفین اور شاہدین کی طرح یقینی نہیں کیوں کہ اس میں بسا اوقات ایسا تخیل اور توہم آجاتا ہے جس کا ازالہ یقینی مشاہدہ سے بھی نہیں ہوتا ہے۔

پھر تم یہ جملہ کہ ''میرے پاس فلاں شخص ہے'' اس کو سننے کے بعد اب میرے پاس داخل ہوئے اور اس کو اس حال میں بیٹھا ہوا دیکھا کہ تمہارے اور کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے۔ تو یہ عینی معرفت ہے اور یہی ایقان والے کی ایسی شہادت ہے جس کی وجہ سے تمام شکوک و شبہات ختم ہو کر علم یقین کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور یہی موقنین کے ایمان کی مثال ہے جس میں خبر محتمل اور پردہ کے

پیچھے سے سنی ہوئی خبر پر ایمان لانے والے عام مومنین کا ایمان بھی داخل ہے اور لفظ ایمان کا اطلاق مذکورہ بالا تینوں شخصوں پر ہوگا لیکن جب پہلے شخص سے کہا گیا ''میرے پاس فلاں شخص ہے'' تو اسے علم ہو گیا کہ فلاں شخص میرے پاس موجود ہے اور اس نے اور اس کی تصدیق بھی کر دی اور دوسرا جس نے سن کر استدلال کیا لیکن اس کو مشاہدہ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے قطعی علم نہیں ہو سکا۔

اور تیسرا شخص وہ ہے جس کو معائنہ و مشاہدہ کے بعد علم حاصل ہوا تو اس کو قطعی اور یقینی علم ہو گیا ، اسی کی خبر مزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی کہ ''خبر معائنہ کی طرح نہیں ، اور جس کو خبر ملی ہو ، وہ معائنہ کرنے والے کی طرح نہیں۔'' اس کی مثال یوں ہے کہ تم کسی شئے کو دن میں دیکھو تو تمہیں اس کی عینی معرفت حاصل ہوگی اور تم کو اس کے وجود کی معرفت اس طرح حاصل ہوگی کہ اس میں خطا نہیں ہوگی اور اس کے برخلاف تم کو رات میں اس چیز کی حاجت ہو تو اس شئے کی عینی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ تم کو دلائل کی جانب قصد کرنا پڑے گا یا اس کے اپنی جگہ سے متغیر نہ ہونے پر حسن ظن رکھنا ہوگا ، یا کسی شئے معہود سے تم کو اس بات کا علم ہوگا کہ وہ چیز اپنی جگہ سے نہیں بدلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل تو غائب چیزوں کے لیے ہوتے ہیں نہ کہ ظاہر و باہر اور مشاہدے میں آنے والی چیزوں کے لئے۔ مثلاً کسی چیز کو چاند کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس میں شبہات اور اشکالات باقی رہ جاتے ہیں لیکن جب اسی چیز کو سورج کی روشنی میں دیکھا جائے تو مکمل طور سے واضح ہو جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کی بھی مشکل باقی نہیں ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح نور ایمان اور نور یقین ہے۔

اور مومنین کا کمال ایمان اور لفظ ایمان کے تحت داخل ہونے میں فرق کو ایک چوتھی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ چار رکعات والی نماز باجماعت کھڑی ہوئی تو ایک شخص تکبیر تحریمہ میں شامل تھا اور ایک شخص آیا اور رکوع میں شامل ہوا ، دوسرا شخص دوسری رکعت میں شامل ہوا ، تیسرا شخص تیسری رکعت میں شامل ہوا اور چوتھے شخص نے چوتھی رکعت کو پایا لہٰذا ان تمام اشخاص نے باجماعت نماز ادا کی اس کی فضیلت کو بھی حاصل کیا کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وصلم نے فرمایا کہ جس نے ایک رکعت بھی پائی اس نے پوری رکعت پالی لیکن تیسرا اور چوتھا شخص کمال صلوٰۃ اور اس کی حقیقت کے ادراک میں پہلی رکعت میں شامل ہونے والے شخص کی طرح نہیں ہے اور ایسا بھی نہیں کہ فضیلت پانے میں قیام نہ پانے والے اشخاص ، تکبیر تحریمہ پانے والے کی طرح ہیں ، اسی طرح مومنین کمال ایمان میں برابر نہیں اگرچہ لفظ ایمان میں سب برابر ہیں اور ایسا ہی فرق کل قیامت میں ہوگا جس کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ: ''جس کے دل میں مثقال برابر ، آدھا مثقال ، چوتھائی مثقال یا جو کے دانہ کے برابر ایمان ہو اس کو جہنم کی آگ سے نکالو۔'' اس سے مومنین کا ایمان میں تفاوت ثابت ہوا جو ذرہ سے مثقال تک کے معنی میں موجود ہے ، جب کہ ایمان کے اس درجے کے سب لوگ جہنم میں

داخل بھی ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ جہنم میں ان کے درجات مختلف رہے اور اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جس کے قلب میں دینار کے وزن کے برابر ایمان ہو تو اس ایمان کے باوجود بھی بڑے گناہ سرزد ہونے کی وجہ سے اسے دخول جہنم سے یہ ایمان نہیں روک سکتا اور جس کے قلب میں دینار کے وزن کے برابر بھی ایمان ہو تو اس پر جہنم کی آگ ہمیشہ کے لیے نہیں ہوگی کیوں کہ وہ کمزور ہی سہی لیکن ایمان کی رسی تھامے ہوئے اور جس کے پاس دینار سے زیادہ ایمان ہو اس پر جہنم کی آگ مسلط نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ابرابر میں سے ہے اور جس کے پاس ذرہ سے بھی کم ایمان ہو تو وہ جہنم سے نہیں نکالا جائے گا اگر چہ یہ شخص بہ ظاہر مسلمانوں کے لبادہ میں تھا مگر اللہ کے نزدیک فجار و منافقین میں سے تھا جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ. يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ. وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ۔ (الانفطار: ۱۴ تا ۱۶)

ایک مثقال اور ذرہ برابر ایمان رکھنے والے جنت کے مختلف مقامات میں ہوں گے اور اس سے زیادہ ایمان رکھنے والے علیین کے اعلیٰ مقام میں اس درجہ بلند ہوں گے جیسے کہ آسمان کے افق میں ستارے بلند ہیں اور جنت کے مختلف مقامات میں جمع ہوں گے اور اس طرح کی روایت ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے فرماتے ہیں: انسان کے سوا کوئی چیز اپنے ہزار مثل سے بہتر نہیں اس لیے کہ خدا کی قسم ایک اہل یقین کا دل ہزار مسلم سے بہتر ہے کیوں کہ اس کا ایمان ایک سو مومن کے ایمان سے بلند ہے اور اس کو حاصل ہونے والی اللہ کی معرفت اور اس کا علم اللہ کے ساتھ اس کا علم بھی ایک سو مسلم کے علم سے زیادہ ہے اور یہ قول مشہور ہے کہ تین سو ابدال میں سے ایک کی قیمت تین سو مومنوں کی قیمت کے برابر ہوتی ہے

○○○

امام عبدالوہاب شعرانی
ترجمہ: اظہار احمد ثقافی

طالب صادق اور سلوک راہ طریقت

شیخ تربیت کی تلاش

مرید صادق کی پہچان یہ ہے کہ اگر اس کے شہر میں کوئی مربی نہ ملے تو اپنے شہر کو خیر باد کہہ کر اس زمانے میں مریدین کی تربیت کرنے والے شیخ کی بارگاہ میں چلا جائے اگر چہ اس کے اور اس شیخ کے مابین سال یا اس سے بھی زیادہ دنوں کی مسافت ہو۔ خاص طور سے نوخیز لڑکوں، عورت یا جاہ وحشم کی محبت میں گرفتار شخص کے لیے سفر کرنا تو بالکل واجب ہے تا کہ اس مصیبت سے اس کو چھٹکارا مل جائے، اس لیے کہ ہر وہ عمل جس کے کرنے سے ایک واجب کی تکمیل ہو اس کا کرنا واجب ہے۔

شیخ کے وصال کے بعد شیخ تربیت کی حاجت

مرید پر لازم ہے کہ جب اس کا شیخ وصال فرما جائے تو کسی کو اپنا شیخ مربی بنالے تا کہ شیخ اول کی تربیت میں مزید حسن پیدا ہو جائے؛ کیونکہ راہ سلوک میں وقفہ نہیں ہے۔ میرے شیخ شناوی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ محمد سروی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کے وصال سے پہلے ان کی جانب سے تلقین و ارشادِ مریدین میں مأذون تھے لیکن پھر بھی وہ شیخ کے وصال کے بعد سیدی علی مرصفی رحمۃ اللہ علیہ سے طالب تلقین ہوئے۔ اس پر سید علی مرصفی نے فرمایا کہ الحمد للہ! تم مردان الٰہی کے مقام کو پاچکے ہو۔ اب تمہیں تلقین کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سن کر آپ نے جواب دیا کہ بغیر استاد کے میں ایک لمحہ بھی نہیں رہنا چاہتا، یہ الگ بات ہے کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کی تلقین ہو چکی ہے اور ساتھ میں ارشاد کی اجازت بھی مل چکی ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ: '' بچے! تمہارے شیخ کے شیخ کا جو طریقہ ہے اس پر کسی کو تلقین کرو تا کہ میں بھی تمہارے ساتھ سیدی علی کے شاگردوں میں سے ہو جاؤں'' حضرت شیخ شعرانی فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے کہنے پر ایسا ہی کیا۔ اس قسم کا معاملہ صادقینِ طریقت ہی سے صادر ہو سکتا ہے اور جو راہ طریقت میں صادق نہیں ہوتے ہیں وہ

اپنے مشائخ سے اجازت حاصل کرنے کے بعد پھر کسی سے تلقین طلب نہیں کرتے کیونکہ ایسا کرنے کو اپنی رسوائی کا سامان خیال کرتے ہیں اور ان کا ایسا خیال کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے مشائخ نے انھیں اجازت عطا کرنے میں بددیانتی سے کام لیا ہے اسی لیے فقیر کو اجازت اس وقت دی جاتی ہے جب اس کا نفس مرجائے اور کبھی بھی وہ نفس کی موافقت نہ کرے اور رضائے مولی پا لینے کے باوجود اپنے آپ کو سب سے کمتر گردانے۔ ایسی صفت کا حامل شخص ہی لوگوں کی تربیت کر سکتا ہے اور انھیں راہ راست پہ لاسکتا ہے۔

طالب صادق کا امتحان

مرید کی پہچان یہ ہے کہ جب وہ کسی شیخ کے پاس حصول طریقت کے لیے جائے اور شیخ کی جانب سے بے اعتنائی اور ناگواری کا اظہار ہو تو صبر کرے اور متزلزل نہ ہو بلکہ ذلیل ہو کر شیخ کے دروازے پر پڑا رہے یہاں تک کہ شیخ کو رحم آجائے اور اگر سال بھر سے زیادہ بھی بیٹھے رہنا پڑے تو بیٹھا رہے، اس لئے کہ اہل طریقت کے نزدیک طریقت اتنی پیاری چیز ہے کہ آنے والی مصیبتوں میں رخصت طلب کرنا بھی جائز نہیں ہے، پہلے یوں ہوا کرتا تھا کہ راہ طریقت میں قبول کرنے سے پہلے مشائخ مرید کا سالوں تک امتحان لیا کرتے تھے۔

فرمان مشائخ ہے کہ طریقت میں قبول کرنے سے پہلے شیخ اگر مرید کا امتحان نہیں لیتا تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ مرید کامیاب نہیں ہوتا، کیوں کہ ایسی صورت میں وہ بغیر ادب کے طریقت میں قدم رکھتا ہے جس کی وجہ سے اس کے نزدیک طریقت کا کوئی احترام ہی نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ لمبی مدت گزارنے کے باوجود بھی طریقت اسے پیروں سے ٹھکرادیا کرتی ہے، برخلاف اس کے جو طریقت میں شدت شوق اور احترام و تعظیم کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ۔ (الممتحنة:۱۰) (اے ایمان والو! جب مومنہ تمہارے پاس ہجرت کر کے آئیں تو ان کا امتحان لے لو اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔)

ایسے ہی اگر کوئی مرید ہجرت کر کے طریقت میں قدم رکھنے کے لیے آئے تو اس کا بھی حکم یہی ہے کہ اس کا امتحان لے لیا جائے۔ کیوں کہ ان دونوں ہجرتوں میں ہدایت کی جانب رہ نمائی کا مفہوم موجود ہے۔

ہمیں خبر دی ہمارے شیخ محمد شناوی رحمہ اللہ علیہ نے کہ انھوں نے جب شیخ ابوحمایل سے طلب طریقت کے لیے بلاد غربیہ سے ''فارسکور'' کا سفر کیا تو شیخ نے ان کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور ان کے چہرے میں ناپسندیدگی کے آثار نمودار ہوئے حتی کہ صبح وشام کے کھانے میں بھی انھیں

مدعو نہیں کیا۔ مسلسل پانچ مہینے تک آپ اسی حالت میں رہے۔ جب شیخ نے آپ کی شدت رغبت کو ملاحظہ کر لیا تب قریب بلا کر فرمایا کہ محمد! میں تمہارے لیے اور دوسروں کے لیے خیر خواہ ہوں، تمہارے ساتھ جتنے بھی حادثات رونما ہوئے ہیں ان سب سے میں نے تمہارا امتحان لینا چاہا تھا تا کہ تم طریقت اور اہل طریقت کی عظمت کو دل میں بیٹھا کر اس راہ میں قدم رکھو۔

ہمارے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ خدا کی قسم اگر کئی سالوں تک اور شیخ میرے ساتھ بے اعتنائی کا مظاہرہ کرتے رہتے تب بھی میں ضرور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور مسلسل آپ کے دروازے پہ پڑا رہتا۔

شیخ ابوحمایل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: میں نے دس ہزار سے زیادہ لوگوں کو ذکر کی تلقین کی لیکن سوائے ابن شناوی کے کسی نے میری عظمت کو نہیں پہچانا اور کوئی بھی میرے ساتھ استقامت کے ساتھ قائم نہ رہ سکا، لہٰذا اے میرے عزیز! صادقین کے عمل کو دیکھو اور ان کی اقتدا میں لگ جاؤ۔ تمہاری ہدایت کا والی اللہ ہے۔

(الانوار القدسیۃ فی معرفۃ قواعد الصوفیۃ، الجزء الاول، مکتبۃ المعارف بیروت، ص: ۷۰ تا ۷۳، ۱۹۸۸ء)

○○○

افادات: شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ صفوی
ترتیب: مجیب الرحمٰن علیمی

فقہی مذاہب کا اختلاف رحمت ہے

فقیر نے ایک سفر میں مرشدی حضور داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا سے عرض کی کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زیادہ تر اولیا مذہباً شافعی ہوئے ہیں، اس طرح کی باتیں حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر میہنی قدس سرہ کے حوالے سے اسرار التوحید فی مقامات ابی سعید معروف بہ مقامات خواجہ میں بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مذہب شافعی میں عزیمت زیادہ ہے اور رجال اللہ کو عزیمت پر عمل کرنا زیادہ پسند ہے۔

داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا نے فرمایا: ممکن ہے کہ خواجہ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہ کے علاقے میں اس وقت ایسا ہی رہا ہو، کہ زیادہ تر اولیا شوافع رہے ہوں ورنہ جہاں تک رخصت وعزیمت کی بات ہے تو یہ ہر مذہب میں موجود ہے۔ کیا جمع بین الصلاتین رخصت نہیں ہے جو شوافع کا مذہب ہے؟ جب کہ احناف کا مذہب اس معاملے میں عزیمت پر ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ ہر مذہب میں رخصت اور عزیمت کی مثالیں موجود ہیں۔

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ان مذاہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کا آپس میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، جو اختلاف نظر آتا ہے وہ توسع ہے، جو امت کے حق میں رحمت ہے۔ اسی لیے علما نے فرمایا ہے کہ: اگر کسی خاص مسئلے میں کسی خاص مذہب پر عمل کرنا دشوار ہو تو دوسرے مذہب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، بلکہ میرا خیال ہے کہ کرنا چاہیے۔ جدید دور میں طویل ملکی وغیر ملکی اسفار کے دوران بطور خاص ہوائی سفر میں ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ جمع بین الصلاتین پر عمل کر لیا جائے یا امام اعظم کے قول ثانی اور امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے مثل اول میں عصر ادا کر لی جائے تو ترک نماز سے بچا جا سکتا ہے۔ ایسی صورتوں میں کیا نماز ترک کرنے سے بہتر نہیں ہے کہ مذہب شافعی پر عمل کرتے ہوئے عصر وظہر کو جمع کر لیا جائے؟ یا کم از کم امام اعظم

کے قول ثانی اور امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے مثل اول ہی میں عصر ادا کر لی جائے؟ ضرورت وحاجت کے وقت دوسرے امام کے قول پر عمل کرنے کی ائمہ نے تو اجازت دی ہے، لیکن کیا ترک نماز بھی کسی امام کا مذہب ہے؟ ایک طرف تم یہ کہتے ہو کہ چاروں مذاہب اور ان کے ائمہ برحق ہیں اور دوسری طرف کسی مسئلے میں بصورت مجبوری یا امت کی اجتماعیت کو باقی رکھنے کے لیے بھی ان چاروں میں سے کسی ایک کے علاوہ کی پیروی درست نہیں جانتے؟ اگر تم حنفی ہو تو بتاؤ کہ ان تینوں فقہی مذاہب: حنبلی، مالکی اور شافعی کے پیروکاروں میں کوئی اللہ کا ولی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو بتاؤ کہ کسی ولی کی اقتدا میں نماز ہوگی یا نہیں؟

افسوس کہ ایک حنفی نماز تو چھوڑ سکتا ہے مگر کسی شافعی یا حنبلی کی اقتدا نہیں کر سکتا! تعجب ہے کہ تم اپنے اصول کا دوسروں کو پابند بناتے ہو، جب کہ ان کے پاس بھی قرآن وسنت سے مستنبط اصول موجود ہیں، جن کو تم بھی برحق کہتے ہو۔ بتاؤ کیا تم تضاد بیانی کے شکار نہیں ہو؟ زبان سے برحق مانتے ہو اور دل سے باطل قرار دیتے ہو، قولاً حق گردانتے ہو اور فعلاً اس کا بطلان کرتے ہو۔ کیا یہ نفاق خفی نہیں ہے؟

فقہی اصولوں کے اختلاف کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک شافعی، حنفی کی اقتدا میں اور ایک حنفی، شافعی کی اقتدا میں نماز ادا نہیں کرتا، خواہ امام اپنے زمانے کا متقی، صالح اور ولی اللہ ہی کیوں نہ ہو؟ بتاؤ کہ اگر ایک حنفی یا شافعی کو غوث اعظم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کا موقع میسر آئے تو کیا کرے گا؟ ان کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کو اپنی سعادت مندی جانے گا یا یہ کہے گا کہ آپ کی غوثیت قبول مگر میں حنفی یا شافعی ہوں اور آپ مذہبا حنبلی ہیں، اس لیے آپ کی اقتدا میں میری نماز نہ ہوگی؟

اس طرح کا سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ چاروں فقہی مذاہب میں سے کسی کے پیروکار کی نماز دوسرے کی اقتدا میں ہوگی یا نہیں؟ یہ باطن کا فساد ہے۔ ورنہ چاروں مذاہب اہل حق کے ہیں اور ان کی بنیاد بھی قرآن وسنت ہے تو پھر نماز کیوں نہیں ہوگی؟ افسوس ہے ایسے علم اور صاحبان علم پر جنھوں نے رحمت کو زحمت بنا دیا ہے، نعمت کو عذاب قرار دے دیا ہے اور متقی وصالح انسانوں پر فاسق سا حکم عائد کر دیا ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اختلاف امتی رحمة۔ حقیقت میں ان ائمۂ مجتہدین کا اختلاف ہی وہ اختلاف ہے جو امت مسلمہ کے لیے باعث رحمت ہے، ورنہ بتاؤ کہ امت سے کیا مراد ہے؟ امت کی تین قسمیں ہیں:

پہلی: امت دعوت، جس میں بلا تفریق مذہب وملت تمام انسان شامل ہیں۔ کیا ان کا آپس میں اختلاف رحمت ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! کفر و اسلام، شرک اور توحید کے اختلاف کو رحمت کیسے کہا جا سکتا ہے؟

دوسری: امت اجابت، جس میں تمام اہل اسلام جو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں، شامل ہیں، اگر ان کے اختلاف کو رحمت تسلیم کیا جائے تو یہ بھی فہم سے دور کی بات ہے، کیوں کہ ان کے درمیان بھی جو اختلاف ہے وہ سنت و بدعت یا ہدایت وضلالت بلکہ بعض وقت کفر و اسلام کا بھی اختلاف ہوتا ہے تو کیا ان مذکورہ اختلافات کو رحمت یا رحمت کا سبب قرار دیا جائے گا؟ ہرگز نہیں!

امت کی تیسری قسم: امت ہدایت ہے۔ یہ اہل حق کی جماعت ہے جس میں ہر وہ شخص شامل ہوگا جس کے فکر و عمل کی بنیاد قرآن وسنت ہوگی۔ صحابۂ کرام، شہدا وصالحین اور صادقین کی جماعت ہو یا صوفیہ، متکلمین، محدثین اور ائمہ مجتہدین کی، ان میں سے کسی نے اگر کسی مسئلے میں الگ اپنی رائے قائم کی تو یہ اختلاف عامۃ المسلمین کے لیے رحمت یا رحمت کا سبب قرار دیا جائے گا۔

فقہی مسائل میں ائمہ اربعہ یا ائمہ ثمانیہ بلکہ ائمہ عشرہ کا جو اختلاف ہو وہ اسی قبیل سے ہے، ان میں سے کسی کی رائے نہ مردود قرار دی جائے گی اور نہ کسی کی تفسیق، تجہیل اور تضلیل کی جائے گی۔ ان میں سے کسی کا کوئی پیروکار دوسرے پر طعن کا حق نہیں رکھتا۔ طعن کرنے والا اور ان ائمہ میں سے کسی ایک کو قولاً یا عملاً باطل قرار دینے والا، مخلص ومتقی ہو ہی نہیں سکتا، وہ گمراہ ومتعصب ہوگا۔

چاروں مذاہب اور ان کے ائمہ برحق ہیں، قابل احترام ہیں، جس شخص کا جس مذہب سے انشراح قلب ہو وہ اس کی تقلید کرے، ایک وقت میں کسی ایک ہی امام کی تقلید کرے، ایسا نہ ہو کہ ایک ساتھ چاروں مذاہب پر عمل شروع کردے اور جس مسئلے میں جہاں آسانی نظر آئے اس کو اپنا مذہب بنالے، یہ طبیعت وخواہش کی پیروی ہوگی۔ ہاں اگر کسی مسئلے میں ایک خاص مذہب پر عمل کرنے میں واقعی کوئی حرج ہو اور دوسرے مذہب میں اس مسئلے کا بہتر حل موجود ہو تو علمائے راسخین دوسرے مذہب کو اختیار کرسکتے ہیں اور عامۃ الناس کو اس پر عمل کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ اس کی مثال اس زمانے میں اس عورت کا مسئلہ ہے جس کا شوہر غائب ہو، حنفی علما نے کا اس مسئلے میں مذہب مالکی پر عمل کرتے ہوئے عورت کے لیے شوہر کا لمبا انتظار کیے بغیر چار سال کے انتظار کے بعد دوسری شادی کے جواز کا فتوی دیا ہے۔

○○○

ایک عبرت آموز ایمانی سفر

ونے کمار شرما ابن سری جیت لال ۷ ۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو امرتسر کے متوسط شرما خانوادے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے پانچ بھائی ہیں۔ والد پولس میں تھے جو اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ ونے کمار شرما کی ۲۰۰۰ء کے شروع میں امرتسر کے ایک نومسلم رمیش بابا سے ملاقات ہوئی، جنہوں نے اسلام کا راستہ دکھایا۔ تقریباً پانچ ماہ کے بعد رمیش بابا کے استاد اور داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید صفوی مدظلہ العالی کے مرید ڈاکٹر اصغر علی خان سے آپ کی ملاقات ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے آپ کو داخل اسلام کیا، پھر چند ماہ بعد ہی امبالہ پنجاب میں حضرت داعی اسلام سے ملاقات ہوئی اور پھر ۱۱ر فروری ۲۰۰۱ء/ ۱۶ر ذی القعدہ ۱۴۲۱ھ حضرت مخدوم شاہ عارف صفی قدس سرہٗ (وصال: ۱۸ر ذی قعدہ ۱۳۲۰ھ / ۱۶ر فروری ۱۹۰۳ء) کے عرس کے موقع پر خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد آپ کی حاضری ہوئی۔ جس قدر وقت گزرتا رہا اسی قدر نور ایمان میں اضافہ ہوتا گیا اور ایک دن ایسا بھی آیا جب ۲۰۰۴ء میں حضرت داعی اسلام نے آپ کو اپنا مرید بنا کر اپنے وفادار غلاموں میں شامل کر لیا اور آپ کا نام وقار احمد رکھا۔ اب آپ مستقل خانقاہ ہی میں قیام پذیر ہیں اور اپنے مرشد کی خدمت اور دعوت دین میں مصروف ہیں۔ نہایت متواضع اور خدمت گزار شخصیت کے مالک ہیں۔ زبان میں بلا کی تاثیر ہے۔ دعوت کے حکیمانہ طرز سے آگاہ ہیں۔ آپ کے توسط سے اب تک بہت سارے گم گشتۂ راہ ہدایت، جام توحید و رسالت سے سرشار ہو چکے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ موصوف کی زندگی و بندگی کی عبرت آموز داستان قارئین الاحسان کی نذر ہے۔ (ادارہ)

....

میرا نام ونے کمار شرما ہے، امرتسر، کٹرا سفید، بوریاں والا بازار، کلکتیہ والی گلی سے تعلق رکھتا ہوں، بجرنگی سینا کے ساتھ رہتا اور رتھ یاترا میں کبھی رام اور کبھی کرشن کا رول کرتا تھا، لوگ مجھ کو بہت مانتے تھے، کبھی کبھی میرے دل میں یہ بات بھی آتی تھی کہ جس مہاپرش کا میں چولا پہن رہا ہوں، کیا میں اس لائق بھی ہوں؟ اور کیا وہ ایسا ہی کرتے تھے؟ پھر بھی میں لوگوں کے کہنے سے رام بنتا رہا، ٹائم نکلتا رہا مگر زندگی کے آگے اندھیرا تھا، کوئی سمجھانے والا نہیں تھا، زندگی یوں ہی بے مقصد کٹ رہی تھی، تقریباً ۲۰۰۰ء کی بات ہے کہ میں اپنے ایک دوست سے ملنے اس کے گھر گیا، معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہے، اس کی ماں سے معلوم ہوا کہ سامنے ایک بابا رہتے ہیں میرا دوست اسی بابا کے پاس آتا جاتا ہے اور کبھی بابا کے پاس ہی رہ بھی جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ آنا جانا تو ٹھیک ہے، بابا کے پاس رکنا تو اچھا نہیں، چوں کہ پہلے میں کسی بابا کو نہیں مانتا تھا۔ میں بھی اس بابا کے پاس گیا، دیکھا کہ وہ بزرگوں کی باتیں سنایا کرتے ہیں۔ وہ ہمیں بھی اچھے لگے۔

ایک بار میں نے ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو مجھے ان سے نفرت ہونے لگی، کیوں کہ میں مسلمانوں کے سخت خلاف تھا، ان کی شکل دیکھنے سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے دل میں زہر اتر آیا ہو۔ میں یہ سوچتا تھا کہ اگر موقع ملا تو فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا اور صرف مسلمانوں کو اپنا نشانہ بناؤں گا اور جتنا ان کو مار سکوں گا ماروں گا، چاہے مجھ کو تنخواہ ملے یا نہ ملے، گھر والوں کے کام تو نہ آسکا، اپنے دیش کے ہی کام آجاؤں۔ شروع سے میرے دل و دماغ میں یہی بسا ہوا تھا، لیکن جب ان کو نماز پڑھتے دیکھا تو پہلے خوب غصہ آیا اور پھر یہ خیال بھی آیا کہ وہ اپنے مالک کی عبادت ہی تو کر رہے ہیں، یہ سوچ کر چپ رہا۔ بابا جب نماز سے فارغ ہو گئے تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے تھے؟ انھوں نے کہا کہ مالک کی پوجا کر رہا تھا، ہم سب کا پیدا کرنے والا ہی ہمارا مالک ہے، ہم سب کو ایک مالک کی بندگی کرنی چاہیے، اس کے بعد انھوں نے بزرگوں کے واقعات سنائے، مجھ کو بہت اچھا لگا، چلتے وقت میں نے عرض کی: کیا میں روزانہ آسکتا ہوں؟ انھوں نے ہر دن آنے کی اجازت دے دی۔

بابا کا نام رمیش ورما تھا۔ انھوں نے بھی اسلام قبول کیا تھا۔ اب میں ہر دن ان کے پاس آنے جانے لگا۔ دھیرے دھیرے ان کے پاس میں زیادہ وقت دینے لگا اور ایسا بھی ہوا کہ کبھی کبھی رات بھی ان ہی کے پاس گزار دیتا۔ اب میرے ساتھ میرے دوسرے دوست بھی آنے لگے۔ ایک دن وہ نماز پڑھ رہے تھے، میں بھی وہاں موجود تھا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم بھی نماز پڑھو، میں نے کہا کہ مجھ کو نماز تو نہیں آتی۔ فرمایا کہ نیت کر کے مالک کے سامنے کھڑے

ہو جاؤ، مالک تمہاری بھی بندگی قبول کرلے گا اور دھیرے دھیرے نماز بھی آجائے گی۔ میں نے ان کی بات مان لی۔

دھارمک کاموں سے مجھ کو شروع ہی سے محبت تھی، پہلے میں مندروں کی صفائی ستھرائی کرتا تھا، تہوار کے موقع پر گلی کوچوں کی صفائی بھی کرتا، کوئی مذہبی فنکشن ہوتا تو رات رات بھر میں کام کرتا، جس کی وجہ سے میرے بڑے بزرگ، دوست واحباب مجھ کو خوب چاہتے تھے، لیکن مسلمانوں سے نفرت کرتا تھا، اب بابا کے پاس مجھ کو سکون ملنے لگا اور جب انھوں نے نماز میں کھڑے ہونے کو کہا تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔ مجھ کو اتنا اچھا لگا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ میرا رب ہی جانتا ہے کہ مجھ کو کتنا لطف ملا۔

ایک بار میرے پرانے دوستوں نے کہا کہ چلو رتھ یاترا میں تم کو رام کا رول ادا کرنا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں اب میں رام نہیں بنوں گا، میں نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ میں ٹال مٹول کرتا رہا، لیکن ان کے بار بار کہنے پر خیال آیا کہ رام نہیں بنوں گا، چلو ان کے ساتھ چلا جاتا ہوں، جب میں وہاں گیا تو دیکھا کہ ایک شخص جو ہنومان بنا ہوا تھا وہ لوگوں کو پریشان کر رہا ہے، جس طرح کسی کے جسم پر شیطان آجاتا ہے اسی طرح وہ بھی کر رہا تھا، جو اس کے پاس جاتا اس کو مارتا یہاں تک کہ پنڈت جی بھی آئے اور انھوں نے جل (پانی) کو ہاتھ میں لے کر اس کے چہرے پر چھڑکا مگر پنڈت جی کو بھی کامیابی نہ ملی، میرے دل میں خیال آیا کہ سچائی پرکھنے کا یہی موقع ہے، اس کے پاس گیا اور پیچھے سے اس کو میں نے پکڑ لیا اور اس کے کان میں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہا وہ ایسے ٹھنڈا ہو گیا جیسے کہ ٹائر سے ہوا نکل گئی ہو۔ اب میں نے اپنی آنکھ سے اللہ کی قدرت دیکھ لی اور مجھ کو اس کی سچائی کا یقین آگیا، اپنے رب کی طاقت کو میں نے سمجھ لیا اور اسی وقت ایک اللہ پر ایمان لے آیا۔

ایک دن معلوم ہوا کہ رمیش بابا کے استاذ آرہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ کیا اس زمانے میں بھی کوئی پیر موجود ہے؟ پیروں کے بارے میں رمیش بابا سے بہت کچھ سن چکا تھا، جب ان کے استاذ آئے تو ان سے ملاقات کی، ان کی بھی باتیں سنیں، ان کی خوب خدمت کی، ہمیں وہ خوب اچھے لگے، ایک دن میں نے پیر صاحب سے پوچھا کہ کیا میں مسجد کے گیٹ پر سو سکتا ہوں؟ انھوں نے سوال کیا کہ مسجد کے گیٹ پر کیوں سونا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کی کہ فجر کی نماز چھوٹ جاتی ہے، اگر میں مسجد کے گیٹ پر سوؤں تو نماز نہیں چھوٹے گی اور نماز پڑھ کر گھر واپس ہو جایا کروں گا۔ انھوں نے کہا بیٹا یہ کمال نہیں ہے۔ یہ نقص ہے، کمال تو یہ ہے کہ سردی ہو یا گرمی، صبح گھر سے جا کر نماز ادا کی جائے۔ تم اپنے گھر سے مسجد تک جتنا چلو گے اتنا ثواب ملے گا، ایسا ہی کرو، اگر اللہ

نے چاہا تو تمہارے گھر والے بھی کچھ نہ بولیں گے۔ میں نے ان کی بات مان لی اور ایسا ہی کرنے لگا، لیکن کبھی کبھی رمیش جی کے پاس ہی سو جاتا، جو میرے گھر والوں کو پسند نہ تھا، مگر دھیرے دھیرے میرے مالک نے راستہ کھول دیا۔ رمیش جی کے استاذ ڈاکٹر اصغر خان صاحب سے مل کر مجھ کو بہت اچھا لگا، جب بھی ان سے ملا ان کی محبت میرے دل میں بڑھتی چلی گئی۔

دوسری ملاقات کی بات ہے کہ انھوں نے لوگوں سے کہا: آج لوکی کھانے کا دل کر رہا ہے۔ کئی لوگ بازار کی طرف گئے لیکن لوکی نہ ملی، مجھ کو اچھا نہ لگا، خیال آیا کہ میں اپنے استاذ کے لیے ایک لوکی نہیں لا سکتا، میں بھی بازار کی طرف گیا، لوکی تلاش کی، ہمیں بھی لوکی نہ ملی، ہار کر میں ایک سبزی کی دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا اور رونے لگا، روتے ہوئے دعا کی، مالک میں اپنے گرو کو لوکی نہ کھلا سکا، یا اللہ میں تو ہار گیا، اب تو ہی کچھ کر، تا کہ میرے گرو کو لوکی مل جائے۔ اتنا کہہ کر دکان کی طرف دیکھا تو لوکی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ دکاندار سے میں نے پوچھا کہ یہ لوکی کس کی ہے اور کہاں سے آئی؟ دکان دار نے کہا شاید سامان میں دبی ہوئی تھی، لوکی میری ہے، لوکی خرید لی، اور استاذ جی کے پاس پہنچ گیا، استاذ جی نے کہا کہ بیٹے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے دعا نہ کرو، مالک سے اچھی اور بڑی چیز مانگو، اس کی محبت اور اس کی رضا چاہو، پیر جی نے کافی کچھ ہم کو سمجھایا اور کچھ دنوں کے بعد وہ واپس لوٹ گئے۔

ایک بار پھر گرو جی سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے بتایا کہ انبالہ میں ہمارے پیر آ رہے ہیں، مجھ کو بڑا تعجب ہوا کہ ان کے بھی پیر ہیں، اب خوش تھا کہ میں اپنے بڑے پیر سے ملاقات کروں گا، لیکن ان سے ملاقات میں ابھی وقت تھا اور مجھ کو نوکری بھی کرنی تھی۔ ایک فیکٹری میں نوکری شروع کی، مگر مجھ کو انگلش بالکل نہیں آتی تھی، پیروں نے مجھ کو ایک دعا بتائی تھی کہ جب بھی کوئی کام کرنا، بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر کرنا، میرا کام رنگ تولنا تھا، مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ کون سا رنگ ہے، مگر اللہ کا نام لے کر اندازے سے رنگ کا ڈبہ اٹھاتا اور رنگ تول کر دے دیتا۔ جس رنگ کی فرمائش ہوتی وہی رنگ میں دے دیتا، یہ میرے لیے بہت بڑا کرشمہ اور اللہ کا شکر و احسان تھا کہ خود بخود راستہ کھلتا چلا گیا۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ میں راستہ چل رہا تھا، راستہ چلتے ہوئے ایک غریب کو میں نے ٹھوکر مار دیا، جس کی وجہ سے پورا بازار میرے اوپر ٹوٹ پڑا۔ میں نے اپنے مالک کی طرف متوجہ ہو کر دعا کی مولیٰ میری غلطی ضرور ہے مگر جان بوجھ کر یہ غلطی میں نے نہیں کی ہے، اب تو ہی عزت بچانے والا ہے۔ اللہ کا ایسا احسان ہوا کہ کسی نے میرے ساتھ بدتمیزی نہیں کی اور سب ٹھنڈے ہو گئے۔ جب میں استاذ جی کے پاس گیا تو انھوں نے مجھ کو سمجھایا کہ بیٹا! مسلمان کا یہ کام نہیں کہ

لوگوں پر ظلم کرے اور کسی کو نقصان پہنچائے۔ اب سمجھ میں آیا کہ مسلمان ظلم سہتا ہے ظلم کرتا نہیں ، میں بہت شرمندہ ہوا اور اپنے مالک سے معافی مانگی۔

دوستوں سے سنا تھا کہ مسلمان اپنی مسجدوں کے تہ خانے میں ہتھیار رکھتے ہیں۔ ایک بار خیال آیا کہ چل کر دیکھتے ہیں۔ ایک بڑی مسجد میں گیا، جو تبلیغی جماعت کی تھی۔ وہاں تہہ خانے میں بھی گیا، کوئی ہتھیار نظر نہ آیا۔ اس مسجد کے لوگوں نے ہم سے بڑی محبت کا سلوک کیا، مگر میں ان کے پاس نہ بیٹھا، کیوں کہ مجھ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ہمارے پیارے رسول محمد ﷺ اور بزرگوں کے خلاف بولتے ہیں، ان کے خلاف بولنے والا مسلمان نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مسلمانوں کا کام تو لوگوں کو اللہ تک پہنچانا اور پیارے مصطفی ﷺ کے واسطے سے پہنچانا ہے نہ کہ ان سے غافل کرکے۔ پیارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگوں سے غافل ہو کر اللہ تک پہنچنا اور دوسروں کو پہنچانا ممکن ہی نہیں ہے۔

پھر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اصغر خان صاحب کے پیر یعنی ہمارے میاں حضور (داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی) جلد ہی انبالہ آرہے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا اور اپنے دوستوں کے ساتھ میاں حضور جی سے ملاقات کے لیے انبالہ حاضر ہو گیا۔ میاں حضور جی نے بہت محبت دی اور مجھ کو اپنی چائے کا تبرک دیا، جس کو ہم نے اپنے دوستوں میں مل بانٹ کر پیا۔ اس کے بعد قوالی ہوئی، جس میں میاں حضور جی نے مجھ کو اپنے پاس بیٹھایا۔ قوالی کی محفل ختم ہوئی۔ فاتحہ کے بعد شیرینی کا طشت لے کر میں میاں حضور جی کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے شیرینی لی اور مجھ سے فرمایا: بیٹا تم بھی کھالو۔ میں نے سوچا کہ اب تیسرا ہاتھ کہاں سے لاؤں؟ اتنا سوچنا تھا کہ میاں حضور جی نے فرمایا: کہ لو بیٹا تیسرا ہاتھ ہمارا لے لو۔ میں نے دل میں سوچا تھا آپ نے زبان سے فرمادیا۔ میں بالکل ہل گیا کہ یہاں سوچنا بھی جرم ہے۔ یہ مجلس جناب سبھاش چند (شہباز احمد) کے گھر ہوئی تھی۔

دوسری مجلس ٹھاکر جی (ہری نارائن سنگھ رنیاز حسن) کی کٹیا پر ہوئی، جس میں میاں حضور جی نے ہم سب کو دین کی باتیں بتائیں اور فرمایا: بندہ جب کسی نیک کام کی نیت کرتا ہے تو رب اس کو پورا کردیتا ہے، بندے کا کام ہے نیت کرنا اور اللہ پر بھروسہ رکھنا، اللہ کا کام ہے اس کو مکمل کرنا اور قبول کرنا۔ تھوڑی دیر کے بعد میاں حضور نے فرمایا کہ الہ آباد کون آئے گا؟ سب نے ہاں کہا: میں خاموش بیٹھا رہا۔ آپ نے میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا کیا بیٹا تم نہیں آؤ گے؟ میں نے عرض کی سرکار ضرور آؤں گا۔ میں نے آنے کی نیت کر لی ہے اب پورا کرنا رب کا کام ہے۔ اس کے بعد رب کا احسان ہوا، سرکار کا کرم ہوا اور ۱۶ رذی قعدہ ۱۴۲۱ھ مطابق ۱۱ رفروری ۲۰۰۱ء میں الہ آباد دادا میاں سلطان العارفین مخدوم شاہ عارف صفی قدس سرہٗ (وصال: ۱۸ رذی قعدہ

۱۳۲۰ھ/۱۶ر فروری ۱۹۰۳ء) کے عرس میں حاضر ہو گیا، جب میں الٰہ آباد خانقاہ میں حاضر ہوا تو میرے دل و دماغ میں بہت سارے سوالات تھے، جن کو میں زبان سے ادا نہیں کر سکتا تھا، میں نے میاں حضور کی قدم بوسی کی اور ان کے پاس بیٹھ گیا، میرے سارے سوالات کے جوابات میاں حضور جی نے اسی مجلس میں دے دیے، اب میرا ایمان بالکل مضبوط ہو گیا تھا، اب میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ مٹی اور کاغذ کی مورتیوں کی پوجا ہرگز نہیں کروں گا، اللہ ایک ہے اس کی عبادت سب کو کرنی چاہیے اور ہمارے رسول محمد ﷺ ہیں سب کو ان سے محبت کرنی چاہیے اور ہمارے پیر میاں حضور جی ہیں جو پیروں کے پیر ہیں، سب کو ان کی عزت کرنی چاہیے اور سب کو چاہیے کہ ان کو اپنا پیر مانیں، کیوں کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہوتا ہے، اب جیسے جیسے میرے میاں حضور جی مجھ کو بتاتے گئے میں کرتا گیا۔

ایک دور یہ بھی آیا کہ ایک طرف میرے گھر والے مجھ پر سختی کرنے لگے اور دوسری طرف رمیش بابا بھی مجھ سے ناراض ہو گئے، ان کی سختی بھی مجھ پر بڑھ گئی، ان کی سختی کی وجہ سے ہمارے دوسرے دوست ان سے پھر گئے، مگر ڈاکٹر صاحب کی توجہ اور ان کا کرم اور میاں حضور جی کا احسان کہ جس نے مجھ کو بچا لیا، رمیش بابا مجھ کو اپنے پاس رکھتے مگر میرا خیال نہ رکھتے، ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے میری نوکری بھی چھوٹ گئی، گھر والے بھی ناراض ہو گئے، جس کی وجہ سے مجھے گھر چھوڑنا پڑا، رمیش بابا مجھ کو دن دن بھر اپنے ساتھ رکھتے تھے، گھوم گھوم کر دعا اور تعویذ کرتے اور شام میں بھوکا پیاسا مجھ کو چھوڑ دیتے۔ آخر کار میں گولڈن ٹیمپل کے بھکاریوں میں سونے لگا۔ رات انھیں لوگوں کے ساتھ گزارتا، صبح جلد اٹھتا اور کسی دوسری سمت چلا جاتا، تاکہ میرے گھر والے اور میرے جاننے والے مجھ کو نہ دیکھیں۔ اکثر رات کا کھانا گولڈن ٹیمپل کے لنگر میں ہی کھاتا۔ گولڈن ٹیمپل کی طرف سے تین ٹائم کا لنگر چلتا تھا، مگر میں دن میں نہیں جاتا تھا، ڈرتا تھا کہ کہیں سردار جی مجھ کو بار بار یہاں دیکھ کر سمجھ نہ جائیں کہ میں گھر سے بھاگا ہوا ہوں۔

رمیش بابا مجھ کو دن دن بھر اپنے ساتھ رکھتے، لیکن کبھی نہ پوچھتے کہ تم نے کھانا کھایا بھی ہے یا نہیں؟ ایک بار ایسا بھی ہوا کہ مجھ کو کھانا کھائے تین دن ہو گئے، تیسرے دن میں نے سوچا کہ آج لنگر میں جا کر بھر پیٹ کھاؤں گا، مگر جب رمیش بابا کے پاس سے واپس ہوا تو لنگر کا وقت بھی ختم ہو گیا تھا۔ آج میرا دل بہت ٹوٹ گیا، سوچا مولیٰ مجھ کو آج بھی کھانا نصیب نہ ہوگا، میں ناشکرا بندہ اپنے رب سے ایک بار پھر شکایت کرنے لگا۔ یا اللہ! کیا مجھے آج بھی کھانا نصیب نہ ہوگا؟ میں روتا ہوا گھومتا رہا، یہاں تک کہ رات کے دو بج گئے۔ اچانک میں نے ایک چوراہے پر دیکھا کہ ایک سردار جی لنگر بانٹ رہے ہیں، سب کو دو دو پوڑی دے رہے ہیں اور بھگا رہے ہیں،

میں بھی قریب گیا معلوم نہیں کیوں مجھ کو بیٹھایا اور خوب کھلایا۔ بار بار کہتے، آپ اور کھاؤ، آپ اور کھاؤ، ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ہی لیے لنگر لگا ہوا ہو۔ میرے مولیٰ کا ایسا کرم ہوا جس کا میں شکر ادا نہیں کرسکتا۔ میرے رب نے میری دعا قبول کرلی، کتنا مہربان ہے میرا رب، کتنا رحیم ہے میرا اللہ، جس نے ہزار گناہوں کے باوجود میری دعا کو رد نہیں کیا۔ میں کھاتا گیا اور شکر ادا کرتا گیا، مجھ کو یقین ہوگیا کہ میرا رب میرے ساتھ ہے مجھ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ سارے حالات گزرتے رہے ڈاکٹر اصغر صاحب کا میرے پاس نمبر نہیں تھا، جن کو میں اپنا حال سناتا، میرا رب ہی میرا نگہبان تھا، وہ میری ہر بات کو سنتا تھا، جب سردی کا موسم آیا اور میرے پاس اوڑھنے کا گرم کپڑا نہ تھا تو ایک عورت جو ڈاکٹر صاحب کے ذریعے اسلام لائی تھیں، میں ان کو اپنی دینی ماں سمجھتا تھا، ان کے تین بیٹے تھے لیکن وہ اپنے سگے بیٹوں سے زیادہ مجھ کو چاہتی تھیں، اکثر کہتیں بیٹا! میرے گھر پر رہو، مگر مجھ کو یہ مناسب نہ لگا، سردی میں اوڑھنے کے لیے انہوں نے مجھ کو چادر دی، ہر مشکل میں ساتھ دیا اور مجھ کو دین کی باتیں سمجھاتی رہیں، آج بھی وہ موجود ہیں اور دعوت کے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ میرے کچھ دوست بھی تھے جن کے پاس میں نے اپنا کچھ سامان رکھا تھا، کیوں کہ میں اپنے گھر سے بالکل نکل گیا تھا، کبھی کبھی ان دوستوں کے پاس جاتا اور وہیں غسل کرتا، کپڑا بدلتا، مگر مجھے ایک دن یہ محسوس ہوا کہ میرا آنا جانا ان کو اچھا نہیں لگتا، وہاں سے بھی میں نے اپنا سامان اٹھالیا۔

مجبور ہوکر ایک بار پھر میں نے اپنے گھر کا رخ کیا، میرے گھر والوں نے مجھ کو پونا بھیجنا چاہا، جہاں میرے بھائی رہتے تھے، میں بھی تیار ہوگیا، ان لوگوں کا سوچنا تھا کہ پونا جانے کی وجہ سے وہ اسلام سے دور ہوجائے گا، جس کو میں سمجھ نہ سکا لیکن اللہ کی مرضی کچھ اور ہی تھی، ابھی تیاری بھی مکمل نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اصغر صاحب کا رمیش بابا کے پاس فون آیا کہ میرا مرض بڑھتا جارہا ہے میں علاج کے لیے بنگلور جانا چاہتا ہوں، وہ نے میرے ساتھ بنگلور جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب مجھ کو ساتھ لے کر بنگلور روانہ ہوگئے، مجھ کو ساتھ لے جانے میں بڑی حکمت تھی ۔ڈاکٹر صاحب میری پوری خبر رکھتے تھے، جس کا یقین مجھ کو یوں ہوا کہ ایک دن فجر کے بعد میں قوالی سنتے سنتے سوگیا، خواب میں دیکھا کہ میں اڑتے اڑتے خانۂ کعبہ تک پہنچا اور پھر طواف کر رہا ہوں، اتنے میں فون کی گھنٹی بجی، فون اٹھایا تو ڈاکٹر صاحب تھے، انھوں نے پہلا جملہ فرمایا: بیٹا ہو آئے، میں تعجب میں پڑ گیا۔

بنگلور کے سفر پر ڈاکٹر صاحب سے میں نے اپنا پورا واقعہ سنایا، انھوں نے فرمایا: بیٹا یہ امتحان ہے، تم ہارنا نہیں اس سے بڑا امتحان ہونے والا ہے، اس کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں نے عرض کی: اس سے بڑا امتحان میرا کیا ہوگا کہ اپنا گھر رہتے ہوئے بھی میں فٹ پاتھ پر سویا ہوں اور

کئی کئی دن بھوکے بھی رہا ہوں، اس سے بڑا امتحان میں کیا دے پاؤں گا؟ اب میری ہمت نہیں، انھوں نے کہا نہیں بیٹا تمھارا آخری امتحان ہے، ہمت رکھو۔

ڈاکٹر اصغر صاحب پنجاب میں امبالہ، جلندھر، امرتسر اور اس کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی رہتے تھے، ایک بار امرتسر میں ڈاکٹر صاحب نے کئی مہینے قیام کیا، میں نے ان کی خوب خدمت کی، رات رات بھر ان کی خدمت میں رہتا اور ان سے دین کی باتیں سنتا رہتا، ڈاکٹر صاحب اپنے پیر و مرشد سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ میاں حضور جی (حضور داعی اسلام ادام اللہ ظلہ علینا) امرتسر آنے والے تھے۔ جب میاں حضور جی کا آنا کنفرم ہو گیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کی دیوانگی دیکھی، بے حد خوش تھے، ایک رات میں ان کے پاس ہی تھا کہ میاں حضور جی کا ذکر کرتے کرتے رونے لگے اور میاں حضور جی کی چپل کو سر پر رکھ لیا اور رقص کرنے لگے وہ یہ شعر پڑھ رہے تھے:

مرا قول ناصحانہ مرا فعل مجرمانہ
تو کریم ہے، کرم کا کوئی ڈھونڈ لے بہانا

اور یہ شعر بھی اکثر پڑھا کرتے تھے جو مجھ کو یاد ہے:

آنکھیں تمہاری آس میں ہونے لگی ہیں بند
آنا ہے تو آجاؤ کہ لمحات بچے چند

میاں حضور جی کی آمد پر ڈاکٹر صاحب نے پورے محلے کی صفائی ستھرائی کروائی، ہم لوگوں نے گلی کوچے کو صاف کیا اور اس کی دھلائی بھی کی، میاں حضور جی تشریف لائے تو لوگوں نے راستے کو پھولوں سے سجادیا اور جب میاں حضور بیٹھ گئے تو لوگوں نے گلاب سے ڈھک دیا، صرف آپ کا چہرہ مبارک دکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب میاں حضور جی سے جب بھی بات کرتے تو اپنے منہ پر کپڑا رکھ لیتے، ایک بار میں نے ان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے منہ کی باس میرے میاں کو نہ پہنچ جائے، ڈاکٹر صاحب جب فون سے بات کرتے تو ادب سے کھڑے ہو جاتے اور بات کرتے کرتے پسینے سے تر ہو جاتے۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بنگلور پہنچا، واپسی کا ٹکٹ کنفرم نہیں تھا، بڑی کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی، تھک ہار کر میں زمین پر بیٹھ گیا اور رونے لگا کہ مولی میرے لیے نہ سہی اپنے اس فقیر کا تو خیال فرما، جو فقیر مجھ سے کہتا ہے کہ تم اللہ کے لئے قربان ہو جاؤ تو اللہ تمھارے لیے دنیا بھی عام کردے گا، مولی جس فقیر نے اپنی زندگی تیری راہ میں قربان کردی، اگر دنیا ان کے لیے عام نہ ہوئی تو میرے لیے کیسے عام ہوگی؟ روتے ہوئے میں پھر ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوا،

انھوں نے مجھ کو روتا ہودیکھ کرڈانٹنا شروع کردیا، کہنے لگے صرف ناشکری کرتے رہتے ہو، کبھی تو اللہ کا شکر کرو، کبھی تو صبر کرو، آخر کار ویٹنگ ٹکٹ لے کر گاڑی میں سوار ہوگیا تھوڑی دیر کے بعد ایک شخص آیا جس نے کہا کہ بابا میرے ساتھ بہت سارے بچے ہیں، سب کا ایک ساتھ ٹکٹ ہے، لیکن چھ ٹکٹ اس جگہ بھی ہے، آپ ان سیٹوں پر جاسکتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے میری طرف دیکھا اور فرمایا: تم دو سیٹ کے لیے پریشان تھے اللہ نے چھ(۶) سیٹ کا انتظام کردیا، ناشکری نہیں کرنا چاہیے، ایک بار پھر میں ہار گیا، میں نے سوچا کہ میرا رب مجھ کو بار بار عطا کرتا ہے اور میں بار بار اس کی ناشکری کرتا ہوں۔

بنگلور سے واپسی کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب کی طبیعت اچھی نہ ہوئی، پھر چنڈی گڑھ کے ایک ہاسپیٹل میں اڈمٹ ہوئے مگر پھر بھی حالت ٹھیک نہ ہوئی، معلوم ہوا کہ اب ڈاکٹر صاحب الٰہ آباد جانا چاہتے ہیں، الٰہ آباد کے سفر پر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ، میرے علاوہ سربجیت سنگھ (ساحل سعیدی) اور دیگر چند لوگ اور تھے، راستے میں فتح پور کے قریب ۲۴ر شعبان ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۱ر اکتوبر ۲۰۰۳ء بروز جمعرات ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا، مجھ کو یقین نہ آیا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ کو چھوڑ کر چلے جائیں گے، ان کا چہرا بالکل مسکرا رہا تھا، پنجاب کے لوگوں سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ میاں حضور جی سے علاج کرواکر ڈاکٹر صاحب کو میں واپس لاؤں گا، میاں حضور کے کرم پر مجھ کو مکمل بھروسہ تھا، اب میں الٰہ آباد خانقاہ میں حاضر ہو چکا تھا، ڈاکٹر صاحب کے گھر والے ان کو اپنے گاؤں لے جانا چاہتے تھے، اور میں بار بار میاں حضور جی سے یہ عرض کرتا تھا کہ حضور آپ ان کو اٹھا کے بیٹھا دیں، اگر یہ مر گئے ہیں تو ان کو زندہ کردیں، میں ان کو زندہ واپس پنجاب لے جاؤں گا، میرا یقین تھا کہ میاں حضور اگر چاہتے تو اللہ کے کرم سے ان کو زندہ کردیتے لیکن میاں حضور ہر بار یہی کہتے یہ شریعت کے خلاف ہے، میں عرض کرتا کہ سرکار یہ مجھ کو چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہیں؟ یا تو ان کو آپ زندہ کردیں یا مجھ کو بھی ان کے ساتھ گاڑ دیں، آپ یہی فرماتے کہ مالک کی یہی مرضی ہے اور مالک کا بندہ وہی ہے جو مالک کی رضا میں راضی رہے اور تم کو میں ان کے ساتھ کیسے گاڑ دوں گا، اب تم میری حفاظت میں ہو، ڈاکٹر صاحب نے تم کو میرے پاس چھوڑا ہے، کیا میں تمہارے لیے کافی نہیں ہوں، جو بھی ان سے محبت رکھتا ہے وہ سب میری حفاظت میں ہیں اور میری آل ہیں۔ ایسا کہتے ہوئے میاں حضور جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور میں بے ہوش ہوگیا، جب ہوش آیا تو میاں حضور نے کھانا کھلوایا، اس وقت ڈاکٹر صاحب کے گھر والے ان کی نعش لے جاچکے تھے، دوسرے دن وصیت کے مطابق ڈاکٹر صاحب کی نعش خانقاہ شریف واپس لائی گئی اور پھر تدفین ہوئی۔

تیسرے دن جب میں پنجاب جانے لگا تو میاں حضور جی نے فرمایا: بیٹا کہاں جاؤ گے؟

عرض کی سرکار گھر جاؤں گا، آپ نے فرمایا تم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مجھے بھی گاڑ دو، میں نے تم کو گاڑ دیا، تم گڑ چکے، اب کہاں جاؤ گے؟ میں خانقاہ ہی میں رک گیا، میرا رکنا رمیش بابا کو اچھا نہ لگا، انھوں نے واپس ہونے کو کہا، میں نے انکار کر دیا، انھوں نے کہا تیرا پیر میں ہوں، تم میری بات مانو، میں نے عرض کی کہ آپ ہی نے کہا تھا جہاں میرا پیر کھڑا ہو جائے وہاں مجھ کو فیل سمجھنا، اور یہاں تو پیروں کے پیر کا حکم ہے، میں تو آپ ہی کی بات پر عمل کر رہا ہوں، لیکن پھر بھی وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے اور میں ڈیڑھ سال تک الہ آباد خانقاہ شریف ہی میں رکا رہا۔

خانقاہ شریف میں قیام کے درمیان میں نے اپنے دوستوں کو بھی یہاں بلایا، ایک بار شیطان مجھ پر غالب ہوا اور میں گھر چلا گیا، گھر پر قیام کے دوران میں اپنی دینی ماں کے پاس جاتا رہا، مگر پتا نہیں کیوں اور کیسے دھیرے دھیرے میری نماز بھی چھوٹنے لگی، میری دینی ماں نے میاں حضور جی سے شکایت کرنے کی دھمکی دی، میں نے ڈر سے وہاں بھی جانا کم کر دیا اور آخر کار ایک بار پھر میں اپنے بڑے بھائی کے پاس پونا پہنچ گیا، میرے گھر والے ایک بار پھر مجھ سے خوش ہو گئے، لیکن میرے بھائی کا مزاج بڑا سخت تھا، میں ان سے بھی الگ رہنے لگا۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ پونا کی جس فیکٹری میں نوکری کرتا تھا، اس میں رات کے وقت آگ لگ گئی، اس رات میں نگرانی کر رہا تھا، سوچا کہ جل جانے دو، مگر فوراً خیال آیا کہ نہیں حق اور حلال کا کھانا چاہیے، میرے پیر نے مجھ کو ایسا ہی سکھایا ہے، جہاں آگ لگی تھی وہاں میں تیزی سے جا رہا تھا، کہ اندھیرے میں سمجھ میں نہ آیا اور گر پڑا، اور میرا ہاتھ ایک لوہے پر پڑا اور چوٹ آ گئی، اسی حالت میں میں نے آگ کی خبر دوسروں تک پہنچا دی اور فیکٹری کے مالک کے گھر چلا گیا، جب اس نے میری حالت دیکھی فوراً ہاسپیٹل لے گیا، ایڈمٹ کر دیا، میں وہاں بہت رو رہا تھا، کوئی میرا پرسان حال نہ تھا، دل میں خیال آیا کہ میں نے کون سی غلطی کی ہے کہ میرا مولیٰ مجھ کو یہ سزا دے رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ کوئی جواب دے رہا ہے کہ تم نے کون سی غلطی نہیں کی ہے، تم نے ایک اللہ کا کلمہ پڑھا، تم نے اسلام قبول کیا، میاں حضور کے ہاتھوں پر بیعت ہوئے اور سب کو بھول کر اپنی دنیا میں مست ہو، اس قدر دنیا میں ڈوب چکے ہو کہ اپنے ایک مالک کو بھی بھلا دیا ہے، میں نے اسی وقت توبہ کی اور سو گیا، صبح ہوتے ہی میرے ایک دوست کی ماں آئی اور انھوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھ کو کھانا کھلایا، میں نے اپنا سارا حال ان سے کہہ سنایا، پہلے تو وہ اپنے گھر لے گئی اور پھر سمجھایا کہ بیٹا پیر کی باتوں پر عمل کرنا چاہیے، گرو کو نہیں ٹھکرانا چاہیے، مجھ کو بہت شرمندگی ہوئی کہ ایک ہندو عورت ہو کر مجھ کو پیر کی عظمت سمجھا رہی ہے اور میں اپنے پیر سے گمراہ ہو رہا ہوں، فوراً میں نے اپنے پیر و مرشد میاں حضور جی کو فون لگایا، سرکار نے میری آواز بھی پہچان لی، فرمایا: بیٹا! و نے

کیسے ہو؟اور کہاں ہو؟ اپنے غلطی کی میں نے معافی مانگی اور سرکار سے ساراواقعہ سنادیا۔ میری مصیبت پر سرکار نے اتناافسوس کیا کہ معلوم ہوا کہ مجھ سے زیادہ میرے سرکار کو تکلیف ہوئی ہے۔ فرمایا: تم یتیم کی زندگی کیوں گزار رہے ہو، بیٹا میں پونا آؤں گا، سرکار نے جب پونا آنے کو فرمایا تو میری خوشی کی انتہانہ رہی، اس گفتگو کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ میں پھر سے اسلام میں داخل ہوگیا، پھر میں نے نماز کی پابندی شروع کردی، سرکار سے پونا میں تو میری ملاقات نہ ہوئی لیکن امبالہ، پنجاب میں جلد ہی ملاقات ہوگئی۔

پونا سے میں اپنے گھر امرتسر آیا اور پھر امبالہ کے لیے تیار ہوا، نیا کپڑا پہنا، پہلے اپنی دینی ماں کے پاس گیا اور ان سے معافی مانگی، انھوں نے فرمایا کہ جب تک میں اپنے میاں حضور سے اجازت نہ لوں گی تم کو معاف نہ کروں گی، انھوں نے میاں حضور کو فون کیا، میاں حضور نے فرمایا میرا بیٹا نیا کپڑا پہن کر تمہارے پاس آیا ہے تم اس کو معاف کردو، میرے سرکار دور ہی سے دیکھ رہے تھے کہ میں نیا کپڑا پہنے ہوا ہوں، آخر کار میری ماں نے میری معافی قبول کرلی، دعا دی اور پھر میں امبالہ کے لیے روانہ ہوگیا۔

میں ایک بار الہ آباد آچکا تھا، یہاں کا نظارہ دیکھ چکا تھا، سوچتا تھا کہ کاش یہیں مجھ کو بھی تھوڑی جگہ مل جاتی اور میں بھی یہیں رہنے لگتا، میرے مالک نے میری دعا سن لی، اب الحمدللہ! میں اپنے پیر کے چرن میں الہ آباد خانقاہ ہی میں رہتا ہوں۔ امبالہ میں سرکار سے ملاقات ہوئی میں نے عرض کی، سرکار! میں الہ آباد آنا چاہتا ہوں، سرکار نے فرمایا ابھی وقت نہیں آیا ہے، آپ الہ آباد واپس ہوگئے میں اپنے گھر چلا گیا، میں قوالی خوب سنتا تھا، ایک دن قوالی سن رہا تھا کہ بے قرار ہوگیا اور پھر الہ آباد کے لیے روانہ ہوگیا، میرے ساتھ میرا ایک دوست بھی تھا جس کا نام بنٹی تھا، جب میں خانقاہ آیا تو معلوم ہوا کہ میاں حضور خانقاہ شریف میں نہیں ہیں، ساجد بھائی (منیجر شاہ صفی میموریل ٹرسٹ اور خادم خاص) سے ملاقات کی، عرض کیا کہ میاں حضور سے بات کرادیں، انھوں نے فون پر بات کروائی، اپنے دوست کو دادا میاں (سلطان العارفین مخدوم شاہ عارف صفی قدس سرہٗ وصال: ۱۹۰۳ء) کے مزار پر لے گیا، اسے خوب لطف ملا، کچھ دن خانقاہ میں رہنے کے بعد میں پنجاب واپس ہوگیا، جو دوست میرے ساتھ آیا تھا وہ بھی کچھ دنوں کے بعد مسلمان ہوگیا، اس کے علاوہ بھی بہت سارے نوجوان جو اسلام لانے کے بعد میرے دوست ہوئے تھے، ان میں سے اکثر اسلام لاچکے۔

ایک بار خانقاہ شریف میں کوئی پروگرام تھا جس میں شرکت کے لیے میں پنجاب سے آیا تھا، سرکار کا کرم ہوا اور مستقل میں خانقاہ میں رہنے لگا، اور اس طرح خانقاہ میں رہنے کی خواہش سرکار کے کرم سے پوری ہوگئی۔ اب اصل ٹھکانہ خانقاہ ہے۔ پنجاب میرے لیے مسافرت کی جگہ

ہو کر رہ گئی ہے۔اب میری خواہش ہے کہ مالک نے جس نعمت سے مجھ کو نوازا ہے سارے انسانوں تک اس کو پہنچا دوں۔کوشش کرنا میرا کام ہے اور ہدایت دینا مالک کا کام ہے، وہ ہر حال میں ہمارا مالک ہے، ہدایت دے، اپنی نعمت عطا کرے تب بھی وہ مالک ہے ہدایت نہ دے اور نعمت عطا نہ کرے تب بھی وہ ہمارا مالک ہے لیکن وہ سب کو عطا کرتا ہے، جو اس پر ایمان رکھتے ہیں ان کو بھی دیتا ہے اور جو اس پر ایمان نہیں رکھتے ان کو بھی عطا کرتا ہے۔

انسان اپنی بیوی بچوں کے لیے دور دراز کا سفر کرتا ہے اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور ان کو خوش رکھنے کے لیے طرح طرح کی مصیبت اٹھاتا ہے۔کاش !ہم اپنے مالک حقیقی کو راضی کرنے کے لیے اپنے رسول ﷺ کو خوش رکھنے کے لیے تھوڑی بھی کوشش کرتے تو ضرور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے اور ضرور ہم اپنے رب تک پہنچ جاتے۔رب تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ست گرو یعنی صادقین کا راستہ ہے، یعنی اس راہ میں پیر و مرشد کا ہونا ضروری ہے، بغیر پیر کے یہ راستہ طے نہیں ہو سکتا۔پانی پر چلنے والے فقیر کے لیے بھی ست گرو کی سنگت ضروری ہے، جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا تو ہم کون ہیں اور ہماری کیا حیثیت ہے؟

ہم سب کو اللہ کے دین یعنی اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے، اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم خود مسلمان ہو جائیں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم مسلمان ہو جائیں اور لوگ ہماری بات نہ مانیں۔ اگر ہم اپنے مالک پر کامل ایمان رکھیں اور اپنے رب سے اپنا رشتہ مضبوط کرلیں، تو ضرور لوگ ہماری بات مانیں گے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہو اور ہم ناکام ہو جائیں، اور وہ بھی اس کے پسندیدہ دین کی تبلیغ میں، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ اللہ نے تو ہم جیسے کافر کو اپنا بنالیا ہے، تو بھلا جو لوگ اس کا کلمہ پڑھتے ہیں، جو اس کو پہلے ہی سے ایک جانتے ہیں وہ اگر دل سے اپنے مالک سے ہدایت چاہیں گے تو وہ مالک جو ایک ہے، سب کا پیدا کرنے والا اور سب کو پالنے والا ہے ضرور ان کو ہدایت عطا کرے گا اور ان کے گناہوں کو مٹا کر اپنا محبوب بنالے گا۔کوئی اس کی طرف مائل تو ہو، جو اس کی طرف ایک قدم بڑھتا ہے تو وہ مالک اس سے دس قدم قریب ہو جاتا ہے۔

OOO

تحقیق وتنقید

عصر حاضر میں ذکر الٰہی اور مراقبے کی ضرورت و اہمیت

جدید ٹکنالوجی جسم کو خواہ کتنا ہی سکون پہنچائے اس میں قلب و روح کی آسودگی اور راحت کا کوئی سامان نہیں۔ تمام تر مادی ترقی کے باوجود اگر آج مغربی انسان کے دل میں جھانک کر دیکھا جائے تو اس میں مایوسی، افسردگی اور بے قراری و بے چینی اپنے شباب پر دکھائی دے گی؛ کیوں کہ قلبی و روحانی بے قراری اور بے چینی کا علاج مادی ترقیات میں مضمر نہیں ہو سکتا۔ فکر کی پراگندگی صرف ذکر ہی سے دور ہو سکتی ہے۔ قدم قدم پر مشین کا سہارا لینے والا جدید تعلیم سے بہرہ ور انسان آج شدت سے محسوس کر رہا ہے کہ اسے قلبی سکون کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہے جیسا کہ ایک انگریز ادیب ڈاکٹر آربری کہتا ہے:

''پچھلی دو عظیم جنگوں سے بنی نوع انسان تنگ آ چکی ہے اور اب ہم روحانیت کے طلب گار ہیں۔ ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ خالق کائنات کون ہے؟ اس کی ماہیت کیا ہے؟ اس تک کیسے رسائی حاصل ہو سکتی ہے؟ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب صوفیہ کے پاس موجود ہے اور اب اگر مسلم صوفیہ ہمارے ساتھ تعاون کریں تو ہم یقیناً موجودہ زمانے کی تباہ کاریوں سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔'' (۱)

ہر دور میں روحانی اضطراب کا حل بزرگان دین کی تعلیم میں رہا ہے اور رہے گا؛ کیوں کہ انہوں نے دین کی اساس، جمال اور کمال سب کو جمع فرمایا۔ حدیث جبریل علیہ السلام کے مطابق ایمان، اسلام اور احسان ان کی زندگی کا مقصد ہے۔

جب اہل سائنس کو بزرگان دین کی تعلیمات اور معمولات میں ایک عجیب سکون اور راحت کا احساس ہوا تو انہوں نے ذکر و فکر اور مراقبہ اور روحانی اعمال کا بھی تجربہ سائنس کی روشنی میں کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ امریکا کا ایک ڈاکٹر البرٹ مون (Albert Moon) جو ایٹمی توانائی کی تحقیق کا باپ مانا جاتا ہے، کہتا ہے کہ آج تک جسمانی الیکٹرانکس کے کرشمے دیکھتے

رہے ہیں لیکن اب ہمیں روحانی الیکٹرانکس پر کام کرنا چاہیے؛ کیوں کہ اس کے ذریعے انسانی قویٰ کو اس قدر بڑھایا جاسکتا ہے کہ آدمی ایک سکنڈ میں دنیا کا چکر لگا سکتا ہے۔"(۲)

ڈاکٹر مون تو مستقبل کی بات کر رہے ہیں جب کہ ہمارے اولیائے کرام سے کئی صدیوں پہلے ان کرامات کا ظہور ہو چکا ہے۔ طی الارض اور طی الزمان کی کرامات کے بدولت وہ ایک لمحہ میں کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتے تھے۔ حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ سب جانتے ہیں کہ کس طرح آپ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کے ممبر پر کھڑے ہو کر عراق کے نہاوند مقام پر لڑنے والی اسلامی فوج کے کمانڈر کو پہاڑ کے پیچھے سے حملہ آور ہونے کی خبر دی اور شکست سے بچا لیا۔(۳)

سائنس جو ۲۵۰ سال سے تحقیق کرتے آرہی ہے کہ روح کی طاقت کیا ہے اور مراقبے کا فلسفہ کیا ہے، اس نے کچھ دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں اور یہ پتہ چلایا ہے کہ انسان کے اندر طاقت کا منبع روح ہے جو ذہن کے راستے سے کام کرتا ہے اور ہم آلات کے ذریعے روح تک نہیں پہنچ سکتے۔ ذہن کے اندر جھانکنے سے پتہ چلتا ہے کہ ذہن ایک ہے لیکن اس کی چار تہیں ہیں، دوسرے لفظوں میں ۴ چینل ہیں جن کی الگ الگ فریکونسی (Frequency) ہے۔ ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:(۴)

چینل نمبر ۱:(Beta Frequency 14 to 40 hzs) عام لوگ ساری زندگی دوسرے چینلز سے مکمل بے خبر صرف اسی فریکونسی سے ہر کام کرتے۔ ہیں اس فریکونسی پر دنیا کے ذہن، عام کام، ہوشیاری، چالاکی لیکن زیادہ تر نفرت اور برائی کے قریب رہتے ہیں یہ دنیا کے کاموں کے لیے ہے دعا اس میں اپنا اثر نہیں دکھاتی۔

چینل نمبر ۲:(Alpha Frequency 7 to 13 Hzs) جب انسان کا ذہن اس فریکونسی پر ہو تو اپنے آپ کو باب رحمت کے قریب پاتا ہے اور اس کی دعا کے قبول ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

چینل نمبر ۳:(Theta Frquency 3 to 6 Hzs) یہ فریکونسی باب رحمت کے اندر ہے، دعا کی قبولیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

چینل نمبر ۴:(Delta Frequency 0.5 to 3 Hzs) دعا کے ساتھ ہی قبولیت ہوتی ہے، اسی چینل کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

سائنس نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ مراقبے سے ذہن کی لہروں کی فریکونسی ۴۰ چکر فی سکنڈ سے ۷ چکر فی سکنڈ تک آجاتی ہے جس سے سکون اور اطمینان قلب اور اس کے نتیجے میں ذہنی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے دور جدید کا انسان بھی مراقبہ یا Meditation کا سہارا لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں امریکا اور یوروپ کے سائنسداں اور ڈاکٹرس مریضوں کے لیے مراقبہ پر زور دے رہے ہیں جیسا کہ امریکا کے بعض دواخانوں میں مریضوں کو Depression اور Stress اور B.P. اعصابی دباؤ کے خاتمہ کے لیے ۱۵ تا ۲۰ منٹ میڈیٹیشن کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

البتہ اسلامی مراقبہ جس کا مقصد معرفت الٰہی اور تقرب الی اللہ ہے اور دنیاوی Medetation اور یوگا وغیرہ کا مقصد صرف وقتی سکون اور دنیاوی مفاد کے حد تک محدود ہے، ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

مذکورہ حقائق سے ظاہر ہے کہ آج دنیا روحانی سکون کے لیے تڑپ رہی ہے اور مادہ پرستی و لادینیت جو تباہی مچا رہی ہے اس سے دنیا کا ایک بڑا حصہ تنگ آچکا ہے، لیکن وہ اس اضطراب و بے چینی سے اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس نسخہ پر عمل نہ کریں جو قرآن نے پیش کیا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ ذکر الٰہی ہے، ارشاد ربانی ہے: أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد: ۲۸) آگاہ ہو جاؤ! اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو چین و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

ذکر و شغل اور مراقبہ کے اصول جو اولیائے کرام و صوفیۂ عظام نے مقرر کیے ہیں اور ان پر خود عمل کر کے بتایا ہے اس سے بہتر طریقہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جن اذکار و اشغال کے ذریعے ان کو قرب اور استغراق نصیب ہوا وہ کسی وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ قرب حق میں پہنچ کر ہمیں وہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ اگر بادشاہوں کو اس کا علم ہو جائے تو تلواریں لے کر ہمارے سروں پر آجائیں۔

ذکر الٰہی

ذکر کے لغوی معنی یاد کرنا، یاد رکھنا اور بھولی ہوئی چیز کی یاد تازہ کرنا ہے اور اصطلاح شرع میں ذکر سے مراد اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہے۔ ذکر کی ضد غفلت ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا۔ (۵) اس کا کہنا نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے۔

ذکر الٰہی اصطلاح تصوف میں غیر اللہ کو دل سے فراموش کر کے حضور قلب کے ساتھ حق تعالیٰ کے قرب و معیت کے حصول کی کوشش کرنے کو کہتے ہیں، چنانچہ ہر وہ شئے جس کے توسل سے یاد حق ہو خواہ نماز ہو یا تلاوت قرآن، کلمہ ہو یا درود شریف یا اذکار و ادعیہ یا اشغال و کیفیات

وغیرہ جن سے مطلوب کی یاد ہو اور طالب ومطلوب میں رابطہ پیدا ہو جیسا کہ صوفی کے جملہ اقوال وافعال واحوال جو یادحق سے خالی نہیں رہتے ، ذکر کہلاتے ہیں۔(۶)

انسان کے سب سے بہترین لمحات اور اوقات وہی ہیں جو یادالٰہی میں گزرے۔ حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! دن اچھا نہیں لگتا مگر تیری یاد کے ساتھ اور رات اچھی نہیں لگتی مگر تجھ سے رازونیاز کے ساتھ۔

دن وہی دن ہے شب وہی شب ہے

جوتری یاد میں گزر جائے

انسان کی فضیلت دو باتوں میں مضمر ہے تخلیہ (تزکیہ نفس) اور تحلیہ (یاد الٰہی سے آراستگی) اللہ تعالٰی نے انسان کی فلاح انہی دو باتوں پر موقوف رکھی ہے، ارشاد فرمایا: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (۷) وہ شخص کامیاب ہو گیا جسے تزکیہ نفس حاصل ہوا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہا اور نماز پڑھا۔

شیطان کی یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ انسان کامیابی سے ہمکنار نہ ہو، اس کی مثال ایسی ہے جیسا کہ آدمی اپنے دشمن پر قابو پائے تو سب سے پہلے وہ ہتھیار چھینتا ہے جو مہلک ہے۔ شیطان انسان پر قابو پاتے ہی یادالٰہی سے غافل کر دیتا ہے، اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے: اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ اللهِ۔ (۸) (شیطان ان پر قابو پا گیا تو اس نے ان سے ذکر الٰہی کو بھلا دیا) ذکر الٰہی شیطان کے حق میں تباہی کا ذریعہ ہے، اس لیے ایک حدیث شریف میں آتا ہے: تم پر لا الٰہ الا اللہ اور استغفار لازم ہے، دونوں کی خوب کثرت کرو کیوں کہ شیطان کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں سے تباہ وبرباد کیا تو انہوں نے بھی مجھے لا الٰہ الا اللہ اور استغفار کے ذریعے تباہ وبرباد کیا۔(۹)

علم تصوف کا بڑا مقصود تقرب الٰہی ہے جس کے حاملین کو قرآن نے مقربین کے نام سے یاد کیا ہے اور تقرب کے حصول کا ذریعہ رضائے الٰہی ہے۔ ارشاد باری ہے: وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ أَكْبَرُ (۱۰) (اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے) رضائے الٰہی اس لیے اکبر ہے کہ وہ مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے پھر رضائے الٰہی کا بڑا وسیلہ ذکر الٰہی ہی ہے، اس اکبر کی تحصیل کے ذریعہ کو بھی اکبر قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ ذکر الٰہی بہت بڑی شئے ہے۔(۱۰)

ذکر الٰہی کا اصل محرک اور سبب حب الٰہی ہے دنیائے محبت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جس شئے سے محبت ہوتی ہے اسے اٹھتے بیٹھتے یاد کیا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق من احب شیئا اکثر ذکرہ (جو جس چیز سے محبت رکھتا ہے اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے) رب کو محبوب

رکھنے والا اس کا ذکر کثرت سے کرے گا۔ کامل ایمان والوں کی شان میں قرآن کا فرمان ہے:

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ ایمان والے اللہ سے حد درجہ محبت رکھتے ہیں۔(۱۱)

محبت کے جتنے اسباب ہو سکتے ہیں وہ سب احسن و اکمل طور پر خالق کائنات میں جمع ہیں
حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ سے بندے کا تعلق صرف عبدیت و معبودیت کا ہی نہیں بلکہ عشق و محبت کا بھی ہے۔ اللہ محبوب حقیقی ہے اور بندہ اس کا عاشق۔(۱۲)

اس لیے علم تصوف کی تمام تر توجہ رب العالمین سے رابطہ قلبی کو لگائے رکھنا ہے اور اس کا بڑا ذریعہ ذکر الٰہی ہے جو محبت الٰہی کی پہلی علامت بھی ہے اور دلیل بھی ہے اور جب تک آئینۂ دل کو عبادت اور ذکر الٰہی سے صاف نہ کیا جائے تو معرفت الٰہی محال ہے۔ جو طریقت کی غایت و مقصود ہے۔ اسی لیے معلم کائنات ﷺ کا ارشاد ہے: ان لکل شیٔ صقالۃ و ان صقالۃ القلوب ذکر اللہ بے شک ہر چیز کے لیے ایک صاف کرنے والی شئے یعنی پالش ہے اور دلوں کو صیقل کرنے والی چیز اللہ کا ذکر ہے۔(۱۳)

ذکر کی ضرورت و اہمیت کو ایک مثال کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی اپنے محبوب سے طویل عرصے کے لیے جدا ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کی یاد دل سے کافور ہونے لگتی ہے۔ اس سے ربط قائم رکھنے کی صورت یہ ہے کہ اس سے خط و کتابت اور اس کا ذکر و فکر جاری رکھے جو محبت میں اضافہ کا باعث ہے جو ایک نہ ایک دن پھر محب کو محبوب سے ملا کر رہتی ہے۔ یہی حال بچھڑی ہوئی انسانی روح کا ہے جو اس جسم کے پیدا کیے جانے سے ہزاروں برس پہلے پیدا کی جا چکی تھی، جو قرب خداوندی سے نکل کر اپنے محبوب حقیقی سے دور جا پڑی ہے، اگر اس جدائی کے عرصے میں وہ روح اپنے محبوب و مطلوب کے ساتھ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کے مطابق ذکر و فکر کی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھے تو شوق وصال بڑھتا جائے گا اور پھر محبوب ازلی بھی جواباً اس آیت کے مطابق وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ جو لوگ ہماری راہ میں ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں تو ہم ضرور ان کو اپنی راہیں بتائیں گے اور بے شک اللہ (مخلصوں نیکوکاروں) کے ساتھ ہے۔(۱۴) وہ اپنی بارگاہ کے قرب و حضوری سے نوازے گا۔

ذکر الٰہی کی دو صورتیں ہیں: پہلی صورت: نعمتوں کو دیکھ کر منعم (نعمت عطا کرنے والے) کو یاد کرنا۔ دوسری صورت: رب کی یاد سے اس کی نعمتوں کو یاد کرنا، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں انسان ذکر کی دائمی کیفیت سے محروم ہوتا ہے کیوں کہ انسان پر رنج و راحت دونوں کیفیتیں آتی رہتی ہیں جب وہ راحت میں رہے گا تو ذکر کرے گا اور دوسری صورت میں انسان

نعمت ملے یا نہ ملے یاد کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے پارے میں تین مقام پر بنی اسرائیل کی ہمت کے مطابق یہ فرمایا: یَا بَنِی إِسرَائِیلَ اذْکُرُوا نِعْمَتِیَ۔ (اے بنی اسرائیل میری نعمت کو یاد کرو) اور امت محمدیہ (علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والسلام) کو سب سے پہلی مرتبہ ذکر کی یہ تعلیم دی: فَاذْکُرُونِی أَذْکُرْکُمْ۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔ (۱۵)

حضرت ابن عباس نے فرمایا: ولذکر اللہ اکبر کا ایک معنی یہ ہے کہ اللہ کا تمہیں یاد فرمانا تمہاری یاد سے بڑی چیز ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا ہے: **انا عند ظن عبدی و انا معہ حین یذکرنی فان ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی وان ذکرنی فی ملأ ذکرتہ فی ملأ خیر منھم۔** میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں اور میں بندے کے ساتھ ہوں جب کہ وہ میرا ذکر کرتا ہے۔ اگر وہ مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اکیلے ہی یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی جماعت میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں ان سے بہتر جماعت میں اسے یاد کرتا ہوں۔ (۱۶)

یہ حدیث ذکر بالجہر اور اجتماعی ذکر کی افضلیت کی بھی دلیل ہے۔

ہر محب کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ محبوب بھی اسے چاہے۔ جب ذکر سے ذاکر مذکور ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں محب محبوب ہو جاتا ہے۔ ارشاد باری ہے: یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّونَہٗ رب ان کو چاہتا ہے اور وہ رب کو چاہتے ہیں۔ (المائدہ: ۵۴) بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کی محبوبیت کا اعلان آسمان و زمین کی ساری مخلوق میں فرما دیتا ہے۔

محبت محبوب کے ذکر کو سب سے پہلے محب کی زبان پر وارد کرتی ہے، جسے لسانی ذکر کہا جاتا ہے۔ جب یہ یاد پختہ ہو جاتی ہے تو دل میں گھر کر لیتی ہے پھر محب ہر وقت اس کی یاد میں مصروف رہتا ہے، جسے قلبی ذکر کہا جاتا ہے، زبان سے اللہ کے نام کا ذکر کیا جاتا ہے اور دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا ذکر کیا جاتا ہے، دل کی یاد اور حضوری کے بغیر زبان کے ذکر کے کامل اثرات مرتب نہیں ہوتے جیسا کہ دکن کے ایک بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین احمد ہاشمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

دل میں یاد اور لب پہ تیرا نام ہو
عمر بھر اب ہاشمی یہ کام ہو

قرآن مجید میں نام کے ذکر اور ذات کے ذکر دونوں کی بھی تلقین کی گئی ہے۔ رب تعالیٰ نے اسم ذات کے ذکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ بُکْرَۃً وَّأَصِیلًا۔ صبح و شام اپنے رب کا نام ذکر کرو، (الدہر: ۲۵) اور ذات کے ذکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا۔ اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ (الاحزاب: ۴۱) اور ارشاد فرمایا: وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً۔ اپنے رب کو عاجزی اور خوف سے اپنے دل میں یاد کرو۔ (۱۷)

انسان ذکر لسانی سے بے نیاز نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ ذات سے محبت کرنے والا اس کے نام کے ذکر سے بھی محبت رکھتا ہے۔ محبوب کی ہر شئے پیاری ہوتی ہے، چنانچہ مسلم شریف کی ایک طویل حدیث کا اختتام اس بات پر ہوتا ہے کہ جب اللہ اجتماعی ذکر میں شریک ہونے والوں کی مغفرت کا وعدہ فرماتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں اے ہمارے رب! ان میں ایک خطا کار بندہ بھی تھا جو وہاں سے گزرا اور ان کے ساتھ بیٹھ گیا (ذکر کا خاص ارادہ نہ تھا) تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ولہ غفرت ھم القوم لایشقی بھم جلیسھم۔ میں نے اس کی بھی مغفرت کردی وہ ایسی جماعت ہے جن کا ہم نشین محروم نہیں ہوتا۔ (رواہ مسلم) (۱۸)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم جنت کے باغات سے گزرو تو تم اس میں چرلو۔ صحابہ نے دریافت کیا: وَمَا رِيَاضُ الْجَنَّةِ؟ جنت کے باغات کیا ہیں؟ قال: حلق الذکر آپ ﷺ نے فرمایا: وہ ذکر کے حلقے ہیں۔ (رواہ الترمذی) (۱۹)

یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کے آستانوں پر ذکر کی مجلسیں منعقد کی جاتی ہیں اور اس فضیلت کو وہی حاصل کرسکتا ہے جو بزرگوں کے دَر سے وابستہ ہے۔

ہر عبادت کے لیے ایک حد اور یک وقت مقرر ہے مگر ذکر کے لیے کوئی وقت و حد مقرر نہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کان رسول اللہ ﷺ یذکر اللہ علی کل احیانہ رسول اللہ ﷺ ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ (۲۰)

ذکر الٰہی دل کی زندگی اور غفلت اس کی موت ہے۔ بخاری شریف کتاب الدعوات میں یہ روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا مثل الذی یذکر ربہ والذی لایذکر مثل الحی والمیت (اس شخص کی مثال جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو یاد نہیں کرتا زندہ اور مردہ کی سی ہے۔) (۲۱)

اسی لیے ذاکر مر کر بھی زندہ ہے اور غافل زندہ رہ کر بھی مردہ ہے ؎

آباد وہی دل ہے کہ جس میں تمہاری یاد ہے
جو یاد سے غافل ہوا ویران اور برباد ہے

سالک کو زندگی کی ہر سانس ذکر الٰہی سے معمور کرنے کی اس لیے تاکید کی جاتی ہے کہ شیطان کی مکمل کوشش ہوتی ہے کہ انسان کے دل پر کسی طرح قبضہ جمالے؛ کیوں کہ وہی رب کے انوار کا محل ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ شیطان ابن آدم کے

دل پر قبضہ جمائے رہتا ہے: اذاذکر اللہ خنس و اذاغفل و سوس۔ جب بندہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب غافل ہو جاتا ہے تو وسوسے ڈالتا ہے۔ خناس کے معنی آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے والے کے ہیں، اسی لیے شیطان کا نام خناس رکھا گیا ہے۔ اس لیے اہل اللہ نے دل پر شیطان کے ناجائز قبضہ کو ختم کے لیے پاس انفاس کی تعلیم دی ہے۔ علم تصوف میں سانس لیتے اور سانس باہر کرتے وقت جہرا یا سرا لاالٰہ الا اللہ یا اسم جلالت اللہ کے ذکر کو پاس انفاس کہتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا حق تک پہنچنے کا کیا راستہ ہے؟ آپ نے فرمایا:

اگر تو پاسداری پاس انفاس

سلطانی رسانندت ازیں پاس

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز علیہ الرحمہ نے زندگی کی ہر سانس حق تعالیٰ سے مشغول رکھنے کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا ''طالب کسی حال میں غافل نہ رہے؛ کیوں کہ کیا پتہ کہ یہی سانس جو وہ لے رہا ہے اس کی زندگی کی آخری سانس ہو۔

غافل از احتیاط نفس یک نفس مباش

شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود (۲۲)

بزرگوں نے دل کی صفائی کے لیے جواذ کار اور اشغال اور مراقبے مقرر فرمائے ہیں وہ عین قرآن وحدیث کے تقاضوں کی تکمیل ہے جیسا کہ قرآن نے ذاکرین الٰہی کو عقل مند کہتے ہوئے فرمایا: اَلَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ عقل مند وہ ہیں جو کھڑے ہونے اور بیٹھنے کی حالت میں اور اپنے کروٹوں (بستروں) پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں۔ (۲۳)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اکثروا ذکر اللہ حتی یقولون مجنون۔ اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں۔ (المستدرک للحاکم والمعجم الکبیر للطبرانی) (۲۴)

خیر الامور اوسطھا۔ کی روشنی میں تمام امور میں افراط ناپسندیدہ ہے تاہم ذکر الٰہی میں اس کی رخصت واجازت ہے، اس لیے رب العالمین نے نمازوں کے درمیان کے اوقات کو بھی ذکر الٰہی سے معمور کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِكُمْ۔ جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے ہوئے بیٹھے ہوئے، اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے اللہ کو یاد کرو۔ (النساء: ۱۰۳) اس دوامی ذکر کی کیفیت درحقیقت صوفیۂ کرام کا حصہ ہے۔ جب ذکر الٰہی کے بغیر چین نہیں آتا اللہ تعالیٰ نے اسی دلی کیفیت کی نشان دہی

کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ۔ سن لو! اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ (۲۵)

جب فرشتے انسانی شکل میں حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس ان کی خلت کا امتحان لینے کے لیے آئے تو آپ نے ذکر الٰہی سن کر اپنے ہزاروں اونٹوں پر مشتمل ریوڑ ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہو گئے پھر آخر میں کہہ دیا مجھے بھی ان کا چرواہا بنا کر لے چلو مگر میرے محبوب کا ذکر سناؤ۔ ذکر روح کے اصلی وطن کا خط ہے۔ مسافر کو پردیس میں وطن کے خط سے تسکین ہوتی ہے۔ آج جو دنیا میں بے اطمینانی و بے چینی پائی جاتی ہے، وہ ذکر الٰہی سے غفلت کا نتیجہ ہے۔ ذکر الٰہی دل کی غذا ہے۔ لامحالہ جب دل اپنی غذا نہ پائے گا تو وہ ضرور بے چین رہے گا۔

مراقبہ

جس طرح ذکر واذکار کی عظمت کا ثبوت قرآن وحدیث سے صراحۃً ملتا ہے اسی طرح مراقبے کا ثبوت بھی قرآن وحدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ جس طرح علوم قرآن وحدیث اور فقہ کے اصطلاحات بعد کے ادوار میں وجود میں آئے لیکن ان کی حقیقت پہلے ہی سے پائی جاتی تھی اسی طرح مراقبے کی حقیقت کا اظہار قرآن وحدیث میں ''تفکر'' کے نام سے کیا گیا ہے۔

تصور وفکر، مراقبہ کی اصل ہے۔ حضرت سید شاہ ابوالحسن احمد نوری رحمۃ اللہ علیہ ذکر وشغل اور مراقبہ کا فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ذکر سے مراد زبان کا فعل اور شغل سے مراد قلب کا فعل اور مراقبہ کسی چیز کے تصور کرنے اور اس کا خیال باندھنے کو کہتے ہیں''۔ (۲۶)

قرآن مجید میں وہ تمام الفاظ جن کے معنی غور وفکر کے ہیں ان کی تعداد تقریباً پانچ سو سے زیادہ ہے، ان آیات سے مراقبے کا بین ثبوت ملتا ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔ (۲۷) (اپنے رب کا نام ذکر کرو اور تمام مخلوق سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔) اس میں ذکر الٰہی کے بعد ''تبتل'' اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ کیفیت مراقبے سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ صاحب تفسیر روح المعانی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

انقطع الیه تعالیٰ بالعبادة وجرد نفسک عما سواه عزوجل واستغرق فی مراقبته سبحانه۔ یعنی ہر طرف سے تعلق توڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جا، اپنے نفس کو ماسوا کے خیال سے پاک کر دے اور ہر وقت اللہ کے مراقبہ میں مستغرق ہو جا۔ (۲۸) ذکر کے بعد فکر کا مقام آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ (۲۹) (عقلمند وہ ہیں جو کھڑے ہونے اور بیٹھنے

کی حالت میں اور اپنے کروٹوں (بستروں) پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں۔)

اسی تفکر کو مراقبہ بھی کہا گیا ہے اور یہ افضل ترین عبادت قرار دی گئی ہے۔علامہ بیضاوی فرماتے: وھو افضل العبادات کماقال علیه الصلاة والسلام: لا عبادة کالتفکر۔ (۳۰) جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تفکر کے برابر کوئی عبادت نہیں۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: فکرة ساعة خیر من عبادة ستین سنة۔ (۳۱) ایک ساعت کی فکر ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہے اور ایک دوسری روایت میں ہے: تفکر ساعة خیر من قیام لیلة۔ (۳۲) ایک ساعت کا تفکر رات بھر قیام (یعنی عبادت) سے بہتر ہے۔

جب دل اغیار سے پاک وصاف ہو کر ذکر الٰہی سے سرشار ہو جاتا ہے اور ہر شئے میں رب کی قدرت کا جلوہ دیکھتا ہے تو ذکر، فکر کا مقام لے لیتی ہے جو مراقبے کی منزل ہے اور اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے۔

تیرے جلووں کے سوا کیا ہے نگاہ و دل میں
تو ہی تو ہے میرے احساس کی ہر منزل میں

جب سالک ذکر وفکر کے ذریعے مقام روحانیت سے خاص تعلق پیدا کر لیتا ہے تو اس پر انوار الٰہی ظاہر ہونے لگتے ہیں۔یہاں سے مشاہدہ کی منزل شروع ہو جاتی ہے، چنانچہ ذکر کا نتیجہ فکر یعنی مراقبہ ہے اور مراقبہ کی انتہا مشاہدہ ہے اور یہی غایت فکر اور حقیقت ذکر ہے۔بخاری و مسلم کی وہ حدیث جو حدیث احسان سے مشہور ہے، اس حقیقت پر دلالت کرتی ہے۔حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ: ان تعبداللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (۳۳) تو اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تو نہیں دیکھ رہا ہے تو یہ خیال کر کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اس حدیث شریف کا پہلا جز (کانک تراہ) مشاہدہ کی دلیل ہے اور دوسرا جز (فانہ یراک) سے مراقبہ کا ثبوت ملتا ہے۔

مراقبہ رقیب سے ماخوذ ہے اور عربی میں رقیب نگہبان اور محافظ کو کہتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَكَانَ اللهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ رَّقِيبًا۔ (۳۴) (اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔) ماسوی اللہ کی یاد اور غیر حق سے دل کو محفوظ رکھنے کا نام مراقبہ ہے۔ (۳۵)

مراقبہ بمعنی ترقب کے بھی ہیں جس کے معنی انتظار کرنا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیض یا رحمت کا انتظار کرنے کا نام مراقبہ ہے۔ (۳۶)

فکر آلودہ کو دور کر کے فکر خالص کا حصول مراقبہ کہلاتا ہے۔سب کو چھوڑ کر رب کے دھیان

میں مشغول ہونا مراقبہ ہے۔ مراقبہ درحقیقت اس آیت: فَفِرُّوْا إِلَى اللهِ۔ (۳۷) (تم اللہ کی طرف بھاگو) کی تعمیل ہے اور وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (۳۸) پر عمل آوری ہے۔

فکر و مراقبہ کا انحصار کمال توجہ پر ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے مراقبے کا طریقہ بلی سے سیکھا کہ ایک روز میری نظر ایک بلی پر پڑی جو چوہے کی بل پر گھات لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے استغراق کا یہ عالم تھا کہ جسم کا ایک بال تک نہ ہلتا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہی تھا کہ اچانک میرے باطن سے یہ ندا آئی کہ اے پست ہمت! تیرا مقصود نہایت اعلیٰ وارفع ہے، اس لیے تیرا استغراق اس بلی سے بھی بلند و بالا ہونا چاہیئے آپ فرماتے ہیں کہ اس روز سے میں نے مراقبے کا یہ طریقہ اختیار کیا اور خوب فیض یاب ہوا۔ (۳۹)

صوفیۂ کرام نے بہت سے مراقبے اپنی کتب میں درج کیے ہیں۔ بعض مراقبے دل کو ادھر ادھر کے خیالات سے فارغ کر کے یکسوئی پیدا کرنے کے لیے اور بعض نفس کی خواہشات پر کنٹرول کرنے کے لیے اور بعض اپنے دل کو نور معرفت سے منور کرنے کے لیے اور بعض مراقبے کشف ارواح اور حقائق کے انکشاف کے لیے اور بعض مراقبے امراض سے شفا کے لیے مقرر ہیں۔

مراقبے کا مشہور طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات جن میں توحید کا مفہوم ہے ان میں سے کسی آیت کو اختیار کر کے اس کے معنی و مفہوم پر مکمل توجہ دی جاتی ہے، جیسے: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُم۔ (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو) فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللهِ۔ (جہاں تم رخ کرو وہاں اللہ کی ذات ہے) أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللهَ يَرَى۔ (کیا اسے علم نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے) وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔ (ہم اس کے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ إِنَّ مَعِيَ رَبِّي سَيَهْدِينِ۔ (بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے ہدایت دے گا) اسی طرح اسمائے حسنیٰ کا مراقبہ کیا جاتا ہے۔

بزرگان دین کے یہاں ایک مجرب اور مشہور مراقبہ یہ ہے کہ تعوذ و تسمیہ پڑھ کر ایک مرتبہ زبان سے ''اللہ حاضری اللہ ناظری اللہ معی'' کہہ کر اس تصور میں ڈوب جائے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے (یعنی مجھے دیکھ رہا ہے) اور میرے ساتھ ہے۔ اس خیال میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ غیر خدا کا یہاں تک کہ اپنا خیال بھی دل سے نکل جائے۔ اس کی معیت کا جہت و مکان کی تنزیہہ (پاکی) کے ساتھ تصور کرے (۴۰) مراقبہ کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ صبح یا شام کے وقت ۱۵ یا ۲۰ منٹ باوضو ہو کر دنیا و مافیہا کے خیالات دل سے ہٹا کر آنکھوں کو بند کر کے سر جھکا کر بیٹھنا اور یہ خیال کرنا کہ اللہ کی رحمت کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ اور اللہ کی رحمت میرے دل میں سما رہی ہے اور میرے دل کی ظلمت وسیاہی دور ہو رہی ہے اور میرا دل شکریہ کے طور پر اللہ کہہ رہا ہے۔

یہ وقت کی قید عادت کے لیے ہے ورنہ کمال مراقبہ یہ ہے کہ چلتے پھرتے اپنے دل میں یہ دھیان رکھیں کہ میرا دل اللہ اللہ کہہ رہا ہے۔ بقول ایک بزرگ:

تو، کو اتنا مٹا کہ تو نہ رہے
تیری ہستی کی رنگ و بو نہ رہے
ھو، میں ایسا کمال پیدا کر
کہ بجز ھو کے غیر ھو نہ رہے

عاشقان الٰہی اَلَّذِینَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَائِمُوْنَ کے مطابق ہمیشہ حالت مراقبہ یا مشاہدہ میں رہتے ہیں۔ بقول شاعر:

کبھی خیال کی حد میں تھا یار کا جلوہ
اور اب ہے جلوہ ہی جلوہ خیال یار نہیں

حضرت شیخ واسطی نے فرمایا: بہترین عبادت یہ ہے کہ تو اپنے اوقات کی حفاظت کرے ،اس طرح کہ اپنے باطن کے سوا کسی چیز کی طرف نہ جھانکے نہ اپنے رب کے سوا کسی اور کو نگاہ میں رکھے اور اپنے وقت کے سوا کسی اور کا ساتھ نہ دے۔(۴۱)

حضرت خواجہ بندہ نواز علیہ الرحمہ نے اپنے یازدہ رسائل میں رسالہ نمبر ہشتم خالص مراقبے کے بیان کے لیے خاص فرمایا: اور چھتیس مراقبات درج کیے ہیں۔(۴۲) اذکار و اشغال اور مراقبات کے لیے حضرت امداد اللہ مہاجر مکی علیہ الرحمہ کی تصنیف ''ضیاء القلوب'' قابل دید ہے۔

ذکر ہو کہ مراقبہ مداومت کے بغیر سالک کما حقہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ مراقبہ کا مقصد یاد الٰہی ،حضور قلب اور جمعیت قلب ہے۔ کوئی خصوصی کیفیت پیدا نہ بھی ہو تو اس سے بیزار نہ ہو بلکہ بقول شاعر یہ خیال کرے:

مصحفی ہم تو سمجھتے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

کنواں جب کھودا جاتا ہے تو پہلے مٹی نکلتی ہے بعد میں پانی نکلتا ہے۔ اسی طرح مبتدی کو مراقبے میں پہلے وساوس آتے ہیں پھر یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ مداومت کے سلسلے میں حضرت تاج الدین عطاء اللہ اسکندری نے کیا پیاری بات کہی ہے: ذکر قلبی کی تکرار کر، پھر مطالبۂ انوار کر۔ اس کنواں کھودنے والے کی طرح نہ ہو جا جس نے ایک گز یہاں کھودا ایک گز وہاں کھودا، ایسے کس طرح پانی نکلے گا ایک جگہ کھود تو آسانی نکلے گا۔(۴۳)

غرض کہ دلوں کا چین وسکون اور تقرب الٰہی کا عظیم ذریعہ فکر و مراقبہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔مقام گنج شکر، کپتان واحد بخش سیال چشتی،ص:۲۳(مطبوعہ:ارشد برادرس،نئی دہلی)
۲۔مقام گنج شکر،ص:۲۱
۳۔مشکوٰۃ المصابیح،باب الکرامات
۴۔مراقبہ اور لذت آشنائی،محمد الطاف۔
۵۔سورۃ الکہف:۲۸
۶۔سر دلبراں، حضرت سید شاہ سید محمد ذوقی:۱۶۹
۷۔سورۃ الاعلیٰ:۱۵۰۔۱۴۰
۸۔سورۃ المجادلۃ:۱۹
۹۔کنز العمال بحوالہ مسند ابی یعلیٰ عن ابی بکر رضی اللہ عنہ
۱۰۔سورۃ العنکبوت:۴۵
۱۱۔سورۃ البقرۃ:۱۶۵
۱۲۔حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، شبیر حسن نظامی:۱۴۳
۱۳۔المتجر الرابح، ابن ابی الدنیا
۱۴۔سورۃ العنکبوت:۶۹
۱۵۔سورۃ البقرۃ:۱۵۲
۱۶۔صحیح مسلم
۱۷۔سورۃ الاعراف:۲۰۵
۱۸۔صحیح مسلم
۱۹۔جامع ترمذی
۲۰۔صحیح مسلم
۲۱۔بخاری شریف، کتاب الدعوات
۲۲۔روح تصوف، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز
۲۳۔ال عمران:۱۹۱
۲۴۔المستدرک للحاکم والمعجم الکبیر للطبرانی
۲۵۔سورۃ الرعد:۲۸
۲۶۔سراج العوارف فی الوصایا والمعارف:۱۵۲

۲۷۔سورۃ المزمل:۸
۲۸۔روح المعانی،سورۃ المزمل
۲۹۔سورۃ آل عمران:۱۹۱
۳۰۔تفسیر بیضاوی،سورۃ آل عمران
۳۱۔کنز العمال، کتاب الاخلاق
۳۲۔نفس مصدر
۳۳۔بخاری شریف، کتاب الایمان
۳۴۔سورۃ النساء:
۳۵۔ضیاء القلوب:حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی:۷۶
۳۶۔اربع انہار،شاہ احمد سعید نقش بندی مجددی:۱۲۷
۳۷۔سورۃ الذاریات:۵۰
۳۸۔سورۃ الذاریات:۲۱
۳۹۔سلوک مجددیہ،حضرت عبداللہ شاہ صاحب محدث دکن:۲۴
۴۰۔اربع انہار:۱۲۸،ضیاء القلوب:۵۵۔۵۴
۴۱۔رسالہ قشیریہ:۴۱۵
۴۲۔یازدہ رسائل،ادبی دنیا،دہلی
۴۳۔تاج العروس حضرت تاج الدین عطاء اللہ سکندری

○○○

نفس کشی اور تزکیہ ۔ قرآن وسنت کی روشنی میں

کوئی تیس سال پہلے کی بات ہے، جب ایک مشہور دار العلوم کے منیجر کی استدعا پر استاذ گرامی امام علم وفن حضرت خواجہ مظفر حسین صاحب مدت فیوضہ نے کشن گنج، بہار، کے رہنے والے اپنے ایک نوجوان شاگرد مولانا محمد عارف صاحب رضوی کو تدریس کے لیے بھیجا تو وہاں کے صدر المدرسین صاحب نے مولانا سے دریافت فرمایا کہ آپ کو خصوصی دلچسپی کس فن سے ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ منطق سے! ایک تو صدر مدرس سے مشورہ کیے بغیر ماتحت مدرس کا تقرر، وہ بھی حضرت خواجہ صاحب کے ذریعہ، طرّہ یہ کہ بہت ہی کم عمر۔ موصوف کو یہ باتیں ناگوار لگیں اور ایک خاص انداز میں فرمایا: معاف کیجیے! مجھے تو منطق کے نام ہی سے قے آنے لگتی ہے۔ مولانا عارف سے یہ انداز طنز مخفی نہیں رہ سکا، انہوں نے برجستہ جواب دیا: جی! جب کوئی چیز ہضم نہ ہوتو قے ہو ہی جاتی ہے۔ یہی حال کچھ تصوف وروحانیت کا بھی ہے۔ جن کو تصوف ہضم نہیں ہوتا وہ اس کے نام نہیں، تصور ہی سے قے کرنے لگتے ہیں۔ وہ مادی دنیا کی دُھن میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ ان کو اس کے حصول میں ساری رکاوٹ بس تصوف وروحانیت ہی نظر آتی ہے۔ وہ لکھ کسی بھی عنوان پر رہے ہوں مگر ان کا قلم بے قابو ہوکر تصوف کے خلاف زہر اگلنے لگتا ہے:

''☆ابتدائی صوفیوں کے بارے میں اگر گہرا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان کے طریقوں پر دیگر اقوام کے فلسفۂ تصوف کا غلبہ تھا۔ مثلاً ابراہیم بن ادھم (۱۶۲ھ یا ۷۷۷ء) جو بلخ کے شہزادے یا بادشاہ تھے، دنیا سے کنارہ کش ہوکر صوفیانہ لباس پہنے اپنے ملک سے نکل گئے۔ انہوں نے محض دنیا سے کنارہ کشی کو معرفت الٰہی کا ذریعہ سمجھا۔۔۔۔۔ یہ گوتم بدھ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ اسی طرح ابوسلیمان الدارانی نے عیسائی راہبوں کی طرح غیر معمولی جسمانی ریاضت اور تزکیۂ نفس کی تعلیم دی۔ ان کے پاس معرفت الٰہی کا یہی ذریعہ تھا۔ معروف کرخی ابتدا میں کرسچن یا صابی تھے انہوں نے ریاضت کو اصل عبادت اور معرفت الٰہی کا ذریعہ قرار دیا۔ ذوالنون مصری

کا خیال تھا کہ صرف وجد ہی اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ بایزید بسطامی (۸۷۵ء) مجوسی النسل تھے۔ انہوں نے فنا کا نظریہ پیش کیا یعنی خود کی ذات کو فنا کر دینا۔ یہ نظریہ بھی بدھوں کے نظریۂ نروان سے ملتا ہے۔

''☆ فلاطینوس (۲۰۴ء تا ۲۷۰ء) روح کی لافانیت کا قائل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی روح عالم بے خودی میں اللہ کی روح سے متحد ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ اور اللہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ ابن عربی بھی ایسے ہی خیالات کے حامی تھے۔ ابن عربی کے اس فلسفے نے صوفیا پر بہت گہرا اثر ڈالا اور اسلامی ممالک میں یہ خیال اس قدر عام ہو گیا کہ سب اس کی زد میں آ گئے۔''

☆ جب یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفہ کے اثرات اور ارسطو کی تعلیمات اور عیسائی راہبوں کے طور طریقے مسلمانوں میں پھیلنے لگے جہاں معرفت الٰہی کے حصول کے لیے دنیا سے کنارہ کشی، نفس کُشی، روحانیت اور کثرت عبادات کی تعلیمات دی جاتی تھی۔ لہٰذا مسلمان بھی مندرجہ بالا طریقوں کو اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ بیٹھے اور اس کے حصول کی خاطر روحانیت کے فروغ، نفس کُشی، مجاہدہ، ریاضت اور کثرت عبادات میں مشغول ہو گئے۔

☆ اہل تصوف کے نظریات نے مسلمانوں کو عدیم الفرصت بنا دیا۔ وہ عبادت کے سخت طریقوں میں منہمک ہو گئے۔ علوم ظاہری سے زیادہ علوم باطنی کی طرف توجہ دینے لگے۔ ان کا زیادہ وقت کثرت اذکار، ریاضت اور عبادت میں گزرنے لگا۔ لہٰذا ان حالات میں مسلمانوں کی توجہ قرآن پر فکر و تدبّر سے ہٹ کر مختلف عبادات کی طرف مرکوز ہو گئی۔

☆ جن لوگوں نے یونانی کنج نشینوں، عیسائی راہبوں اور ہندوستانی جوگیوں کی طرح ترک دنیا کو طریقۂ عبادت سمجھا تھا، اپنی اپنی خانقاہیں الگ الگ بنا لیں اور ان خانقاہوں سے اپنے اپنے خیالات و نظریات اور اصولوں کی تبلیغ کرتے اور روحانیت کے فروغ، ذکر کے مختلف طریقے، عبادتوں میں انہماک، مرشدوں اور اولیا کی تعظیم، مزاروں سے عقیدت کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کی خانقاہوں میں قرآن و حدیث کی تعلیم کا اتنا اہتمام نہیں تھا جتنا کہ وظائف اور اذکار کا۔

☆ ایسا کوئی عقیدہ آنحضرت صلعم، خلفائے راشدین اور صحابہ کے زمانے میں نہیں تھا نہ شریعت میں اس کا کہیں بھی ذکر ہے۔

☆ امام اشعری اور امام غزالی نے۔۔۔۔ حصول علم پر ہی پابندی لگا دی۔ انہوں نے علم دین سے ہٹ کر کسی اور علم کے تحصیل کی بھی ممانعت کر دی۔ وہ طبعیات کے سخت مخالف تھے۔ اگر علم کے معاملے میں امام اشعری اور امام غزالی سدِ راہ نہ ہوتے تو عرب قوم ہزاروں نیوٹن، کیپلر اور گلیلیو پیدا کرتی۔

حالانکہ جولوگ عبادت وبندگی اور ریاضت ومجاہدہ سے مُنھ موڑ کر خواہشات نفس کی تکمیل کے لیے مادی دنیا کے حصول میں زندگی صرف کر رہے ہیں، وہ لوگ خود بھی نہ نیوٹن اور کیپلر ہیں نہ گلیلیو ؛اور نہ ہی وہ حضرات اپنی آل، اولاد میں سے کسی کو نیوٹن ،کیپلر اور گلیلیو بنا سکے۔ وہ حضرات کیا بنائیں؟ خود نیوٹن، کیپلر اور گلیلیو بھی ایسا نہیں کر سکے۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے ورنہ دنیا کا باقی نظام کون سنبھالے؟ ع: ہرکسے را بہر کارے ساختند۔

مذکورہ بالا اقتباسات میں ارباب تصوف کی طرف اکثر باتوں کے غلط انتساب سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم یہاں صرف ۔ نفس کشی، عبادت وبندگی، کثرت اذکار، اورتزکیۂ نفس۔ کے تعلق سے اختصار کے ساتھ یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایسے کسی عقیدہ کا شریعت میں کہیں ذکر ہے یا نہیں؟اور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین،صحابہ وتابعین کے زمانوں میں اس کا وجود تھا یا نہیں؟؟

نفس کشی قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم میں ہے: وماابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء الا مارحم ربی۔ (یوسف: ۵۳) اور میں اپنے نفس کو بے قصور نہیں بتاتا بے شک نفس تو برائی کا حکم دینے والا ہے۔ مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔

دوسرے مقام پر ہے:فامامن طغی وأثر الحیوۃ الدنیا فان الجحیم ھی الماوٰی وامامن خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوی۔فان الجنۃ ھی الماوٰی۔ (النازعات:۳۷۔۴۱)وہ جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو بے شک جہنّم ہی اس کا ٹھکانا ہےاور جو اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی ٹھکانا ہے۔

تفسیر سراج المنیر میں ہے : النفس ای الامارۃ بالسوء،الھوی وھو اتباع الشھوات وزجرھاعنھاوضبطھابالصبر والتوطین علی ایثار الخیر ---قال عبداللہ بن مسعود انتم فی زمان یقود الحق الھوی وسیاتی زمان یقود الھوی الحق فتعوذوا باللہ من ذلک الزمان۔ (ج:۴ص:۴۸۲)

النفس سے مراد نفس امارہ ہے جو انسان کو برائی کے لیے برانگیختہ کرتا ہے۔الھویٰ سے مراد اتباع شہوات ہے۔تو مطلب یہ ہوا کہ جو نفسانی خواہشات کو کچل ڈالتا ہے جنت اسی کا ٹھانا ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا ہے کہ زمانۂ صحابہ،خواہشات نفسانی پر حق کے غلبے کا زمانہ ہے اور آنے والا زمانہ ،حق پر خواہشات نفسانی کے غلبے کا زمانہ ہوگا۔اس لیے اے لوگو!اس زمانے سے اللہ کی پناہ مانگو۔

نفس کُشی تفسیر کی روشنی میں

تفسیر عزیزی میں ہے: مصعب بن عمیر بصحبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم می رسید و بخوف خدا از لذائذ دنیا اجتناب می کرد، وشبہا در تہجد بیدار می بود، وروزہا روزہ میداشت، وطعام چرب نمی خورد تا شہوت زناں غلبہ نہ کند، وآخر بفرمودۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ مال ومتاع ودولت و حشمت را ترک دادہ زخانمان خود جدائی گوارا کردہ، درغربت بمدینہ منورہ ہجرت فرمود، و بتعلیم قرآن مردم مدینہ را مشغول شد، وروز جنگ احد نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم را برداشتہ درکمال ثبات واستقلال ووارفتگی از دنیا رفت وشہید شد۔ تا آں کہ برائے کفن او غیر از لنگی میسر نہ شد، وآں ہم از قد او کوتاہ آمد، اگر پائے او را می پوشیدند سرش وا می شد، واگر سرش را می پوشیدند پا برہنہ می ماند۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمودند کہ بایں لنگی سر او را بپوشید و بر پائے او گیاہے خوشبودار کہ او را اذخر نامند، باندازید۔ ہمچناں کردند۔ (ص: ۳۹و ۳۰)

یہ آیت حضرت مصعب بن عمیر کے بارے میں اتری ہے۔ آپ خدا کے خوف سے دنیاوی لذتوں سے کنارہ کش ہو کر رات تہجد میں گزارتے، اور دن روزہ میں کاٹتے، کھانا کسی روغن سے نہ کھاتے کہ کہیں نکاح کی خواہش نہ پیدا ہو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے تمام مال ومتاع، دولت وحشمت، گھر بار سب کچھ چھوڑ کر غربت کی حالت میں مدینہ منورہ آگئے۔ یہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے۔ جنگ احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم لے کر پورے استقلال وثابت قدمی کے ساتھ رہے اور شہادت پائی۔ کفن کے لیے ان کے پاس صرف ایک لنگی تھی وہ بھی اتنی چھوٹی کہ سر کو چھپانے کی کوشش کی جاتی تو پیر باہر رہ جاتے اور پیر چھپانے کی کوشش کی جاتی تو سر باہر ہو جاتا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اس لنگی سے سر چھپا دیا گیا اور پیر پر اذخر نامی خوشبودار گھاس ڈال دی گئی۔

نفس کشی احادیث کی روشنی میں

بخاری اور مسلم دونوں کے حوالے سے مشکوۃ میں ہے:

مُصْعَبَ بْنَ عُمَيْرٍ، قُتِلَ يَوْمَ أُحُدٍ، فَلَمْ مَالَهُ يَكُنْ فِيهِ إِلَّا نَمِرَةٌ، فَكُنَّا إِذَا غَطَّيْنَا رَأْسَهُ خَرَجَتْ رِجْلَاهُ، وَإِذَا غَطَّيْنَا رِجْلَيْهِ خَرَجَ رَأْسُهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: غَطُّوا بِهَا رَأْسَهُ، وَاجْعَلُوا عَلَى رِجْلَيْهِ مِنَ الْإِذْخِرِ۔ (مشکوۃ، ص: ۵۷۵)

مصعب بن عمیر غزوۂ احد میں شہید ہوئے۔ ان کے پاس صرف ایک لنگی تھی وہ بھی اتنی چھوٹی کہ سر کو چھپانے کی کوشش کی جاتی تو پیر باہر رہ جاتے اور پیر چھپانے کی کوشش کی جاتی تو سر باہر رہ جاتا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر اس لنگی سے سر چھپا دیا گیا اور پیر پر اذخر نامی

خوشبودار گھاس ڈال دی گئی۔

صحیحین میں ہے: عن النعمان بن بشیر رضی اللہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ألاوان فی الجسد مضغۃ، اذ اصلحت صلح الجسد کلہ، واذافسدت فسدالجسد کلہ، الاوھی القلب۔ (بخاری، ج:۱، ص: ۱۳، مسلم، ج:۲، ص:۲۸)

نعمان بن بشیر نے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! سن لو: یقینا جسم میں گوشت کا ایک ایسا ٹکڑا ہے کہ وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو، اور وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جائے۔ آگاہ رہو کہ وہ ٹکڑا دل ہے۔

علامہ ہیثمی کی مجمع الزوائد میں ہے: عن ابی الدرداء قال: قال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الدنیاملعونۃ وملعون مافیھاالاماابتغی بہ وجہ اللہ۔ (ج:۱۰، ص:۲۲۲)

حضرت ابودرداء نے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دنیا ملعون ہے اور دنیا کی ساری چیزیں ملعون ہیں سوائے اس چیز کے جس سے رضائے الٰہی مطلوب ہو۔

ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء میں ہے: عن عبداللہ بن عمرو قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من کنز دنیایزید باقیہ فان الحیاۃ بیداللہ، الاوانی لااکنز دینارا و لا درھما و لااخبأرزقالغد۔ (ج:۳، ص:۱۵۷)

حضرت عبداللہ بن عمرو نے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو بقائے زندگی کے لیے دنیا جوڑ کر رکھے تو جان لے کہ زندگی اللہ کے اختیار میں ہے۔ لوگو! سن لو، میں نہ دینار و درہم جوڑ کے رکھتا ہوں نہ کل کے لیے کھانا اٹھا کر۔

طبرانی معجم کبیر میں ہے: عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: رأی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عندبلال تمرۃ، قال: ماھذا؟ یابلال! قال: شیٔ اذخرت لغد، قال: ام تخش ان یکون لک دخان فی نار جھنم، انفق یابلال! و لاتخش من ذی العرش اقلالا۔ (ج:۱، ص:۳۴۴)

ابوہریرہ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال کے پاس کچھ خرمے جمع دیکھے، تو فرمایا: یہ کیا ہے؟ ابوہریرہ نے عرض کی: میں نے یہ کل کے لیے جمع کر رکھے ہیں۔ حضور نے فرمایا: کیا اس بات سے ڈرتے نہیں کہ وہ تمہارے لیے جہنم کی آگ کا دھواں ہو جائے؟ بلال! اسے خرچ کر ڈالو اور عرش کے مالک سے کمی کا اندیشہ نہ کرو۔

علامہ سیوطی کی جامع صغیر میں ہے: عن عمرو بن امیۃ الضمری رضی اللہ عنہ قال:

جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال: ارسل ناقتی واتوکل؟ قال: قیدوھا وتوکل۔ (ج:۲،ص:۵۱۳)

حضرت عمرو بن ضمری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے حضور کی بارگاہ میں حاضر ہوکر عرض کی: حضور! خدا پر توکل کر کے اپنی اونٹنی یونہی چھوڑ دوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اونٹنی کو باندھ دو اور خدا پر توکل کرو۔

سنن نسائی میں ہے: عن ابی سعید الخدری قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من استعف اعفہ اللہ، ومن استکفی کفاہ اللہ۔ (ج:۱،ص:۲۷۸)

حضرت ابو سعید خدری نے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو پارسائی کا طلب گار ہوگا اللہ تعالیٰ اسے پارسائی عطا فرمائے گا اور جو اللہ کی کفایت کا طلب گار ہوگا اللہ تعالیٰ اسے کفایت فرمائے گا۔

مذکورہ بالا آیات اور تفسیر واحادیث سے دن کے اجالے کی طرح عیاں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کو، نفس امارہ کی خواہشات کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے بنایا ہے؛ تو جنت کو نفس کشی کر کے یادالٰہی میں ڈوبے رہنے والوں کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم امت کی خاطر خود بھی کل کے لیے کچھ بچا نہیں رکھتے تھے اور اپنے بعض صحابہ کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے۔ ہاں! یہ حکم سب کے لیے نہیں ہوتا تھا اور سب کے لیے ہو بھی نہیں سکتا تھا کہ اسلام کو بھی اپنے دفاع وفروغ کے لیے اسباب ووسائل کی ضرورت تھی۔

عبادت وبندگی قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم میں ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ۔ (الذاریات:۵۶)

اور میں نے جن اور آدمی اسی لئے پیدا کیا کہ میری بندگی کریں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا منشا ہی عبادت وبندگی کو قرار دیا ہے۔ جو شخص جس قدر اللہ کی عبادت وبندگی میں لگا رہتا ہے، وہ اسی قدر اپنے رب کے منشائے تخلیق کی تکمیل کرتے ہوئے انسانیت سے متصف ہوتا ہے اور جو جس قدر اللہ کی عبادت وبندگی سے پہلوتہی یا فرار اختیار کرتا ہے، وہ اسی قدر اپنے رب کے منشائے تخلیق کی تکمیل سے گریز کرتے ہوئے انسانیت سے دور ہوتا جاتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد کتنا سچا ہے: أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ (الاعراف:۱۷۹) وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر گمراہ۔ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ (الفرقان:۴۴) وہ تو نہیں مگر جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی بڑھ کر گمراہ۔

قرآن کریم میں ہے: قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا، نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا، أَوْ زِدْ عَلَيْهِ۔

(المزمل: ۴-۲) (اے محبوب!) رات میں قیام فرما سوا کچھ رات کے۔ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس پر کچھ بڑھاؤ۔ اسی سورت میں ہے:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَى مِنْ ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِنَ الَّذِينَ مَعَكَ۔ (المزمل: ۲۰) (اے محبوب!) بے شک تمہارا رب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ والی ایک جماعت کبھی دو تہائی کے قریب، کبھی آدھی اور کبھی تہائی رات قیام کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ، آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُحْسِنِينَ، كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ، وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ۔ (الذریات: ۱۸-۱۵) بے شک پرہیز گار اپنے رب کی عطائیں لیتے ہوئے باغوں اور چشموں میں ہیں۔ بے شک وہ اس سے پہلے نیکوکار تھے۔ وہ رات میں کم سویا کرتے اور رات کے پچھلے حصے میں استغفار کرتے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا۔ (الفرقان: ۶۳، ۶۴) اور رحمٰن کے وہ بندے جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں اور جب جاہل ان سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں: بس سلام! اور وہ جو رات کاٹتے ہیں اپنے ربّ کے لئے سجدے اور قیام میں۔

اس آیت کے تحت تفسیر معالم التنزیل میں ہے: ای لا ینامون باللیل البتۃ بل یقومون للصلوٰۃ والعبادۃ وھو قول الضحاک ومقاتل۔ ضحاک اور مقاتل نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ وہ رات کو سوتے نہیں بلکہ عبادت و نماز میں کھڑے رہتے ہیں۔

کمالین میں ہے: روی ابن ابی شیبہ عن مجاھد لا ینامون اللیل کلہ وعن ابن عباس وانس نحوہ۔ ابن شیبہ نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ پوری رات نہیں سوتے ہیں۔ ابن عباس اور انس سے بھی یہی مروی ہے۔

جلالین شریف میں ہے: ای ینامون فی زمن یسیر من اللیل ویصلون اکثرہ۔ رات کے تھوڑے حصّے میں سوتے ہیں، زیادہ حصہ نماز میں گزارتے ہیں۔

تفسیر روح البیان میں ہے: یعنی یذکرون اکثر اللیل وینامون اقلہ۔ رات کا اکثر حصہ ذکر الٰہی میں گزارتے ہیں۔ سوتے کم ہی حصے میں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنْجِيلِ۔ (الفتح: ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھ والے کافروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم دل، تو انہیں دیکھے گا رکوع کرتے سجدے میں گرتے، اللہ کا فضل و رضا چاہتے۔ ان کی علامت ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے نشان سے، یہ ان کی صفت توریت میں ہے اور ان کی صفت انجیل میں ہے: وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا۔ (الفرقان: ۶۳ تا ۷۳)

اور وہ جو رات کاٹتے ہیں اپنے رب کے لیے سجدے اور قیام میں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ، تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ، فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ، أَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوُونَ۔ (السجدہ: ۱۸-۱۵)

ہماری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں کہ جب انہیں یاد دلائی جاتی ہے سجدہ میں گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بولتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔ ان کی کروٹیں جدا ہوتی ہیں خوابگاہوں سے؛ اور اپنے رب کو پکارتے ہیں ڈرتے اور امید کرتے؛ اور ہمارے دیے ہوئے میں سے کچھ خیرات کرتے ہیں۔ کسی جان کو نہیں معلوم جو آنکھ کی ٹھنڈک ان کے لیے چھپا رکھی ہے۔ صلہ ان کے کاموں کا۔ تو کیا جو ایمان والا ہے وہ اس جیسا ہو جائے گا جو بے حکم ہے؟ یہ برابر نہیں۔

مذکورہ بالا آیات قرآنیہ سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شب بیداری کا حکم دیا ہے۔ اور اس کے وہ بندے جو رات جاگ جاگ کر اس کی عبادت و بندگی کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، تسبیح و تہلیل میں لگے رہتے ہیں اور دعا و مناجات میں سحر کرتے ہیں، ان کے ایمان کی شہادت دی ہے، تعریف و توصیف کی ہے اور خوب سراہا ہے، ساتھ ہی جنت کی بشارت دی ہے۔

عبادت و بندگی احادیث کی روشنی میں

سنن نسائی میں ہے: عن ابی هريرة قال: كان رسول الله صلى الله عليه و سلم يصلى حتى تزلع يعنى تشقق قدماه۔ (باب احیاء اللیل ج ۲، ص: ۲۴۴)

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اتنی دیر کھڑے رہتے کہ دونوں قدم مبارک سوج جاتے۔

صحیح مسلم، ابن ماجہ باب طول القيام فى الليل، مشکوٰۃ المصابیح باب التحريض على قيام الليل ص: ۱۰۸/اور سنن نسائی باب احیاء اللیل حدیث میں ہے: عن مغيرة قال قام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی تورمت قدماہ فقیل لہ: لمَ تصنع ھٰذا وقد غفر لک ماتقدم من ذنبک وماتأخر؟ قال: افلا اکون عبدا شکورا۔ (ج:۲،ص:۲۴۴)

حضرت مغیرہ بن شعبہ کہتے ہیں کہ۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اتنی دیر کھڑے رہے کہ قدمہائے مبارک سوج گئے۔آپ سے عرض کیا گیا کہ جب اللہ تعالی نے آپ کے لئے قد غفر اللہ لک ماتقدم من ذنبک وماتأخر۔ کی بشارت دے دی ہے تو آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیا میں زیادہ شکر گذار بندہ نہ رہوں؟

صحیح البخاری باب قیام النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللیل میں ہے: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیقوم لیصلی حتی ترم قدماہ فیقال لہ فیقول: افلا اکون عبدا شکورا؟ (ج:۱،ص:۱۵۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں اتنی دیر کھڑے رہتے کہ قدمہائے مبارک سوج جاتے۔جب آپ سے عرض کیا جاتا تو فرماتے: کیا میں شکر گذار بندہ نہ رہوں؟

حضرت ابوذر غفاری سے مروی ہے: قال: قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی اصبح بآیۃ والآیۃ "ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم (نسائی،ابن ماجہ اور مشکوٰۃ،ص:۱۰۷) حضو صلی اللہ علیہ وسلم ساری رات نماز میں ایک ہی آیت: اگر تو عذاب دے تو وہ تیرے ہی بندے ہیں اور معاف فرمادے تو بے شک تو غالب وحکمت والا ہے" کی تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔

حضرت عائشہ سے مروی ہے: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا دخل العشر الاواخر من رمضان احیا اللیل وایقظ اھلہ وشد المئزر۔ (صحیح البخاری،صحیح مسلم اور مشکوۃ المصابیح،ص:۱۸۲) جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تو آپ جماع سے دور رہتے،خود بھی شب بیداری کرتے اور گھر والوں سے بھی شب بیداری کراتے۔

حضرت ابی امامۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: علیکم بقیام اللیل فانہ داب الصالحین قبلکم وھو قربۃ الی ربکم ومکفرۃ للسیئات۔ (ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح ص۱۰۹ باب التحریض علی قیام اللیل)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شب بیداری کا التزام کرو کیونکہ یہ تم سے پہلے کے نیکوکاروں کا طریقہ اور گناہوں کے لیے کفارہ ہے۔

اسی کتاب میں باب التحریض علی قیام اللیل میں ہے: عن ابی امامۃ قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول: من أوی الی فراشہ طاھرا وذکر اللہ حتی یدرکہ النعاس لم یتقلب ساعۃ من اللیل یسأل اللہ فیھا خیرا من خیر الدنیا والأخرۃ الا اعطاہ ایاہ۔

(ص:۱۱۰) ابی امامہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: جو پاک صاف ہوکر بستر پر آئے اور نیند کا غلبہ ہونے تک اللہ کا ذکر کرے، ایک پہر بھی بستر سے پیٹھ نہ لگائے تو دنیا و آخرت کے لیے جو دعا بھی کرے گا، اللہ اسے قبول فرمائے گا۔

پھر اسی میں ہے: عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عجب ربنا من رجلین رجل ثار عن وطائہ ولحافہ من بین حبہ واھلہ الی صلاۃ فیقول اللہ لملائکتہ انظروا الی عبدی ثار عن فراشہ ووطائہ من بین حبہ واھلہ الی صلاۃ رغبۃ فیما عندی وشفقا مما عندی۔ (ص:۱۱۰، باب التحریض علی قیام اللیل) حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا رب دو آدمیوں سے بہت خوش ہوتا ہے ایک وہ جو اپنے لحاف و بستر اور گھر والوں سے جدا ہوکر نماز کے لیے جاتا ہے۔ اللہ تعالی اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے: میرے اس بندے کی طرف دیکھو جو جنت کی رغبت اور جہنم کے ڈر سے اپنے لحاف و بستر اور گھر والوں سے جدا ہوکر نماز کے لیے جارہا ہے۔

تاریخ ابن کثیر میں ہے: کان عمر یصلی بالناس العشاء ثم یدخل بیتہ فلا یزال یصلی الی الفجر وما مات حتی سرد الصوم۔ حضرت عمر عشا کی نماز پڑھا کر گھر آتے اور فجر تک نوافل پڑھتے رہتے۔

حافظ ابونعیم نے حلیۃ الاولیا میں حضرت عثمان غنی کے تعلق سے لکھا ہے: فبدأ بام القران فقرأ حتی ختم القرآن فرکع وسجد سورۂ فاتحہ کے بعد پورا قرآن پڑھ کر ہی رکوع اور سجدے کیے۔

مسلم شریف باب فضائل ابن عمر، بخاری شریف کتاب التھجد باب قیام اللیل میں ہے: فقال (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم): نعم الرجل عبداللہ لو کان یصلی من اللیل وکان بعد لاینام من اللیل الاقلیلا۔ (ص۱۵۱) ایک موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کاش! عبداللہ (بن عمر) رات میں نوافل پڑھے تو کتنا اچھا ہو، راوی کا کہنا ہے کہ اس کے بعد عبداللہ (بن عمر) رات کو بہت ہی مختصر وقت کے لیے سویا کرتے۔

حافظ ابونعیم کی حلیۃ الاولیا میں ہے: عن نافع ان ابن عمر کان یحی اللیل صلوۃ ثم یقول: یانافع اسحرنا؟ فیقول: لا، فیعاود الصلوۃ فیقول: یانافع اسحرنا؟ فاقول: نعم۔ فیقعد ویستغفر اللہ ویدعو الی الصبح۔ نافع نے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمر نماز پڑھتے ہوئے رات گزارتے۔ مجھ سے کہتے: نافع! بھور ہوگئی؟ اگر میں کہتا کہ ابھی نہیں تو پھر نماز پڑھنے لگ جاتے۔ پھر کہتے: نافع! بھور ہوگئی؟ میں کہتا: ہاں! تو بیٹھ جاتے استغفار کرتے اور صبح تک دعا کرتے رہتے۔

اسی میں ہے: ان ابن عمر کان اذا فاتتہ صلوۃ العشاء فی جماعۃ احی بقیۃ لیلتہ

اگر عبداللہ بن عمر سے عشا کی جماعت فوت ہو جاتی تو بقیہ رات عبادت میں گزار دیتے

صحابی رسول حضرت تمیم بن اوس کے حالات میں ابو سعید سمعانی، کتاب الانساب میں لکھتے ہیں: کان تمیم یختم القرآن فی رکعۃ وربما ردد الآیۃ الواحدۃ اللیل کلہ حتی الصباح وکان من عباد الصحابۃ وزھادھم ممن جانب اسباب العز ولزم التخلی بالعبادۃ الی ان مات۔ حضرت تمیم ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پڑھتے، بسا اوقات رات بھر صبح تک ایک ہی آیت کی تکرار کرتے رہتے۔ آپ کا شمار عُبّاد و زُہّاد صحابہ میں تھا۔ آپ ظاہری اسباب عزت سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشیں رہتے۔ وصال اسی حالت میں فرمایا۔

ایک دوسرے صحابی حضرت شداد بن اوس کے حالات میں ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں لکھا ہے: انہ کان اذا دخل الفراش ینقلب علی الفراش لا یأخذہ النوم فیقول: اللّٰھم ان النار اذھب عنی النوم فیقوم فیصلی حتی الصباح۔ آپ جب بستر پر جاتے تو کروٹ بدلتے رہتے، نیند نہ آتی، دعا کرتے: الٰہی! جہنم کے خوف نے مجھ سے نیند چھین لی ہے۔ پھر کھڑے ہو جاتے اور صبح تک نماز پڑھتے رہتے۔

سمعانی نے کتاب الانساب میں اور ابن حجر مکی نے فتح المبین میں صحابی رسول حضرت تمیم بن اوس کے حالات میں لکھا ہے: کان تمیم یختم القرآن فی رکعۃ۔ حضرت تمیم بن اوس ایک ہی رکعت میں قرآن ختم کر لیتے۔

ابو عیسیٰ ترمذی نے جامع ابواب القراۃ میں لکھا ہے: حضرت سعید بن جبیر کعبہ میں دو رکعت میں پورا قرآن ختم کرتے اور حضرت عثمان بن عفان ایک ہی رکعت میں۔

حضرت سعید بن مسیب کے حالات میں ہے: آپ نے پچاس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔

حضرت اویس قرنی کے حالات میں ہے: جب شام ہوتی تو فرماتے: آج رات رکوع کی رات ہے، پس جب رکوع میں جاتے تو صبح تک رکوع ہی میں رہتے۔ کبھی فرماتے آج رات سجدے کی رات ہے، اور جب سجدہ میں جاتے تو صبح تک سجدے ہی میں رہتے۔

حضرت ثابت بن اسلم تابعی جنہوں نے عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر سے روایت کی ہے اور چالیس سال تک حضرت انس کی خدمت میں رہے ہیں، ان کے حالات میں ہے: پچاس سال تک پوری پوری رات عبادت کرتے رہے۔ جب صبح ہوتی تو دعا کرتے: الٰہی! اگر تو نے کسی کو قبر میں نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی ہے تو مجھے بھی عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمالی چنانچہ، انتقال کے بعد دفن کے وقت ہی یہ مشاہدے میں آ گیا۔

علامہ عبدالوہاب شعرانی نے تنبیہ المغترین میں لکھا ہے: امام ابوحنیفہ نے چالیس سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ علامہ ابن حجر مکی شافعی نے اپنی کتاب قلائد میں لکھا ہے: عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ چار بزرگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کیا ہے؛ حضرت عثمان بن عفان، حضرت تمیم داری، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بستان المحدثین میں تاریخ بغداد کے مصنف حضرت خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے: ہر روز ختم قرآن می کرد وہفتم ذی الحجہ ۴۶۳ھ وفات یافت۔ روزانہ قرآن کریم ختم کرتے۔ ۷ر ذی الحجہ ۴۶۳ھ کو انتقال ہوا۔ امام غزالی کی احیاء العلوم میں ہے کہ: امام شافعی رمضان میں خاص نماز کے اندر ساٹھ ختم قرآن کرتے اور ان کے شاگرد بویطی ہر دن ایک ختم کرتے۔

تطبیق وتوفیق

حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے: علیکم ماتطیقون من الاعمال فان اللہ لایملَ حتی تملّوا۔ صحیح البخاری، ج:۱،ص:۱۵۴) تم جتنے اعمال کر سکتے ہو اتنے ہی کرو کیوں کہ اللہ تو ثواب عطا فرمانے سے تھکتا نہیں، تم ہی عمل کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔

سنن ابوداؤد میں ہے: عن عائشۃ قالت: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اکلفوا من العمل ماتطیقون فان اللہ لایملَ حتی تملّوا فان احب الاعمال الی اللہ ادومہ و ان قلّ وکان اذا عمل عملا اثبتہ۔ (ج:۱،ص:۱۹۵)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جتنے اعمال کر سکتے ہو اتنے ہی کرو کیونکہ اللہ تو ثواب عطا فرمانے سے تھکتا نہیں، تم ہی عمل کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ اللہ کے نزدیک وہ عمل پسندیدہ ہے جس میں مداومت ہو۔ آپ جب کوئی عمل کرتے تو اسے ہمیشہ ہی کرتے۔

صحیح البخاری میں ہے: عن عائشۃ قالت ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لَیدع العمل وھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ ان یعمل بہ الناس فیفرض علیھم۔ (ج:۱،ص: ۱۵۲) حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی عمل کو پسند فرماتے مگر اس اندیشے سے نہیں کرتے تھے کہ کہیں امت پر فرض نہ ہو جائے۔

اسی لیے امام نووی نے شرح مسلم میں لکھا ہے: اس سلسلے میں سلف کی عادت مختلف رہی ہے، کچھ حضرات مہینہ بھر میں ختم کرتے، کچھ حضرات بیس دنوں میں اور کچھ حضرات دس ہی دنوں میں۔ زیادہ تر حضرات سات دنوں میں ختم کرتے۔ بہت سے حضرات تین ہی دنوں میں اور بہت سے حضرات روزانہ۔ بہت سے حضرات ہر رات اور بہت سے حضرات تو تین ختم ہر دن کر لیتے؛ اور بعض

حضرات ہر دن آٹھ ختم کرتے۔ اس سلسلے میں قول مختار یہ ہے کہ جتنا ممکن ہو اتنے ہی کی عادت کرے اور جو عادت کرے اسے تلذذ و نشاط کے ساتھ زندگی بھر نبھائے۔ (ج:۱،ص:۳۶۶)

کثرت اذکار قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم میں ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔ (البقرہ: ۱۵۲) تم لوگ میرا ذکر کرو میں تم لوگوں کا چرچا کروں گا۔

قرآن کریم میں ہے: اَلَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِهِمْ۔ (ال عمران: ۱۹۱) جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹوں پر لیٹے۔

قرآن کریم میں ہے: فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلٰى جُنُوبِكُمْ (نسا: ۱۰۳) پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو اللہ کا ذکر کرو، کھڑے اور بیٹھے اور کروٹوں پر لیٹے۔

قرآن کریم میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (الانفال: ۴۵) اے ایمان والو! جب کسی فوج سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کا ذکر بہت کرو کہ تم مراد کو پہنچو۔

قرآن کریم میں ہے: الا الذين ءامنوا وعملوا الصلحات وذكروا الله كثيرا۔ (الشعراء: ۲۲۷) مگر وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور کثرت سے اللہ کا ذکر کیا۔

قرآن کریم میں ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا۔ (الاحزاب: ۲۱) بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہو اور اللہ کا ذکر خوب کرے۔

قرآن کریم میں ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْرًا كَثِيرًا، وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا (الاحزاب: ۴۱-۴۲) اے ایمان والو اللہ کا ذکر بہت کرو اور صبح و شام اس کی پاکی بولو۔

قرآن کریم میں ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا۔ (المزمل: ۸) اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو۔

قرآن کریم میں ہے: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى۔ (الاعلیٰ: ۱) اپنے رب کے نام کی تسبیح پڑھو جو سب سے بلند ہے۔

قرآن کریم میں ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى۔ (الاعلیٰ: ۱۶) بے شک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا اور اپنے رب کے نام کا ذکر کیا پھر نماز ادا کی۔

کثرت اذکار احادیث کی روشنی میں

بخاری شریف میں ہے: عن ابی موسیٰ قال: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: مثل

الذی یذکر ربه والذی لایذکر مثل الحی والمیت۔ (ج:۲،ص:۹۴۸)

حضرت ابوموسیٰ نے روایت کی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ذکر الٰہی کرنے والا زندہ کی طرح اور نہ کرنے والا مردہ کی طرح ہے۔

اسی میں ہے: عن ابی ھریرة قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: ان لله ملائکة یطوفون فی الطرق یلتمسون اھل الذکر فاذا وجدوا قوما یذکرون الله تنادوا ھلموا الیٰ حاجتکم فیحفونھم باجنحتھم الی سماء الدنیا قال فیسألھم ربھم۔ و ھو اعلم منھم۔ مایقول عبادی؟ قال یقول یسبحونک ویکبرونک ویحمدونک و یمجدونک قال: فیقول: ھل رأونی؟ قال: فیقولون: لاوالله مارأوک۔ قال: فیقول: کیف لو رأونی؟ قال: یقولون: لورأوک کانوا اشدلک عبادة واشدلک تمجیدا و اکثرلک تسبیحا قال: یقول: فمایسئلون؟ قالوا: یسئلونک الجنة۔ قال: یقول: وھل رأوھا؟ قال: یقولون: لا والله یارب مارأوھا۔ قال: یقول: فکیف لوانھم رأوھا؟ قال: یقولون: لوانھم رأوھا کانوا اشد علیھا حرصا واشد لھا طلبا واعظم فیھا رغبة۔ قال: فبمایتعوذون؟ قال: یقولون من النار قال: یقول: وھل رأوھا؟ قال: یقولون: لاوالله یارب مارأوھا۔ قال: یقول: فکیف لو رأوھا؟ قال :فیقولون: لورأوھا کانوا اشد منھا فرارا و اشد لھا مخافة۔ قال: فیقول: فانی اشھدکم قد غفرت لھم ۔قال: یقول ملک من الملائکة: فیھم فلان لیس منھم انما جاء لحاجة قال: ھم الجلساء لایشقی جلیسھم۔

حضرت ابوہریرہ نے روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک اللہ کے کچھ ایسے فرشتے ہیں جو راہوں میں چلتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو ڈھونڈتے ہیں۔ جب کسی قوم کو اللہ کا ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو پکارتے ہیں: آجاؤ! مطلوب یہاں ہے۔ سب فرشتے ان کو آسمان دنیا تک ڈھک لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے دریافت فرماتا ہے کہ اس کے بندے کیا کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ فرشتوں سے بہتر جانتا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں: خدایا! یہ بندے تیری تسبیح وتکبیر اور حمد و ثنا کرتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے: کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: نہیں، تیری قسم! انہوں نے تجھے نہیں دیکھا ہے۔ رب فرماتا ہے: اگر مجھے دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: الٰہی! اگر تجھے دیکھ لیں تو تیری عبادت اور تسبیح وتمجید اور زیادہ کریں۔ رب فرماتا ہے وہ مجھ سے کیا مانگ رہے ہیں؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ تجھ سے جنت کے طلب گار ہیں۔ رب فرماتا ہے: کیا انہوں نے جنت دیکھی ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: نہیں، خدایا! تیری قسم، انہوں نے جنت نہیں دیکھی ہے۔ رب فرماتا ہے: اگر وہ جنت دیکھ لیں تو ان کا حال کیا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اگر وہ

جنت دیکھ لیں تو ان کا حرص بڑھ جائے، رغبت زیادہ ہو اور پہلے سے بڑھ کر طلب کریں۔ پھر رب فرماتا ہے: وہ لوگ کس چیز سے پناہ مانگ رہے ہیں؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ لوگ جہنم سے پناہ مانگ رہے ہیں۔ رب فرماتا ہے: کیا انہوں نے جہنم دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: نہیں۔ خداوندا! تیری قسم، انہوں نے جہنم نہیں دیکھا ہے۔ رب فرماتا ہے: اگر وہ جہنم دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: جہنم دیکھ لیں تو ان کا خوف اور بڑھ جائے اور پہلے کے بہ نسبت اس سے زیادہ دور بھاگیں۔ رب فرماتا ہے: میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ ان لوگوں کو بخش دیا۔ اس پر ایک فرشتہ عرض کرتا ہے: ان میں فلاں شخص تیری تسبیح و تکبیر اور حمد و ثنا نہیں کرتا تھا، وہ تو اپنی ضرورت سے ان لوگوں کے پاس آیا تھا۔ رب فرماتا ہے: وہ ان لوگوں کا ہم نشیں تو تھا، میں ان کے ہم نشیں کو بھی محروم نہیں رکھتا۔

سنن ابن ماجہ میں ہے: عن ابی الدرداء: ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الا انبئکم بخیر اعمالکم وارضاھا عند ملیککم وارفعھا فی درجاتکم وخیر لکم من اعطاء الذھب والورق ومن ان تلقوا عدوکم فتضربوا اعناقھم و یضربوا اعناقکم۔ قالوا: وماذاک؟ یارسول اللہ! قال: ذکر اللہ۔ (ص: ۲۶۸) حضرت ابو درداء نے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! کیا میں تمہیں ایسا عمل نہ بتادوں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر، رب کے نزدیک سب میں پسندیدہ، تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا، سونا چاندی خیرات کرنے اور جہاد سے بھی زیادہ ثواب کا استحقاق رکھنے والا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کون سا عمل ایسا ہے؟ حضور نے فرمایا: وہ عمل ذکر الٰہی ہے۔

اسی میں ہے: قال (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ماجلس قوم مجلسا یذکرون اللہ فیہ الا حفتھم الملائکۃ وغشیتھم الرحمۃ وتنزلت علیھم السکینۃ و ذکرھم اللہ فیمن عندہ۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کوئی قوم کسی مجلس میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتی ہے تو فرشتے اسے ڈھاپ لیتے ہیں اور رحمت الٰہی اس پر چھا جاتی ہے۔ ان پر سکینہ نازل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ملائکۂ مقربین میں ان کا تذکرہ فرماتا ہے۔

تزکیۂ نفس قرآن کی روشنی میں

قرآن کریم میں ہے: رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡ عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ وَیُزَکِّیۡهِمۡ۔ (البقرہ: ۱۲۹) اے ہمارے رب! اور بھیج ان میں ایک رسول انہیں میں سے کہ ان پر تیری آیتیں تلاوت فرمائے اور پختہ علم سکھائے اور ان کا تزکیہ کردے۔

قرآن کریم میں ہے: کَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡکُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡکُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡکُمۡ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیۡکُمۡ (البقرہ: ۱۵۱) جیسے ہم نے تم میں بھیجا ایک رسول تم میں سے کہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت فرماتا ہے

اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے: لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِینَ إِذْ بَعَثَ فِیھِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِھِمْ یَتْلُو عَلَیْھِمْ آیَاتِہٖ وَیُزَکِّیھِمْ۔ (آل عمران: ۱۶۴) بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے

ان آیات قرآنیہ سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے امت مسلمہ کے تزکیہ کی خاطر رسول کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے لیے دعا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے دعائے ابراہیم کو شرف قبولیت سے نوازتے ہوئے تزکیہ فرمانے والے خاتمی مرتبت پیغمبر، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسانوں میں مبعوث فرما کر مؤمنین پر سب سے بڑا احسان کیا اور اسے صاف جتایا کہ: ''بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔''

کیا اب بھی کسی تصوف دشمن کے لیے یہ کہنے کی کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ نفس کشی، عبادت و بندگی، کثرت اذکار، اور تزکیۂ نفس کے تعلق سے کسی عقیدے کا شریعت میں کہیں ذکر نہیں ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابہ و تابعین کے زمانوں میں اس کا وجود نہیں تھا؟

○○○

حقیقت تصوف: موافق و مخالف نظریات کا تجزیہ

کائنات الٰہی کا سارا نظام اعتدال و توازن اور تمام اجزا کے باہمی تعاون پر استوار ہے۔ دین اسلام بھی ان ہی تین ترکیبی عناصر سے عبارت ہے۔ دوسرے مذاہب و ادیان میں بھی اعتدال و توازن پر زور دیا جاتا ہے۔ اسلامی دین و شریعت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس کے تمام اجزا وارکان ایک جامع کل بنانے میں لگے رہتے ہیں۔ دوسروں نے زندگی کے تمام آفاق و جہات کے درمیان تال میل اور ہم آہنگی کھو دی اور اسے مختلف خانوں میں بانٹ دیا۔ دین و شریعت اسلامی نے حیات بشری کے تمام میدانوں میں نہ صرف توافق و تعامل پیدا کیا بلکہ ایک کلی مجموعہ بنایا، اسی کے ساتھ انسانی زندگی کو پوری کائنات سے جوڑ دیا اور تمام مخلوقات سے اس کے باہمی رشتے قائم کر دیے۔ اس ارتباط و اشتراک کا نقطۂ اتحاد ذات الٰہی سے انسان کا لازمی رشتہ بنا کہ وہی تو خالق و مالک کل ہے۔ انسان، کائنات اور رب واحد کے سہ گانہ ارتباط و تعلق کو سمجھنے کے دو عام فہم راستے اور طریقے ہیں: دین و شریعت کا فرمان ہے کہ اللہ واحد واحد نے اپنے ''کلمۂ کن'' سے ساری کائنات تخلیق کی اور جب جیسی ضرورت محسوس کی ہر ایک چیز کی تخلیق وہ اسی امر و فرمان سے فرماتا رہا اور تاابد فرماتا رہے گا، کہ وہ خالق کل ہے۔ اسی کو اس نے اپنی ''شان'' عالی بتایا جو ازلی بھی ہے۔ اس طرح خالق و مالک کی ذات کے سوا مخلوقات کا وجود ہوا۔ چوں کہ وہ حکیم و دانا اور اسرار کائنات و بشر کا مالک ہے لہٰذا اس نے اپنی مخلوقات میں اعتدال و توازن و تعاون قائم کیا۔ طریقت و تصوف میں ذات احد سے مرتبہ واحدیت میں کائنات یا ماسویٰ اللہ کی تخلیق کا یہی فلسفہ و فکر ہے، کہ ذات الٰہی نے اپنی صفات عالیہ کے اظہار و اثبات کے لیے تمام مخلوقات پیدا کی جو خالق کی ذات سے بالکل الگ ہے۔ دوسرے طریقے میں کائنات اور بشر کی کثرت سے اوپر عروج کریں تو نقطہ آخر ذات الٰہی پر تمام ہوگا، جو توحید الٰہی ہے۔ تصوف میں وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود وغیرہ کے نظریات بنیادی طور سے فلسفیانہ ہیں اور ان کا راست تعلق دین و شریعت یا تصوف سے نہیں

ہے۔ اسی لیے تصوف کے علمی حصہ کو بنیادی فکر و نظام کا درجہ دیا گیا ہے اور مابعد الطبیعاتی افکار و نظریات کو خواص تک محدود رکھا گیا ہے۔

تخلیق الٰہی میں ارادہ و اختیار کا عنصر صرف بشر و جن میں رکھا گیا اور بقیہ تخلیقات اس سے عاری ہیں۔ اس کی حکمت و فطرت صرف یہ حقیقت ہے کہ مخلوقات الٰہی میں ان صاحبان اختیار کو مکلف و سزاوار جزا بنایا گیا۔ انسانی نفس میں فجور و تقویٰ دونوں کے عناصر رکھ دیے گئے اور ان دونوں کی کارگزاری و کارستانی سے بھی آگاہ کر دیا گیا۔ پھر ساتھ ہی ساتھ نفس کے کرتوتوں پر قابو پانے اور اس کو پاک و صاف کرنے کے اچوک علاج سے بھی آگاہی بخشی گئی اور صرف انسانی باطن اور خانۂ دل کے اندرون کے تقویٰ و طہارت پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ انسانی فطرت جھگڑالو ہے، مسلسل صاحبان تزکیہ و تطہیر کو رسولوں اور پیغمبروں کی صورتوں میں پیدا کیا گیا تا کہ وہ ان کی تعلیم و تزکیہ کرتے رہیں۔ سید المرسلین اور خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ اور آخری زندہ جاوید کتاب قرآن مجید کی ذات و تعلیمات میں ان کو محفوظ کر دیا گیا۔ انسانی طہارت و تزکیہ اور پوری کائنات میں توازن و توافق کا نسخۂ کیمیا صرف اسوۂ نبوی اور دین و شریعت ہی میں ہے۔

فطرت انسانی کی یہ بوالعجبی لگتی ہے کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے عنصر کی وجہ سے جادۂ اعتدال سے انحراف کرتا ہے۔ وہ اصلاً اس کی جلد باز فطرت یا 'عاجلانہ تخلیق' کا ایک اظہار ہے اور وہ دونوں اطراف ۔افراط و تفریط۔ میں لے جاتا ہے۔ اس کی ملکوتی خاصیت اس کو عالم ملکوت کی طرف اور اوپر سے اوپر اٹھاتی ہے جب کہ بہیمی قوت عالم ناسوت کے گڑھوں میں گراتی ہے۔ خاص فطرت انسانی کی عجلت و تیز رفتاری ان دونوں اطراف میں بھی افراط و تفریط پیدا کر کے اعتدال سے دور کر دیتی ہے۔ اعتدال سے انحراف ۔سرمو انحراف۔ ہی انسان کو توازن سے بیگانہ بناتا ہے اور توازن کا فقدان اجزائے پراگندہ کو اور پراگندہ کر کے اسے جامع کل سے دور سے دور کرتا چلا جاتا ہے اور وہ خیر و شر دونوں میں کنارے یا طرف پر جا لگتا ہے۔ اسی عاجلانہ فطرت انسانی کو قابو کرنے اور اسے جادہ اعتدال پر گامزن کر کے توازن حیات و کار پیدا کرنے اور تعاون باہمی کے ذریعے تمام اجزائے زیست اور کائنات عمل و علم کو ایک جامع کل سے جوڑے رکھنے کے لیے شریعت و دین سے وابستگی ضروری قرار دی اور یہ وابستگی صرف اسوۂ نبوی ﷺ سے کامل وابستگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

الٰہی تعلیمات اور قرآنی ہدایات صرف نظری معاملات بن کر رہ جاتے اگر اسوۂ محمدی ان کو راہ عمل نہ بتا دیتا۔ رسول اکرم ﷺ نے اپنے ذاتی اسوہ و عمل اور تبلیغی و ارشادی رہنمائی دونوں کے ذریعے فطرت انسانی کو اعتدال و توازن اور توافق و تعاون کلی کا ایک مجموعۂ خیر بنایا۔ اس میں خیر ہی خیر ہے اور انسانی فطرت و مزاج کی رعایت بھی۔ حضرت محمد ﷺ کا اولین اور ابتدائی کار

منصبی یہ رہا کہ لوگوں کو غیر اللہ کی عبادت سے نکال کر توحید الٰہی کی طرف لاتے۔اس سے کچھ کم مشکل بلکہ زیادہ صبر آزما کار نبوی یہ تھا کہ مسلم کو مومن بناتے، ان کی تعلیم و تربیت کرتے، ان کو حکمت سکھاتے اور ان کا تزکیہ فرماتے۔اس صبر آزما کار منصبی میں اعتدال و توازن اور توافق کے عناصر کار فرما تھے۔دین و دنیا کی اجتماعیت اور ان دونوں کی باہمی شراکت و معاونت ہی سے دین و شریعت اور انسانی زندگی میں اعتدال و توازن اور توافق و تعاون آتا ہے اور انسانی فرد کے تزکیہ سے انسانی معاشرے میں انقلاب آتا ہے اور اسی سے پوری کائنات میں پھیلتا ہے۔رسول اکرم ﷺ آخری پیغمبر اور سید الانبیاء کی جامع ترین حیثیت میں اسی کے عظیم ترین پیکر تھے۔اسی لیے سیاست و معاشرت، اقتصاد و معاش، تمدن و تہذیب اور دین و شریعت کا ایک کامل مجموعۂ خیر بنایا۔ ظاہر انسان کو باطن انسان سے مربوط و پاک بنایا کہ وہ بہر حال جسم و روح کا مرکب ہے اور دونوں کی تطہیر ضروری ہے۔اسلامی دین و شریعت میں ظاہری اعمال و ارکان کی لازمی تاثیر باطنی کیفیات وواردات پر ہر لحاظ سے پڑتی ہے اور باطن و اندرون کے اخلاص و کیفیات وواردات سے ظاہری اعمال و ارکان کی درستی ہوتی ہے۔یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔اہل طریقت نے بھی بلا استثنا تسلیم کیا ہے کہ شریعت اسلامی محمدی کی کامل اور مخلصانہ پیروی کے بغیر تزکیہ ناممکن ہے۔دین و شریعت کے جلیل القدر علما و مفکرین نے صاحبان طریقت کے اسلامی طرق تزکیہ و تطہیر کو بھی صحیح مانا اور قبول کیا ہے، مگر فطرت انسانی کی عجلت پسندی اور اس کے نتیجے میں افراط و تفریط کی روش نے شریعت و دین میں بھی اپنے جلوے دکھائے اور طریقت و تصوف میں بھی ان کی کارستانیاں نظر آئیں۔حد یہ ہے کہ خالص دین کی پیروی میں بھی شدت پسندی داخل ہوگئی اور حیات نبوی میں بھی اس کے مظاہر سامنے آئے تو آپ ﷺ نے ان کی روک تھام کی اور صحیح جادۂ اعتدال واضح کیا۔

تصوف کے موافق و مخالف طبقات

تصوف و طریقت میں بھی اعتدال و توازن کا مزاج بگڑا تو ان کے حامی اور مخالف نظریات وجود میں آئے۔ان موافق و مخالف افکار و نظریات کے حاملین کرام نے کتاب و سنت کا نام تو لیا مگر وہ خود افراط و تفریط کے کنارے لگ گئے۔تصوف حامی اور طریقت موافق افراد و طبقات نے اسے شریعت و دین کا حریف بنا دیا یا اس کا متبادل قرار دیا۔ان کی حمایت بے جا اور حمیت جاہلی کی لے اتنی بڑھی کہ ان کے تشدد آمیز اور غلو کے شوقین نے شریعت کو دین کا صرف چھلکا (قشر) قرار دیا اور طریقت کو اس کا اصل مغز (مخ/لب) بتایا، ان دونوں کو بالترتیب جسم و روح بھی قرار دیا۔مخالفین و ناقدین تصوف نے اپنے تجزیاتی مطالعے میں جو قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کرنے کا دعویٰ کیا اسے سراسر غیر اسلامی بتایا۔وہ اسے دین اسلام میں ایک عجمی دخل

اندازی اور شریعت و دین کو بگاڑنے والا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے والا سمجھتے ہیں۔ان دونوں مبالغہ آمیز اور افراط و تفریط کے مارے فریقین کے پاس ان کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور ان کے اصل سرچشمے بھی مگر ان کے ہاں افراط و تفریط بھی ہے، اعتدال و توازن سے انحراف بھی اور ان سے خطرناک نقد فاحش کا ظالمانہ عنصر بھی۔ ناقدین تصوف میں سے بعض نے بہر حال یہ تسلیم بھی کیا ہے کہ ''ان دونوں کے علاوہ علما کا ایک طبقہ ایسا ہے جس نے بین بین کا راستہ اختیار کیا ہے، یہ طبقہ غیر اسلامی تصوف کا منکر اور اسلامی تصوف کا قائل ہے۔'' مگر اسی کے ساتھ وہ یہ نقد و فیصلہ ناطق کر کے کہ ''تاہم علمی لحاظ سے یہ تقسیم بجائے خود نا قابل قبول ہے'' تمام معتدل فکر کو مسترد کر دیا۔ اسی لہجے میں وہ تصوف کے حال ہونے اور قال نہ ہونے پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں اور تصوف کی تلاش و عرفان حقیقت کا تمام تر مدار ذوق و حال اور خواب و خیال پر بتاتے ہیں۔اسی طرح ناقدین اور منکرین دونوں طبقات و نظریات نے اپنی عمارت نقد تعمیر کی ہے۔ دوسری طرف حامی تصوف و طریقت بھی اپنے ناقدین و مخالفین کی مانند اپنے تمام نظریات و مباحث کے لیے قرآن وسنت کو معیار و میزان بناتے ہیں، بوالعجبی ہی کہی جاسکتی ہے یا ستم ظریفی کہ دونوں مخالف و موافق طبقات کتاب وسنت اور اسوۂ نبوی اور تعامل صحابۂ کرام اور افکار و تعلیمات سلف سے اپنے اپنے حق میں دلائل لاتے ہیں اور ایک ہی چیز سے اپنے کو حق پر اور دوسرے کو باطل پر بتاتے ہیں۔ان دونوں متضاد نظریات و تحریکات کا ایک اصولی موازنہ حقیقت تصوف سامنے لاتا ہے۔

مقصد تصوف و طریقت

تصوف کی تعریف پر ایک ہزار سے زیادہ اقوال ہیں اور ان میں ہر کسی میں ایک پہلو کو زیادہ اہم قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح مقصد تصوف و طریقت پر صوفیۂ کرام کے بہت سے اقوال ہیں لیکن عربی مقولے کے مطابق ان کی عبارتیں مختلف ہیں حقیقت ایک ہے۔ اصل مقصد تصوف و طریقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے خالص تعلق قائم کر کے اپنی روح و اندرون کا تزکیہ کیا جائے جس سے عرفان حقیقت ملے اور یہ عرفان حقیقت کلی طور سے دین و شریعت کے تابع ہو اور تعلق مع اللہ کے ذریعے تزکیۂ روح و ذہن، ایمان و اسلام کی قیود میں ہو،صوفیۂ کرام، علما و محدثین اور تصوف و طریقت کے حامی اور ناقد سب اس حدیث جبریل کو بنیاد بناتے ہیں جو احسان کی جامع ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت عالی میں حاضر ہو کر تین بنیادی سوالات کیے اور حقیقت آگاہ ﷺ نے ان کے جوابات دیے، پہلا سوال تھا کہ ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ اللہ واحد اور رسالت محمدی اور تمام عقائد اسلام کو دل سے مانو۔ حضرت جبریل علیہ السلام اور رسول اکرم ﷺ کے سوال و جواب کا ایک اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ

السلام نے آپ کی تصدیق کی۔ اسلام کیا ہے؟ کے جواب میں آپ ﷺ نے ارکان اربعہ، نماز قائم کرنے، صدقہ زکوٰۃ دینے، روزۂ رمضان رکھنے اور حج کرنے کا ذکر فرمایا۔ آخری سوال 'احسان' کیا ہے؟ کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اور یہ نہ کر سکو تو یہ تصور کرو کہ وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے اس کے بعد قیامت اور اس کی علامات کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔ ان کے جانے کے بعد رسول اکرم ﷺ نے صحابۂ کرام سے فرمایا تھا کہ یہ جبریل تھے جو تم کو تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔ آخری تجزیۂ نبوی بہت اہم ہے اور اس میں تین بنیادی سوالوں کے جوابات نبوی شامل ہیں کہ ایمان و اسلام اور احسان کے کل مجموعے کا نام دین ہے۔ محققین صوفیہ نے اسی لیے بار بار دین و شریعت کی کامل و مخلصانہ تابعداری کو ہی حقیقت تصوف بتایا ہے، یعنی دین و شریعت کی مومنانہ و اسلامی و احسانی پیروی سے ہی تعلق مع اللہ قائم ہوتا ہے اور اسی سے تزکیہ و تطہیر ہوتی ہے۔ علما و محدثین اور نام تصوف اور اسم طریقت سے احتراز کرنے والے مفکرین و محققین نے اسی لیے احسان کو ترجیح دی ہے؛ کیوں کہ تصوف اور طریقت بعد کے الفاظ و اصطلاحات ہیں اور ان سے بوئے غیریت آتی ہے جب کہ احسان قرآنی و نبوی اصطلاح و نام ہے، اور وہ نہ صرف ٹکسالی جامع تعبیر اسلامی ہے بلکہ زبان نبوی اور لسان الٰہی کی عطا کردہ بھی ہے اور جامع شریعت و طریقت بھی۔

حامی و موافق طریقت افراد نے یہ افراط و تفریط کی ہے کہ صرف تیسرے جز احسان پر ضرورت سے زیادہ زور دیا اور اس کا رشتہ ایمان و اسلام سے کاٹ دیا، اور اس سے زیادہ یہ ستم کیا کہ عبادت کا مفہوم بہت ہی محدود کر دیا، عبادت رب کا مطلب دوسرے علما و فضلا نے بھی صرف نماز و روزہ اور ذکر و فکر جیسے اعمال و اشغال میں محصور کر دیا۔ ناقدین اور ان میں سے مخالفین طریقت کی ستم ظریفی کچھ کم نہیں کہ وہ اس قرآنی وحدیثی احسان کا ذکر نہیں کرتے یا صحیح اہمیت نہیں دیتے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات کریمہ میں لفظ احسان کو عقیدہ و عمل کے بنیادی نکتہ یا صفت کی صورت میں لایا گیا ہے: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ۔ (سورۂ نحل: ۹۰) یعنی اللہ تعالیٰ عدل کے ساتھ احسان کا حکم دیتا ہے جو عدل سے بلند تر درجہ کی چیز ہے۔ جیسے پیروی صحابہ اور اتباع رسول ﷺ کو احسان کے ساتھ مشروط کیا گیا اور اس پر رضائے الٰہی کا شاندار وعدہ کیا گیا۔ والدین کے ساتھ سلوک، بیوی کے ساتھ رفاقت وجدائی اور دوسرے اعمال و افعال دنیا و دین کی جان و روح رواں احسان کو بنایا اور اسی طرح محسن اور محسنین کو عام ایمان والوں اور اسلام والوں سے بلند تر مقام اور زندہ تر کیفیت کا حامل بتایا گیا۔ محسنین کا رشتہ رسول اکرم ﷺ سے راست اور بلند تر جوڑا گیا کہ آپ ﷺ سید المرسلین تھے جو بلند ترین عبادت و اعمال کرتے تھے۔ ان تمام قرآنی آیات کریمہ اور ان کی شارح

احادیث سنن نبوی میں ایک جہان معانی آباد ہے، اور اس کا نکتہ یہ ہے کہ صرف فرائض کی بجا آوری کافی نہیں، محسنین کو نوافل و سنن اور مستحبات پر بھی عمل کرنا لازمی ہے اور صرف نماز و روزہ میں نہیں بلکہ ان تمام معاملات اور امور میں بلند تر چیز کو اختیار کرنا ہے جن کو تصوف میں احوال کہا جاتا ہے، اور جن سے مقامات بلند ان کے احوال کے مطابق ملتے ہیں۔ عام اسلامی اور دینی زبان و اصطلاح میں ان کو فضائل اخلاق کہا جاتا ہے جیسے غیظ و غضب پر قابو پانا، لوگوں کو معاف کرنا، ان سے عفو و درگزر کرنا اور ایسے بہت سے فضائل جن کا مجموعہ تقویٰ ہے اور تقوی نام ہے تعلق مع اللہ اور خشیت الٰہی کا۔ قرآنی اور نبوی احسان اور محسنین کی تشریح و تعبیر محدثین و علما کے ساتھ جامع شریعت و طریقت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی کی ہے۔ طبقۂ محسن / محسنین کا بلند ترین بشری مقام رسالت ہے اور رسولان عظام کو محسنین میں شمار کیا گیا ہے اور اسے خاص عطیۂ الٰہی بتایا گیا ہے۔ صاحبان تقویٰ و صبر، مجاہدین راہ الٰہی، اور اعلاء کلمہ کرنے والوں کو دوسرے محسنین کے مقام پر رکھا گیا اور وہ اپنے احسان کے عنصر کے مطابق درجۂ احسان پر فائز تھے۔ صحابۂ کرام اور خلفاے اسلام ان محسنین کے سرخیل تھے کہ ان کو رضائے الٰہی کا مقام و مرتبہ حاصل و ثابت ہے۔

اصل احسان قرآنی و حدیثی میں کتر بیونت اور اس کے جامع معنی و مقصود کے اجزاء میں افراط و تفریط نے ہی ستم ڈھایا، ''عبادت'' کے معنی و مفہوم کو محدود کیا اور پوری انسانی زندگی کو محیط فکر اسلامی کو چند احوال و اشغال اور افکار میں محصور کر دیا۔ اسی سے دین و دنیا کا فرق پیدا کیا گیا حالاں کہ رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام اور ان کے سرچشمۂ ہدایت قرآن و حدیث نے ان کو سمیٹ لیا تھا۔

تصوف و طریقت میں تو یہ تفریق ہوئی تو ہوئی حاملین شریعت بھی اس کتر بیونت میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے، خواہ اسباب کچھ ہوں ناقدین و مخالفین تصوف بھی کتاب و سنت کا نام اور سہارا لینے کے باوجود ظاہری مراسم کو اصل سمجھنے لگے اور باطنی کیفیت احسان سے غافل ہو گئے۔ بلاشبہ ان کے ہاتھ بھی صرف مراسم ہی لگے اور وہ دین و شریعت کے مغز و روح سے عاری رہ گئے۔ ان دونوں متضاد و متصادم نظریات کا تجزیہ چند اہم ترین موضوعات کے حوالے سے چشم کشا ہوگا اور عبرت انگیز بھی۔

علم ظاہر و باطن

اہل تصوف میں محققین علما و مجتہدین بالخصوص شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا فیصلہ ناطق ہے کہ سلوک الی اللہ کے دو طریقے ہیں: ایک شریعت کے علم کے ذریعہ جو حتمی و قطعی ہے کہ وہ وحی الٰہی سے اور زبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتا ہے۔ دوسرا صوفیۂ کرام کے روحانی تجربات اور باطنی علوم کے ذریعے جو ظنی ہے اور سلوک و طریقت کے مدارج طے کرا دیتا ہے۔ اسے دوسرے

اکابر صوفیہ کی مانند وہ علم لدنی یا علم باطن کا نام دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو خاص تعلق مع اللہ کے لیے دیتے ہیں۔ دونوں موافق و مخالف نظریات و افکار کے حاملین کرام علم ظاہر کے بارے میں تفریط کا رویہ اختیار کرتے ہیں اور جادۂ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں۔ ناقدین و مخالفین کا طریق تحقیق و نقد اور بھی قابل غور و فکر ہے کہ وہ علم ظاہر کو طریقت و تصوف کا ایک سرچشمہ بالعموم نہیں گردانتے حالاں کہ وہ جب تصوف و طریقت کے اسلامی مآخذ و منابع کا پتہ بخوشی یا بدل نخواستہ چلاتے ہیں تو قرآن و سنت کا حوالہ دیتے ہیں۔ صوفیۂ کرام اور موافق و حامی طبقات و اہل علم بھی ظاہر کا ذکر خیر ذرا کم ہی کرتے ہیں اور اسی وقت کرتے ہیں جب ان کے سلوک پر عجمیت یا غیر اسلامی عناصر کا ہجوم مخالفین کی طرف سے آتا ہے۔ دوسرے وہ دین و شریعت اور تصوف و طریقت دونوں کے علوم و مآخذ اور تعلیمات و عطیات کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور رسول اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام کے مخصوص افراد سے اس کا سراغ لگاتے ہیں۔

دین و شریعت کے دونوں توام منابع ۔قرآن و حدیث۔ کے سلسلۂ استناد نے قطعی اور پختہ مآخذ دیے بالخصوص حدیث و سنت کے اسنادی سلسلے نے اہل طریقت کو بھی اپنے خاص علم ظاہری و باطنی کے لیے اسناد کا اور اس سے زیادہ استناد کا سلسلہ ثابت کرنے پر برانگیختہ کیا اور تمام سلاسل نے اپنے اپنے شجرۂ نسب تیار کیے۔ اس میں اصل مسئلہ رسول اکرم ﷺ کے سلسلۂ طریقت کو دین و شریعت کی مانند جوڑنے کا ہے کہ اس کے بغیر وہ مستند نہیں بنتا۔ لہذا رسول اللہ ﷺ سے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور بعض دوسرے صحابہ کرام کے طریقت و طہارت کے علوم حاصل کرنے کی سند لی اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے علوم طریقت و تصوف کے حصول کا نظریہ وجود میں آیا۔ بعض اور بھی سلسلے ہیں۔ اس پورے سلسلۂ اسناد و استناد پر مخالفین طریقت نے تاریخی اور دینی دونوں لحاظ سے خاص تنقیدیں کیں جو بہت وزنی ہیں۔ بالخصوص محدثین کرام کے اس قطعی فیصلہ کے بعد کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضرت حسن بصری کی ملاقات و لقا اور حصول علم ثابت نہیں، محققین طریقت نے محدثین کے اس فیصلے کو تسلیم کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جیسے بزرگوں نے تاویل و توجیہ کی کہ اجماع صوفیہ کے سبب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے استفادہ کو مانا جا سکتا ہے۔ دوسروں نے معاصرت کی وجہ سے اور سند کی وجہ سے بھی لقا ثابت کی۔ بہر حال علوم ظاہری۔ کتاب و سنت۔ کے ماخذ و سرچشمۂ طریقت ہونے کے لیے اس اسناد کی ایسی ضرورت زیادہ نہیں ہے کیوں کہ قرآن و حدیث اور تعامل صحابہ و اکابر میں ان کی بنیادی تعلیمات کا پختہ ثبوت موجود ہے اور ان سے انکار کسی طرح ممکن نہیں۔

اصل مسئلہ علم باطن کا ہے۔صوفیہ کرام اوران کے محققین کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کو بطور عنایت الٰہی ایک خاص علم باطن، القا والہام اور کشف کے ذرائع سے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اوران بندگان خاص کے درمیان اور کوئی واسطہ نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن مجید اور حدیث وسنت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ رب العلمین اور بندگان الٰہی کے درمیان ہے۔ اسی طرح اہل طریقت وتصوف میں یہ نظریہ یا فکر بھی ارتقا پذیر ہوا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خاص علم باطن حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عطا کیا تھا، اوروہ دوسروں کو نہیں دیا تھا، یا دوسرے سلاسل کے مطابق بعض اور مخصوص صحابہ کو عطا فرمایا تھا، اس خاص علم باطن نے طریقت کی بنیاد رکھی۔ یہ نظریہ اول راست علم باطن کے نظریے سے زیادہ خطرناک نظر آتا ہے کہ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ وارشاد عام کو محدود کیا جاتا ہے۔ ناقدین ومخالفین تصوف کا اس پر سخت نقد بلکہ ردملتا ہے اور وہ خاصا وزنی ووقیع ہی نہیں، صحیح اور اسلامی بھی ہے۔

علم لدنی یا علم باطن کے بلا واسطۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور براہ راست اللہ تعالیٰ کا عطیہ قرار دینے کے لیے صوفیۂ کرام اوراہل طریقت کے اکابر نے قرآن مجید میں خضر وموسیٰ علیہما السلام کے واقعے اور اول الذکر کے خاص علم لدنی سے استناد کیا ہے۔اور دوسرے انبیاے کرام جیسے حضرت یوسف وموسیٰ، ابراہیم علیہم السلام وغیرہ اور دوسرے اکابر خاص کر حضرات صحابہ کرام کے الہامات سے استدلال واستشہاد کیا ہے، امام طریقت ابوطالب مکی، امام غزالی، شیخ اکبر، امام قشیری غرضیکہ سب نے ان کو قید تحریر میں محفوظ بھی کیا ہے۔ انبیاے کرام یا حضرت خضر صاحب موسیٰ علیہ السلام اور اکابر صحابہ کے الہام والقا یا علم لدنی میں قطعیت کا عنصر ہے، جو صوفیہ کے علم لدنی میں نہیں ہے۔ محققین صوفیہ اور صاحبان طریقت نے یہ تسلیم کیا ہے کہ صوفیہ اور رب کریم کے درمیان اس الہام و القا وکشف میں خطا کا عنصر ہوسکتا ہے یا صوفیۂ کرام کو اسے سمجھنے میں غلطی اور خطا کرنے کا امکان ہے جب کہ بعض بلکہ بیشتر صوفیہ ان تمام غیبی عطایا کو بے خطا قرار دیتے ہیں۔ بہرحال اس طویل و پیچیدہ مسئلہ اور مفصل ومدلل بیان وتشریح میں یہ نقد علما ومخالفین صحیح ہے کہ وہ بہرحال ظنی علم ہے جسے قطعی قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی جیسے محققین نے اس میں خطا کا امکان بہرحال مانا ہے جب کہ حضرت شاہ نے نہیں مانا۔ اسی سے جڑا ہوا مسئلہ یہ ہے کہ تمام الہامات وکشوف اولیا واہل طریقت مختلف ہوتے ہیں اور وہ ان کے ذاتی تجربات روحانی ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک صوفی کا الہام دوسرے کے الہام جیسا ہو۔ وہ مخالف ومتصادم بھی ہوسکتا ہے اور الہامات وکشوف میں اس طرح بہت کثرت اور بے انتہا تنوع آسکتا ہے اور فی الحقیقت آجاتا ہے۔ اسی طرح صاحب الہام والقا وکشف

کے لیے اس کا اپنا الہام وکشف واجب الاتباع ہے یا نہیں، محققین کے اس باب میں بھی دو طبقے ہیں
کہ صاحب کشف والہام کے لیے وہ واجب ہے، دوسروں کے لیے نہیں۔ دوسرا طبقہ ان کو صاحب الق
وکشف کے لیے بھی واجب قرار نہیں دیتا کیوں کہ وہ ان کے خیال میں قطعی نہیں ہے۔

باطنی علم کی یہ عمارت طریقت قابل غور ونقد ہے، اگر لائق رد نہیں۔ بلاشبہ صحیح القا والہام او
کشف ذرائع علم ہیں مگر ان کی بنیاد پر حتمی علم اور یقین کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان کی بنیاد پ
طریقت وتصوف کو کلی طور سے استوار کیا جاسکتا ہے۔ تصوف وطریقت کو بہر حال علوم ظاہری۔ قرآن
حدیث اور سنت وتعامل پر مبنی کرنا ضروری ہے جیسا کہ عام طریقۂ استناد ہے مگر ان علوم ظاہری کے
باطنی معانی کا معاملہ بھی خاصا پیچیدہ ہے۔ قرآن وحدیث وسنت وعمل نبوی کے ظاہری معانی کے
ساتھ اگر یہ باطنی معانی ہم آہنگ ہوں تو قابل قبول ہو سکتے ہیں لیکن وہ ظاہری الفاظ وعبارات کے
متبادر اور واضح معانی کے خلاف چلے جائیں یا متصادم ہوں تو قابل رد ہیں جیسے کہ ناقدین تفسیر قرآن
باطنی کے بارے میں علما اور مفسرین کا قطعی فیصلہ ہے۔ یہی تاویل حدیث وتعامل صحابہ کا معاملہ ہے۔

علم باطنی کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا اور اس کی ہدایت کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی
تقسیم اور ان سے متعلق متعدد معاملات وامور طریقت کے بارے میں بزرگ صوفیۂ کرام کے
ملفوظات اور تحریروں میں بہت سی روایات کو بطور صحیح احادیث بیان کیا گیا ہے، ناقدین ومخالفین کی
ان پر نقد بہت تیکھا ہے اور ان کا رد بھی قطعی ہے اور حق یہ ہے کہ بزرگوں کے تمام ادب واحترام کے
باوجود یہ تمام روایات حدیثی اصطلاح میں منکرات اور موضوعات ہیں اور اس باب میں ناقدین
مخالفین کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ موافق وحامی افراد وطبقات نہ صرف ان غیر مستند اور موضوع روایات کو
مانتے ہیں بلکہ ان کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ ان کی ان تاویلات
تشریحات وتوجیہات سے حمیت جاہلی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اس سے زیادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
پاک صحابۂ کرام اور عظیم اکابر پر سخت حرف آتا ہے جو کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

مقصد طریقت وتصوف

طریقت وتصوف کا مقصود یہ ہے کہ قلوب وروح کا تزکیہ وتطہیر کر کے اس کے ذریعے سے
بندگان الٰہی کو ان کے مالک وخالق اور رب وپروردگار سے وابستہ کر دیا جائے۔ اس طرح کہ غیر
اللہ ان کے دل ودماغ سے نکل جائے۔ اکابر صوفیہ اس کی تشریح وتعبیر میں بعض دوسری تشریحات
بھی کی ہیں جیسے حقائق کی معرفت اور خلائق سے کنارہ کشی کرنا، بشری نقائص سے پاک ہونا، نفس
کشی کرنا، یہاں تک کہ انسانی خصائل کا بالکلیہ خاتمہ کر دینا۔ ان کے ذریعے سے ہی وہ روحانی
زندگی کی برکات، روحانی تقویٰ وطہارت، باطنی ارتقا اور لقا ووصال الٰہی، جو اصل مقصد وہدف

ہے، پاسکتے ہیں۔اس مقصد اعلیٰ کے حصول کے لیے صوفیۂ کرام نے ''احوال'' کا ایک سلسلۂ زریں پیش کیا ہے۔ان سب کا ذکر وحوالہ کسی نہ کسی طرح قرآن وحدیث اور تعامل سنت وصحابہ میں ملتا ہے اور ان سے انکار کسی طرح کوئی بھی نہیں کرسکتا کہ وہ اقدار عالیہ مطلقہ ہیں، جیسے عبادت و زہد، مجاہدہ ومراقبہ، توکل وصبر وشکر، ذکر وفکر، فقر وغنائے نفس وغیرہ ان سب کا ذکر آیات قرآنی، احادیث نبوی، سیرت رسول وصحابہ کرام اور تعامل اکابر وسلف میں ملتا ہے، اور ظاہری طور سے وہ بلاشبہ فضائل اخلاق میں آتے ہیں، لیکن ان کی تشریح وتعبیر میں افراط وتفریط بھی ملتی ہے اور موافقین ومخالفین کا تصادم بھی درآتا ہے۔

ناقدین تصوف اور مخالفین طریقت کا اصولی موقف ہے اور بجا طور سے صحیح ہے کہ اہل طریقت ان میں اعتدال سے دور ہیں۔اور وہ دین وشریعت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصحابۂ کرام اور خلفاے اسلام واکابرامت کے متوازن ومعتدل راستے سے منحرف ہیں۔ان کے نقد واستدراک اور تبصرہ وتنقید کا ایک مختصر اندازہ ان روحانی ارتقاوطہارت کے ذرائع علاحدہ علاحدہ ذکر سے کیا جاسکتا ہے۔

عبادت ومجاہدہ

عبادت الٰہی میں سخت ریاضت ومجاہدہ کا جو وسیع وعریض اور جامع الجہات نظام طریقت میں ملتا ہے خلاف سنت اور خلاف فطرت ہے۔اس اصولی نقد کے بعد مخالفین کا یہ بیان ہے کہ رات دن عبادت کرنا، نوافل میں پوری پوری راتیں بسر کردینا، دن میں بکثرت یا مدام روزے رکھنا اور اس طرح کے دوسرے مجاہدات کرنا در مطلوب کو حاصل کرنے کا نسخہ شریعت ودین سے متصادم ہے۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض ایسے سخت ریاضات کے عادی صحابۂ کرام وصحابیات طاہرات کو دینی تشدد اختیار کرنے سے روکا تھا۔اپنی مثال بے مثال دی تھی کہ میں اللہ تعالیٰ سے سب سے ڈرنے والا ہوں مگر میں عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، کھاتا ہوں اور افطار کرتا ہوں اور روزے بھی رکھتا ہوں، اور بیویوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہوں اور اپنے بچوں اور خاندان والوں کے ساتھ زندگی گزارتا ہوں۔حضرت ابوالدرداء اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے واقعے نے عبادت وتقرب الٰہی کا خاص معتدل ومتوازن نظام شریعت پیش کیا تھا یا حضرت ام الدرداء رضی اللہ عنہا کی حالت خستہ اور اس کی تعبیر حسین پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے شوہر گرامی کو تمام حقوق ادا کرنے کا حکم دیا تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو اور اسی کے ساتھ اپنے بدن کا حق بھی ادا کرو اور اپنی بیوی بچوں کے حقوق ادا کرو کہ وہ سب اپنی جگہ واجب ہیں۔اہل طریقت میں غیر معتدل اور متشدد فکر والے اس توازن واعتدال شریعت کو کھودیتے ہیں اور عبادت الٰہی اور اس میں مجاہدے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ بدن وجسم کی جائز خواہشات کی تکمیل، جس میں کھانے پینے اور سونے آرام کرنے،

تفریح کرنے اور شادی بیاہ کے تمام مطالبات ومعاملات شامل ہیں، وہ سب کے سب نفسانی چیزیں ہیں جو روحانی ارتقا اور تعلق مع اللہ کی راہ میں رکاوٹیں ہیں، عبادت ومجاہدے کی دوسری اقسام میں بھی اسی طرح کا غلو اور تشدد پایا جاتا ہے جس پر مخالفین کا نقد ورد بالکل صحیح ہے۔ دوسری طرف ان حاملین شریعت اور ناقدین طریقت کا عبادت الٰہی اور مجاہدۂ روحانی میں درجۂ احسان پر فائز محسنین اور سید المحسنین کے نوافل وسنن اور دوسری عبادات سے پہلوتہی اور سہل انگاری قابل گرفت ہے، صرف فرائض وواجبات کی ادائیگی کی کفایت کا نظریہ خاصا خطرناک ہے۔

ذکر الٰہی اور فکر ومراقبہ

عبادت الٰہی کی ایک عظیم ترین صورت ذکر ہے۔ قرآن مجید میں نماز وغیرہ جیسی عبادات کو ذکر الٰہی کے لیے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ افضل ترین ذکر الٰہی نماز (صلوٰۃ) کے علاوہ نماز وصلوٰۃ کے بعد تسبیح وحمد الٰہی پر مبنی خالص ذکر لسانی بھی عبادت کی ایک شکل اور دین وشریعت کی ایک تشخیص ہے۔ دوسرے اوقات میں بھی ذکر الٰہی کا ایک پورا سلسلہ قرآن وسنت میں بیان کیا گیا ہے، شب وروز کے تمام احوال ومعاملات میں ذکر الٰہی کا خاص نظام ان کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے جو یوم ولیلہ کا نصاب رکھتی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بندۂ مسلم کسی وقت بھی یاد الٰہی سے غافل نہ رہے اور اپنی زبان ذکر سے تر اور روح یاد الٰہی سے پر رکھے۔

ذکر الٰہی، جسے ذکر وفکر کے دہرے نام سے اصطلاح تصوف میں یاد کیا جاتا ہے، تمام سلاسل میں ایک پورا نظام رکھتا ہے۔ اس میں ذکر لسانی اور ذکر قلبی دونوں شامل ہیں اور ان کی خاص تفصیلات وتشریحات اور تعبیرات بھی جابجا ملتی ہیں۔ متشدد وغیر متوازن صوفیہ نے اس میں بھی افراط وتفریط کی راہ اختیار کی اور مخالفین کی تنقید کو دعوت ہی نہیں دی دین وشریعت کو بھی للکارا، ذکر الٰہی کی کثرت اور ہمہ وقت اس میں مشغولیت اور اس کے ساتھ اس کی نوعیت پر بھی افکار صوفیہ قابل گرفت ہیں۔ مثلاً قرآن مجید کی تلاوت کو ذکر واذکار کے دوسرے درجے میں رکھنے یا راہ سلوک میں قدم رکھنے کے وقت اس سے کلی احتراز کرنے کا خیال جیسا کہ امام غزالی کے ایک شیخ کا مشورہ تھا، قطعی قابل گرفت بلکہ قابل رد ہے، ایسے ہی دوسرے اقوال صوفیہ بھی ہیں۔

دوسرے افکار ونظریات صوفیہ میں فقر وزہد کا مقام اسی طرح افراط وتفریط وغلو کا شکار ہے اور غنا سے کلی احتراز سکھاتا ہے۔ بعض اکابر صوفیہ تک نے تصوف وطریقت کو خالص فقر وزہد سے تعبیر کیا ہے۔ فقر وزہد کا یہی مبالغہ آمیز تصور صوفیہ، افضل مقام اور بہترین وسیلۂ سلوک سمجھا جاتا ہے اور قرآن وحدیث سے اس کو غیر صحیح طریقہ سے مستند کیا جاتا ہے۔ فقر وزہد کی فضیلت کی بہت سی احادیث، جو متداول ومعروف بنیادیں ہیں، وہ سرے سے احادیث ہی نہیں، منکر وموضوع

روایات ہیں اور شریعت و دین کے دوسرے مسلمہ اصول و نظریات اور تعلیمات سے متصادم ہیں۔ توکل کا بھی سلسلہ، ترک اسباب تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ان تمام معاملات و وسائط تصوف میں بے حد و حساب غلو اور افراط ہے اور اسی وجہ سے ناقدین و مخالفین اس پر نقد کرتے ہیں۔ بلاشبہ اس افراط و غلو نے اہل طریقت و تصوف کو ترک دنیا پر آمادہ کر دیا اور اسے افضل مقام دیا جس سے شاہ جیسے محققین کو بھی اختلاف ہے۔

مقام فنا و بقا

مقامات کی بحث صوفیہ بلاشبہ قرآن و حدیث میں اپنی بنیادیں رکھتی ہے اور ان کو تمام علما و محدثین نے تسلیم کیا ہے۔ مقامات صدیق، شہید، صالح وغیرہ کا ذکر قرآن مجید کی آیات کریمہ میں ہے۔ اور احادیث نبویہ میں بھی۔ ان کے علاوہ متعدد مقامات کو بیان کرتی ہیں جیسے محدث، ملہم وغیرہ، ان تمام مقامات کے حصول کے ذرائع اور طریقے بھی ہیں لیکن ان کا عطا کرنا خالص امر الٰہی ہے۔ اکابر صوفیہ کو بھی تسلیم ہے کہ مقامات طلب صوفیہ و سالکین سے نہیں ملتے بلکہ خالص عنایات الٰہی سے خاص بندگان کو عطا ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں حضرت مجدد الف ثانی اور ان جیسے متعدد اکابر صوفیہ کا یہ اصرار کہ طریقت صرف مقام فنا و بقا کا حصول ہے خاصا قابل بحث ہے۔ بلند سالکین اور مشائخ کے لیے تو مقام فنا و بقا حقیقت تصوف بن سکتا ہے مگر عام سالکوں کے لیے مشکل ہے۔ پھر وہ غیر منطقی بھی ہے۔ صوفی افکار میں مقامات کا ایک سلسلہ ہے جو عبدیت سے شروع ہوتا ہے اور فنا و بقا اور جمع الجمع اور تفرقہ بعد الجمع کے مقامات سے ہوتا ہوا پھر عبدیت پر منتہی ہوتا ہے۔ جو صوفیہ اس چکر کو کامیابی سے پورا کر لیتے ہیں وہ اصل طریقت کے حامل ہوتے ہیں۔ مگر متعدد اکابر ان میں سے کسی ایک مقام پر کھو گئے اور خام کار رہے جیسے شیخ منصور حلاج اولین مقام پر ہی رہ گئے۔ ناقدین تصوف و طریقت نے اس پورے سلسلے پر سخت نقد کیا ہے کہ یہ مقامات کا نظریہ یا مقصد خالص ذوقی چیز ہے اور صوفیہ میں سے متعدد اکابر کے روحانی تجربات نے ان کو مختلف مقامات کی جو سیر کرائی ہے وہ ان کا شخصی تجربہ ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں۔ پھر ان کے کشف اور روحانی تجربے کے بے خطا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں اور سب سے زیادہ یہ کہ خاصے مہلک قسم کے نتائج سے صاحب مقام و کشف کو دو چار کرتا ہے اور پوری امت میں باعث انتشار بھی اکثر و بیشتر ثابت ہوتا ہے۔

دراصل شخصی روحانی تجربات اور وجدانی اکتشافات اور باطنی اکتسابات کے معاملے میں ایک اصول بہت کارگر ہے۔ ان کے وقوع سے اور ان کے صحیح ہونے سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تصوف و طریقت کے تمام معاملات میں اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ دین و شریعت کے حوالے سے ان امور طریقت کے بارے میں تین ضابطے ملتے ہیں: اول وہ تمام روحانی تجربات اور باطنی اکتسابات بلکہ ان

تک لے جانے والے تمام ذرائع و وسائل اگر قرآن و حدیث کے مطابق اور سنت نبوی اور تعامل صحابہ سے ہم آہنگ ہیں تو قابل قبول ہیں۔ دوم: تمام امور طریقت جو کتاب و سنت اور اسلام کے مسلمہ اصول اور وسیع ترین نظام کے مخالف ہیں یا ان سے متصادم تو قابل رد ہیں۔ سوم سارے وجدانی و ذوقی معاملات طریقت نہ تو دین و شریعت کے منافی ہیں نہ متصادم تو ان کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حرف تجزیہ

طریقت و تصوف کے موافقین و مخالفین کے اختلاف فکر و نظر کا سلسلہ غالباً اول روز ارتقا سے چلا آ رہا ہے۔ دونوں طبقات میں غالی، معتدل اور متوازن فکر کے حاملین پائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اپنے دلائل و براہین ہر معاملے میں رکھتے ہیں۔ اکابر علما و محدثین اور قرآن و سنت کے ماہرین نے بھی تصوف و طریقت کی افادیت ایک حد تک تسلیم کی ہے اور عظیم صوفیہ کے افکار و تعلیمات اور عطایا کا احسان مانا ہے۔ وہ ان کو امامان ہدایت اور رہنمایان ملت اور محسنین جماعت قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا غالی ناقدین یا طریقت کے یکسر مخالفین کا یہ طریقہ کہ تصوف غیر اسلامی ہے کبھی بھی علما و امامان دین میں مقبول نہیں رہا، اسی طرح انھوں نے غالی اور متشدد صوفیہ کے غلو آمیز افکار و تعلیمات سے بھی اتفاق نہیں کیا اور ان کے سبب ان پر نقد کیا بھی۔ تصوف و طریقت کو ایک طرح اسلام و دین شریعت کا متبادل نظام بنانے والے افراد و طبقات نے سب سے زیادہ فساد برپا کیا۔ اکابر صوفیہ ہی نے نہیں عام سمجھ دار سالکین و اہل طریقت نے دین و شریعت کی پابندی کو لازمی سمجھا اور طریقت کو شریعت و دین کا ایک حصہ۔ اصل بات یہ ہے کہ تصوف و طریقت بعض دوسرے علوم و تجربات اسلامی کی طرح بعد کا ارتقا ہے اور ان کی طرح وہ دین و شریعت کا ایک جزو۔ اسی کو اسلامی تصوف اور اسلامی طریقت کہا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے تصوف کے چار رنگوں کے نظریے میں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں دین کی تعلیمات اور شریعت کے احکام کی بجا آوری سے تمام باطنی و روحانی ارتقا اور تزکیہ حاصل کرنے کا بڑا نادر و نایاب اور صحیح ترین اصول پیش کیا ہے۔ اس سے طریقت مخالف علما و مفکرین کا یہ نقد بھی ختم ہو جاتا ہے کہ اگر دین و شریعت کی مخلصانہ پابندی سے روحانی ارتقا اور باطنی تزکیہ نہیں ہو سکتا اور تقرب الی اللہ نہیں مل سکتا تو پھر کس چیز سے مل سکتا ہے۔ ان کا یہ نقد بھی صحیح ہے جسے حضرت شاہ جیسے عبقری صوفیہ نے تسلیم بھی کیا ہے کہ اولین دو صدیوں میں تصوف و طریقت کا مروجہ نظام نہیں تھا صرف شریعت و دین ہی ان کی بنیاد و اساس تھی۔ دوسری صدی اسلامی کے اواخر سے جو نظام طریقت ارتقا پذیر ہوا وہ کتاب و سنت کی اساس پر ہوا اور اس میں جو غیر اسلامی چیزیں شامل ہو گئیں ان کو حضرت جنید بغدادی نے اور ان کے ہمنواؤں نے کانٹ چھانٹ کر دور کیا۔ بعد کے سلاسل تصوف اور ان کے اکابر صوفیہ نے

طریقت کو دین وشریعت کے تابع ہی رکھا اور تصوف کے حال وقال دونوں میں اصلاح کی۔ان کی بعض آراسے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا بھی ہے مگر تزکیۂ قلب وتعلق مع اللہ کا جو نظام اپنے وجدانی اور ذوقی تجربات پر استوار کیا اس کو یکسر مسترد کر دینا سخت ناانصافی ہے۔بے شمار افراد و طبقات کو اسلام اور دین وشریعت سے وابستہ کرنے میں ان کا کارنامہ قابل فخر وتقلید ہے۔عمل وعلم دونوں کے میدانوں میں ان کی عطایا اسلامی میراث میں شاندار اور بابرکت مقام رکھتی ہیں۔

کتابیات

ابن عربی
۱۔الفتوحات المکیہ، دارالکتب العربیہ، مصر ۱۳۲۹ھ
۲۔فصوص الحکم، مرتبہ ابوالعلاء عفیفی، قاہرہ، ۱۳۶۵ھ

ابن قیم الجوزیہ
۱۔عدۃ الصابرین وذخیرۃ الشاکرین، مکہ مکرمہ، غیر مورخہ
۲۔مدارج السالکین، مطبعۃ المنار، بیروت، غیر مورخہ

ابوطالب مکی
قوت القلوب مطبعۃ یمنیۃ، مصر، ۱۳۰۱ھ

ابونصر بن علی السراج
کتاب اللمع، تحقیق عبدالعلیم، مطبعۃ السعادۃ، قاہر، ۱۳۸۰

ابونعیم اصبہانی
حلیۃ الاولیاء، دارالکتاب العربیۃ، بیروت، ۱۴۰۰ھ

سہل بن عبداللہ تستری
تفسیر القرآن العظیم، دارالکتاب العربیۃ، مصر ۱۳۲۹ھ

عبدالقادر جیلانی
۱۔غنیۃ الطالبین، دارالکتاب العربیۃ، مصر ۱۳۳۱ھ
۲۔الفتح الربانی، دارالکتاب العربیۃ، مصر ۱۳۰۲ھ

عبدالکریم جیلی
الانسان الکامل، مطبعۃ الازہریۃ، مصر، ۱۳۱۶ھ

حارث محاسبی
رسالۃ المسترشدین، تحقیق عبدالفتاح غدہ، بیروت، ۱۹۷۱ء

شہاب الدین سہروردی
عوارف المعارف برحاشیہ احیاء علوم الدین، مصر، ۱۹۳۹ء

شاہ ولی اللہ دہلوی
۱۔التفہیمات الالٰہیہ، اکادیمیہ شاہ ولی اللہ دہلوی حیدرآباد سندھ
۲۔حجۃ اللہ البالغہ مرتبہ سعید احمد پالن پوری، دیوبند ۲۰۰۱ء
۳۔القول الجمیل اردو ترجمہ، تصوف فاؤنڈیشن لاہور

غزالی، امام ابوحامد
۱۔احیاء علوم الدین اور دیگر کتب امام

قشیری ابوالقاسم
الرسائل القشیریہ معہ اردو ترجمہ محمد حسن کراچی پاکستان، ۱۹۶۴ء

الکلاباذی ابوبکر محمد
التعرف لمذہب اہل التصوف، داراحیاء الکتب العربیہ قاہرہ

مختلف مؤلفین
کتب تصوف جیسے مطالعۂ تصوف از غلام قادر لون دہلی وغیرہ

○○○

اہل تصوف کا مجاہدانہ کردار

نوآبادیاتی نظام کے خلاف شمالی افریقہ کے خصوصی تناظر میں

تصوف پر بے علمی کا الزام ایک قدیم متجدد الزام ہے۔ بعض وجوہ سے اس الزام کو ایسی شہرت ملی ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ حضرات بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ بلکہ کچھ علمی و ثقافتی حلقوں میں تو اسے حقیقت نفس الامری ہی مان لیا گیا ہے۔ اس الزام کے پس پشت فکری و نظریاتی اختلاف بھی کارفرما ہے اور منحرف تصوف بھی بڑی حد تک اس کا ذمہ دار ہے۔ آج دنیا بھر میں ایسی بے شمار نام نہاد خانقاہیں ہیں جو عموماً ڈاکٹر اقبال کے اس مشہور شعر کا مصداق ہیں۔

میراث میں ہاتھ آئی انہیں مسند و دستار
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

لیکن عقابوں کے بعض نشیمن اگر زاغوں کے تصرف میں آجائیں تو اس سے ان دونوں کی ماہیتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ زاغ عقاب ہو جائیں گے اور نہ عقاب زاغ۔ لہٰذا زاغ کے احکام کو عقاب پر جاری کرنے کی کوشش نہیں ہونی چاہئے اور ایسی کوئی بھی کوشش نہ علم و دانش کے مطابق ہے اور نہ فکر اقبال سے ہم آہنگ ہے۔ بلکہ اگر شاعر مشرق کے اس شعر میں غور کیا جائے تو دونوں کا فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔

حقیقی تصوف حرکت و عمل اور جہاد و مجاہدہ سے عبارت ہے۔ دعوت و تبلیغ کے میدان میں صوفیۂ کرام کی مساعی سے ان کے حرکت و نشاط کا ثبوت ملتا ہے، جسے آرنلڈ کی کتاب The Preaching of Islam اور اس جیسی بہت سی دوسری کتابوں میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔(۱)

تصوف محبت کا پیامبر، امن و شانتی کا داعی اور بقائے باہم کا نقیب ہے کیونکہ یہی اسلام کا حقیقی پیام اور اصلی دعوت ہے۔ صوفیہ کرام کی جد و جہد عموماً پرامن ہی رہی ہے۔ لیکن امن کی بساط

بچھانے کے لیے، محبت کے پیغام کو عالم گیر کرنے کے لیے، اور طاغوتی قوتوں کو سرنگوں کرنے کے لیے اگر ضرورت پیش آئی تو صوفیہ نے مسلح جدو جہد سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ صوفیہ کے یہاں جہاد کی روایت مجاہدہ کی روایت کے ساتھ ساتھ ہی چلی آ رہی ہے اور یہ مزدوج روایت اس قدر منظم اور مسلسل ہے کہ اپنے اور بیگانے کسی کی نظر سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ پروفیسر گب (A.R. Gibb) لکھتے ہیں:

تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ اسلام کے کلچر کا شدت سے مقابلہ کیا گیا لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیہ کا انداز فکر فوراً اس کی مدد کو آجاتا تھا اور اسے اتنی قوت و توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔'' (۲)

عصر حاضر میں صوفیہ کے کشف و کرامت، مجاہدہ و ریاضت، اخلاق و خدمت اور تبلیغ و دعوت کا ذکر تو بہت ہوا لیکن ان کی جدو جہد اور جہاد کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ خود ان کے اپنوں نے اس موضوع کو لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ اردو زبان میں راقم السطور کے علم و اطلاع کے مطابق اس موضوع پر وقیع یا غیر وقیع، طویل یا مختصر کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ جب کہ عربی کی امہات کتب اور مغربی ملکوں کے ''آرکیوز'' صوفیہ کے جہاد کے تذکرے سے پُر ہیں۔

ابن جوزی کی کتاب ''صفۃ الصفوہ'' میں ایک خاص باب ہے جس میں اوائل صوفیہ کے جہاد اور ان کے مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ ہے۔ یہ تمام صوفیہ دوسری صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے مجاہدہ و جہاد میں اپنی عمریں فنا کر دیں۔ (۳)

عبداللہ ابن مبارک (متوفی: ۱۸۱ھ) ائمہ صوفیہ میں سے ہیں۔ ایک نظری و عملی صوفی مجاہد تھے۔ انہوں نے اسلام میں سب سے پہلے زہد و تصوف اور جہاد کے موضوع پر کتابیں تصنیف کیں۔ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ''**كان لا يخرج الا الى الحج او الجهاد**'' یعنی یہ ہمیشہ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے تھے اور صرف حج یا جہاد کے لیے باہر آتے تھے۔ (۴)

شیخ ابراہیم ادہم، تصوف کی ایک معروف شخصیت ہیں لیکن شاید اکثر گوش اس حقیقت سے ناآشنا ہوں کہ وہ جتنے بڑے عابد شب زندہ دار تھے اتنے ہی بڑے مجاہد و شہسوار بھی تھے۔ بیز نطینی حملوں کے دفاع میں انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا اور ابن کثیر کے مطابق بحیرہ روم (Mediterranean Sea) کے ایک جزیرے میں سرحدی چوکی پر نگرانی کرتے ہوئے ان کی وفات ہوئی۔ (۵)

شقیق بلخی، شیخ ابراہیم ادھم کے شاگرد و مرید تھے۔ امام ذہبی اور ابن شاکر کتبی، حاتم سے نقل کرتے ہیں کہ ''میں شقیق بلخی کے ساتھ رومیوں کے خلاف صف جنگ میں تھا اور یہ جنگ اس

قدر ہولناک تھی کہ صرف اڑتے ہوئے سر، چمکتے ہوئے نیزے اور کاٹتی ہوئی تلواریں ہی نظر آ رہی تھیں''۔(۶)

صوفیہ کے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی (متوفی ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء) نے صلیبی جنگوں کے دوران حملہ آوروں کے خلاف امت مسلمہ اور اس کے حکمرانوں کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا اعتراف معروف مصری ادیب و مصنف احمد امین سمیت متعدد معاصر مورخین نے کیا ہے۔(۷) ڈاکٹر ماجد عرسان جو ایک عرب نژاد امریکی محقق و مصنف ہیں، انہوں نے اپنی کتاب میں الملک المظفر کے نام شیخ اکبر کی ایک وصیت کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے اس بادشاہ کو مغربی حملہ آوروں کے خلاف جہاد کی ترغیب دی ہے۔ یہ وصیت دمشق کی الاسد قومی لائبریری میں مخطوطہ رقم ۶۲۸۶ کے تحت محفوظ ہے۔(۸)

امام غزالی (متوفی ۵۰۵ھ/ ۱۱۱۲ء) پر یہ بہتان عام ہے کہ انہوں نے اپنے عظیم موسوعی عمل یعنی احیاء علوم الدین میں جہاد اور اسلامی مقدسات کے دفاع جیسے اہم فریضے کا ذکر نہیں کیا جب کہ ان کا عہد صلیبی دراندازوں کا عہد تھا۔ محض کسی ایک کتاب میں جہاد کا ذکر نہ ہونے کی بنیاد پر اس کے مصنف پر اس کے مخالف ہونے کا الزام لگانا دلیل کم نظری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام غزالی صلیبی حملہ آوروں کے خلاف اسلامی دفاع کی اساس تیار کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔ ڈاکٹر ماجد عرسان نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب، **ھکذا ظھر جیل صلاح الدین و ھکذا عادت القدس**'' (یعنی اس طرح صلاح الدین کی نسل تیار ہوئی اور اس طرح بیت المقدس بازیاب ہوا) میں دستاویزی ثبوتوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ بیت المقدس کی بازیابی سے قبل صلاح الدین ایوبی اور امام غزالی میں مسلسل مراسلت و خط و کتابت قائم تھی۔ غزالی اپنے خطوط میں صلاح الدین ایوبی کو جہاد کی اہمیت و ضرورت اور اسلامی آثار و مقدسات کی حفاظت و صیانت کی تلقین کرتے تھے اور ان کی ذہنی و فکری تربیت و ہدایت کا کام کرتے تھے۔(۹) ڈاکٹر ماجد عرسان کے مطابق بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی (متوفی ۵۶۱ھ/ ۱۱۶۷ء) کی خانقاہ نے ہی سلطان صلاح الدین ایوبی کی نسل کو تیار کیا تھا۔ ان کی خانقاہ صلیبی حملوں کے دوران شام و فلسطین کے مظلوم و برباد مسلمانوں کی پناہ گاہ تھی، جہاں ان تباہ حال لوگوں کو نہ صرف ٹھکانا ملتا تھا بلکہ انہیں روحانی و جسمانی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ اس خانقاہ کے تربیت یافتہ رضا کار ہی تھے جن کے ذریعہ حطین کے میدان میں ایوبی کی فوج کی اولین صفوں کی تشکیل ہوئی تھی۔ شیخ کے وعظوں نے ان کے سینوں میں ایسی آگ بھر دی تھی جس نے صلیبی دراندازوں کے خرمنوں کو جلا ڈالا۔(۱۰)

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے بھی امام غزالی اور شیخ عبدالقادر کی ان کاوشوں کو اپنی کتاب

تاریخ مشائخ چشت میں ضمناً ذکر کیا ہے۔(۱۱) نظامی صاحب کے مطابق اسپین میں موحدین کی سلطنت کے قیام کا سہرا بھی امام غزالی کے سر جاتا ہے؛ کیوں کہ انہوں نے ہی بانی سلطنت محمد بن عبداللہ تومرت کو ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے اُبھارا تھا۔(۱۲) ابن خلدون نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔(۱۳)

صلیبی اور تاتاری دراندازوں سے نبرد آزما ہونے والے سارے مسلم حکمراں اور فوجی قائدین بھی صوفی مشرب وطبیعت والے تھے۔ سلطان نور الدین زنگی کا تصوف ایک واضح حقیقت ہے۔ابن خلکان کا بیان ہے کہ

''نور الدین عابد وزاہد اور متقی ومجاہد بادشاہ تھے۔صوفیہ کی حد سے زیادہ تکریم کرنے پر ان کے بعض ساتھیوں نے انہیں ٹوکنے کی کوشش کی تو وہ بے حد ناراض ہوئے اور کہا کہ میں انہیں کے ذریعے اللہ سے فتح کی امید رکھتا ہوں''۔(۱۴)

مستشرق البرشاندور (Alber Shandor) نے بھی نور الدین کے تصوف کا ذکر کیا ہے۔وہ اپنی کتاب "Saladdin the purest hero in Islam" میں لکھتے ہیں:

''نور الدین نے اپنی پوری زندگی جہاد کے لیے وقف کردی اور عمر بھر ایک صوفی کے جوش وجذبے کے ساتھ اس میں لگے رہے''۔(۱۵)

بیت المقدس کے فاتح صلاح الدین ایوبی بھی فکر وسلوک باہر دو اعتبار سے صوفی تھے۔ ان کے تمام سوانح نگاروں نے تصوف اور صوفیہ سے ان کی گہری وابستگی کا ذکر کیا ہے۔ابو شامہ مقدسی نے کسی معاصر شاعر کا دو شعر نقل کیا ہے جس میں انہیں ظاہر وباطن کا مجاہد قرار دیا گیا ہے۔

ملک له في الحرب بحر تفقه

وله غداة السلم زهد تصوف

أحييت دين محمد و أقمته

و سترته من بعد طول تكشف

(وہ ایسے بادشاہ ہیں جنہیں جنگی امور میں گہری معرفت ہے اور جو امن کے وقتوں میں تصوف کے زہد سے آراستہ ہیں۔آپ ہی نے دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نئی زندگی دی اور اسے قائم کیا اور طویل برہنگی کے بعد اس کی پردہ پوشی کی۔)

عماد اصفہانی نے لکھا ہے کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد ایوبی نے کنیسۃ القیامہ (Easter Church) کی حفاظت کا حکم دیا اور فقہا کے لیے ایک مدرسہ اور صوفیہ کے لیے ایک خانقاہ تعمیر کرائی۔(۱۷)

مصری سلطان ظاہر بیبرس (متوفی ۶۷۶ھ/ ۱۲۷۳ء) کا شمار عظیم مسلمان فاتحین میں ہوتا ہے۔اسی نے ۲۵ رمضان ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء میں معرکہ عین جالوت میں تاتاریوں کو تاریخ میں پہلی بار شکست دی تھی۔ یہ سلطان صوفیہ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔وہ مشہور صوفی شیخ بدوی سے بیعت تھا اور صوفی شیخ خضر کردی کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔(۱۸) ظاہر بیبرس صحبت اور برکت کے حصول کے لیے شیخ خضر کو اپنے جنگی معرکوں میں بھی لے کر چلتا تھا۔چنانچہ اسی تناظر میں ایک شاعر کہتا ہے:

ما الظاهر السطان الا مالک ا لد
یا بذاک لنا ملاحم تخبر
و لنا دلیل واضح کالشمس فی
وسط السماء لکل عین تنظر
لما رأینا الخضر یقدم جیشه
أبدا علمنا بأنه الاسکندر

(یعنی جب ہم نے دیکھا کہ سلطان ظاہر کی فوج کے آگے آگے ہمیشہ خضر چلتے ہیں تو ہم نے جان لیا کہ سلطان یقیناً سکندر ہیں۔)

صرف مصر و شام ہی نہیں بلکہ استعماری قوتوں کے خلاف صوفیہ کی جدو جہد کی شہادت بلقان، قوقاز، روسی ترکستان، اور سنجیانگ کی تاریخ سے ملتی ہے۔ داغستان، انگوش اور چیچنیا میں نقش بندی صوفی سلسلے سے وابستہ صوفیہ اور ان کے ماننے والوں نے روسی نوآبادیاتی قوتوں کے خلاف جدو جہد کے علم کو صدیوں تک بلند رکھا۔ان مجاہدین نے چیچنیا میں روسی غاصبوں کے خلاف قربانی و فداکاری کی ایسی تاریخ رقم کی ہے جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔امام منصور، محمد غازی، حمزہ بیگ اور امام شامل کی قیادت میں نقش بندی بزرگوں نے دو صدیوں تک اپنی جدو جہد کو جاری رکھا۔امام شامل کی شخصیت تو دیو مالائی کہانیوں کے کردار کی طرح بن گئی۔ آج بھی قوقاز کے علاقوں میں وہاں کے لوک گیتوں میں امام شامل اور ان کی مجاہدانہ کوششوں کا ذکر ملتا ہے۔(۱۹)

عثمانی سلطانوں بالخصوص سلطان محمد فاتح (متوفی: ۱۴۸۱ء) کی تصوف اور صوفیہ سے وابستگی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔عثمانی فتوحات کے پیچھے تصوف ایک بڑا محرک تھا۔ شیخ شمس الدین عاق کی تحریک پر ہی سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کی فتح کا ارادہ کیا تھا۔ یہ ایک قادری بزرگ تھے۔(۲۰) فتح قسطنطنیہ کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے، جس میں فاتح اور اس کی فوج دونوں کی تعریف کی گئی ہے۔(۲۱)

شمالی افریقہ ابتدا ہی سے تصوف کا قلعہ رہا ہے۔ مصر سے لے کر مراکش تک پھیلی ہوئی خانقاہیں رباطیں، زاویے اور مقامات اولیا اس امر کے گواہ ہیں۔ اگرچہ یہ خانقاہیں بنیادی طور پر تزکیۂ نفس اور تعمیر باطن کے مراکز تھیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ سماجی زندگی کا محور بھی تھیں۔ اہل تصوف کی محبوبیت اور مرجوعیت کا سبب صرف ان کا زہد و تقوی ہی نہیں تھا، بلکہ ان کی سماجی خدمات، اسلام کی نشر و اشاعت میں ان کا حصہ اور اسلام کے علمی و فکری دفاع میں ان کا کردار ایسے عوامل تھے جنہوں نے مجموعی طور پر صوفی تحریکات کو پورے شمالی افریقہ میں غیر معمولی اہمیت کا حامل بنا دیا تھا۔ گزشتہ صدی کے اوائل تک نہ صرف شمالی افریقہ بلکہ پورے براعظم میں تصوف اسلام کے مرادف کے طور پر جانا جاتا تھا اور آج بھی افریقہ کے بہت سے خطوں میں یہی صورت حال قائم ہے۔

جب تاتاریوں کے سامنے سارا عالم اسلام سرنگوں تھا تو اس سیلاب بلا خیز کے سامنے مزاحمت کی پہلی دیوار قائم کرنے والے شمالی افریقہ میں مصر کے صوفیہ ہی تھے۔ خوارزمی حکومت سے خلافت عباسیہ تک اور عراق سے شام کی ریاستوں تک، حکومتیں اور حکمراں سبھی تاتاری طوفان میں خشک پتوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ لوگوں نے تاتاریوں کو ایک ناقابل تسخیر قوت مان لیا تھا، حتی کہ عربی زبان میں یہ محاورہ رائج ہو گیا کہ اذا قیل لک ان التتار انھزموا فلا تصدق یعنی اگر تمھیں تاتاریوں کی شکست کی خبر دی جائے تو اس کی تصدیق مت کرو اور ایسی خبر کو سچ مت سمجھو۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ سلطان ظاہر بیبرس نے عین جالوت (۲۲) کے مقام پر امام عزالدین عبدالسلام کی روحانی قیادت میں نہ صرف تاتاریوں کے ناقابل شکست ہونے کے طلسم کو توڑ دیا بلکہ ان کو بدترین ہزیمت سے دوچار کیا۔ مصری امرا تاتاریوں سے لڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن امام عزالدین کے وعظوں اور نصیحتوں نے نہ صرف انہیں دین و وطن کے دفاع کے مقدس فریضے کی ادائیگی کے لیے تیار کیا بلکہ ان کے اندر ایسا جوش و ولولہ پیدا کیا جس نے تاتاریوں کے وہم وغرور کو چکنا چور کر دیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس معرکے کے وقت امام عزالدین کی عمر اسی سال سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اس ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود آپ نے نہ صرف مصری حکام و عوام کو اس معرکے کے لیے تیار کیا بلکہ بنفس نفیس اس میں شرکت بھی کی۔

امام عزالدین عبدالسلام (متوفی ۶۶۲ھ/ ۱۲۶۴ء) سلطان العلماء ہونے کے ساتھ ساتھ عملی و نظری صوفی بھی تھے۔ ان کے متصوفانہ نظریات ان کی تصنیفات میں جا بجا ملتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ایک صاحب نسبت صوفی بھی تھے۔ امام سیوطی کے بقول انہیں شیخ شہاب الدین سہروردی سے اجازت اور خرقۂ تصوف حاصل تھا۔ (۲۳)

امام عزالدین عبدالسلام نے شاذلی سلسلۂ تصوف کے بانی شیخ ابوالحسن شاذلی (متوفی

۶۵۶ھ/ ۱۲۵۸ء) سے بھی روحانی استفاضہ کیا تھا۔خود امام شاذلی شمالی افریقہ کے ایسے بزرگ ہیں جو 'رھبان فی اللیل فرسان فی النھار' کی مثال تھے۔انہوں نے مصر کے منصورہ میں پیش آمدہ معرکے میں اپنے خلفاومریدین کے ساتھ شرکت کی تھی۔ یہ معرکہ ۱۲۵۰ء میں لوئیس نہم کے زیر قیادت ہونے والے صلیبی حملے کے نتیجے میں برپا ہوا تھا۔(۲۴) عماد الدین حنبلی نے لکھا ہے کہ امام شاذلی رضا کارانہ طور پر صبح فجر سے لے کر مغرب تک اسکندریہ میں فوجی چوکیوں پر نگرانی میں مصروف رہتے تھے۔(۲۵)

ماضی ہی کی طرح جدید استعماری نظام کے خلاف بھی شمالی افریقہ کی صوفی تحریکات و شخصیات نے جہاد ومجاہدہ کی ایک سنہری تاریخ رقم کی ہے۔جدید مصر کی تاریخ میں عرابی پاشا کا انقلاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔جسے عربی تاریخی وادبی کتابوں میں الثورۃ العرابیۃ کے نام سے جانا جاتا ہے۔نپولین بونا پارٹ کی استعماری حکومت اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف برپا ہونے والے اس انقلاب کی قیادت کرنے والے احمد عرابی پاشا (۱۸۴۱-۱۹۱۱ء) جن کے نام کی نسبت سے اس انقلاب کو ''الثورہ العرابیہ'' کہا جاتا ہے،ایک صوفی عالم تھے۔یہ اور ان کے ساتھی رات میں ذکر وعبادت میں مصروف رہتے تھے اور دن میں نپولین کی فوجوں کے ساتھ معرکہ آرائی میں۔شوقی ابوخلیل نے شیخ عرابی اور ان کے ساتھیوں کی فداکاری اور قربانی کا بہت ہی دل آویز تذکرہ کیا ہے۔(۲۶) عرابی کی مجلس قیادت میں شیخ حسن العدوی، شیخ محمد علیش اور رشید محمد ابوعلیان شاذلی جیسے مشہور صوفیہ شامل تھے،عرابی پاشا کے دوسرے تمام رفقا بھی صوفی طینت وطبیعت کے لوگ تھے۔(۲۷)

شیخ جبرتی ،۱۷۹۸ء میں نپولین کے حملے اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے وقائع و احداث کے چشم دید مورخ ہیں۔انہوں نے اس حملے کے خلاف صوفیہ اور خانقاہوں کی مزاحمت و مدافعت کا مفصل ذکر کیا ہے۔انہوں نے خانقاہوں اور زوایا میں ہونے والی جنگی تیاریوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔(۲۸)

صوفیہ کی صفوں میں تنظیم وتجربے کی قلت،فرانسیسی فوجوں کی تربیت اور اسلحہ دونوں میں غیر معمولی برتری اور ان سب سے مستزاد غداروں کی مدد سے فرانسیسی نوآبادکاروں کو کامیابی تو مل گئی اور مصر ان کے زیر نگیں آگیا،لیکن پورے فرانسیسی عہد میں صوفیہ کی مزاحمت اور جدوجہد کا سلسلہ بغیر انقطاع کے جاری وساری رہا۔

جب نپولین کو جبر واستبداد کے ذریعے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے میں کامیابی نہیں ملی تو اس نے داد ودہش کو اپنا ذریعہ بنایا۔چنانچہ جبرتی لکھتے ہیں کہ نپولین نے صوفی مشائخ کو اپنی

طرف مائل کرنے کے لیے ان کے اعزاز و تکریم کا ایک پروگرام مرتب کیا اور سلسلۂ شاذلیہ کے شیخ طریقت شیخ شرقاوی کو بلایا اور انہیں فرانسیسی جھنڈے کے رنگوں سے بنی ہوئی شال اوڑھانا چاہا تو شیخ نے اسے زمین پر پھینک دیا۔ نپولین بے حد غضبناک ہوا اور ترجمان کے ذریعے بولا کہ وہ اس شال کے ذریعے ان کی تکریم کرنا چاہتا ہے۔ یہ شال حکومت اور اس کے ایوانوں میں ان کی قدر وعظمت میں اضافے کا موجب ہوگی۔ شیخ شرقاوی نے مجاہدانہ شوکت وجلال کے ساتھ جواب دیا کہ وہ حکومت اور اس کے ارکان کی نگاہوں میں عزت پانے کے بدلے رب العزت اور عوام کے سامنے بے عزت نہیں ہونا چاہتے۔ (۲۹)

شیخ شرقاوی کے دوسرے صوفی ساتھی شیخ مہدی نے ۳/ مارچ ۱۷۹۹ کو فرانسیسیوں کے ساتھ ہونے والے معرکہ سنہور میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ شیخ مہدی اور ان کے پندرہ ہزار ساتھیوں نے اس معرکے میں جس جاں بازی کے ساتھ مغربی دراندازوں کا مقابلہ کیا اس نے کرنل لویور کے چھکے چھڑا دیے تھے اور انہیں پسپا ہونا پڑا تھا۔ مصر کے ایسے صوفی بزرگوں کی فہرست بے حد طویل ہے جنھوں نے فرانسیسی نوآبادکاروں کا مقابلہ کیا اور قتل وتعذیب کا شکار ہوئے۔ ان میں سرفہرست شیخ محمد سادات، شیخ محمد کریم اور شیخ محمد مکرم وغیرہ شامل ہیں۔ اول الذکر نے قاہرہ کے پہلے انقلاب کی قیادت کی تھی، جب کہ شیخ عمر مکرم قاہرہ کے دوسرے انقلاب کے قائد و رہنما تھے۔ وہ ازہر کے فارغ التحصیل، نقیب الاشراف اور اعلیٰ پائے کے صوفی تھے۔ (۳۰)

مصر میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف صوفیہ کی جدو جہد کی تاریخ بے حد طویل ہے۔ اس مختصر سے مقالے میں اس کا احاطہ کرنا تو کجا اس کی خاطر خواہ تصویر کشی بھی نہیں کی جاسکتی ہے جبرتی کی کتاب التاریخ اور ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کی تصنیف 'الاسلام و حرکات التحرر' جیسی کتابوں کے ذریعے ہی اس کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں میں صرف ایک تاریخی حقیقت کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

فرانس کا انسان میوزیم (Musee de Homme) عالمی شہرت کا عجائب خانہ ہے، جو پیرس کے ایک محل میں قائم ہے۔ اس میوزیم میں ایک جگہ دو انسانی کھوپڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک کے نیچے لکھا ہے۔ '' مجرم سلیمان حلبی'' اور دوسری کے نیچے تحریر ہے '' عبقری ڈیکارٹ'' سلیمان حلبی کی کھوپڑی عجائب خانہ کے ہر زائر کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے کہ آخر اسے ڈیکارٹ کے قریب جگہ کیوں ملی؟ اور دونوں میں کیا قدر مشترک ہے۔ شاید دونوں میں ایک ہی چیز مشترک ہے کہ فرانسیسیوں کی نظر میں دونوں کی تاریخی اور اس سے بڑھ کر نفسیاتی اہمیت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ دونوں کی اہمیت کی جہت ایک نہیں ہے۔ ڈیکارٹ کی کھوپڑی اگر تعظیم واعتزاز کے

لیے رکھی گئی ہے تو سلیمان حلبی کی کھوپڑی تحقیر اور جذبہ انتقام کی تسکین کے لیے محفوظ کی گئی ہے۔ دراصل سلیمان حلبی وہ جاں باز تھا جس نے مصر میں نپولین کے جانشین جنرل کلیبر کو ۱۸۰۰ء میں قتل کیا تھا۔ فرانسیسیوں نے اپنی اس شکست اور نفسیاتی خفت کو کم کرنے کے لیے اس نام نہاد گنہ گار اور اس کے عقیدے کے خلاف پچھلے دو سو سال سے یہ گناہ کرتے چلے آرہے ہیں اور یہ گناہ اسلام کے ساتھ ساتھ انسانیت کی نظروں میں بھی عظیم جرم ہے، اور ایسوں کے ذریعے کیا جارہا ہے جو خود کو انسانی حقوق کا علم بردار سمجھتے ہیں۔ یہ سلیمان حلبی تصوف کا پروردہ اور مشائخ ازہر سے تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے صرف ۲۴ سال کی عمر میں فداکاری کی یہ مثال قائم کی تھی۔ معاصر دستاویزات کے مطابق شیخ الصوفیہ شیخ محمد سادات کو جنرل کلیبر کی جانب سے جو انسانیت سوز سزائیں دی گئی تھیں، انھی کا انتقام لینے کے لیے سلیمان حلبی نے یہ انتہائی قدم اٹھایا تھا۔ (۳۱)

برطانوی نوآبادیاتی نظام کے خلاف مہدی سوڈانی (۱۸۴۳۔۱۸۸۵ء) کی جدوجہد بھی عالمی شہرت رکھتی ہے۔ صاحب 'حلیہ البشر' لکھتے ہیں:

''سن ۹۷ھ میں (۱۲۹۷ھ) سوڈان میں محمد احمد سوڈانی نامی ایک شخص ظاہر ہوئے۔ انہوں نے خود کبھی اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا...... وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے مشہور تھے اور ان کا تعلق مشائخ تصوف سے تھا۔ ان کے مریدین و متبعین کی بڑی کثرت تھی۔ جب سوڈان میں انگریز داخل ہوئے تو انہوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ان سے بہت ساری لڑائیاں لڑیں۔ ان کا معاملہ عجیب تھا۔ انگریز توپ و تفنگ کے ساتھ ہوتے تھے لیکن وہ اور ان کے رفقا قدیم اور روایتی ہتھیاروں سے ہی ان کا مقابلہ کرتے تھے۔'' (۳۲)

انگریزوں کے خلاف محمد احمد معروف بہ مہدی سوڈانی کی جدوجہد اتنی طویل و شدید تھی کہ ان کی شخصیت میں دیومالائی عناصر شامل ہوگئے۔ یہ بھی مشہور کردیا گیا کہ انہوں نے مہدیت کا دعویٰ کیا ہے۔ انہیں کی طرح صومال کے صوفی مجاہد شیخ محمد عبداللہ حسن کے بارے میں بھی زور و شور سے یہ پروپگنڈا کیا گیا کہ انہوں نے بھی مہدیت کا دعویٰ کیا، شیخ محمد عبداللہ نے ہمیشہ اس بات کی نفی کی اور خود کو صوفی درویش قرار دیا۔ اس صوفی بزرگ نے انگریز نوآبادکاروں کے خلاف حریت و آزادی کی ایسی مشعل جلائی جس سے صومالیہ کے آزاد ہونے تک حریت پسند روشنی حاصل کرتے رہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ محمد احمد سوڈانی اور شیخ محمد عبداللہ صومالی کے خلاف دعویٰ مہدیت کا پروپیگنڈہ خود انگریزوں کا پیدا کردہ مسئلہ تھا اور یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ یہ افواہیں انگریز اور ان کے کاسہ لیسوں کی شاطرانہ چالوں کا نتیجہ ہو۔ اس میدان میں انگریزوں کی مہارت معروف و مسلم ہے۔

صومال میں دراندازی کرنے والے صرف انگریز نہیں تھے بلکہ اطالوی اور اتھوپیائی بھی

ان کے شریک کار تھے لیکن شیخ محمد عبداللہ حسن بیس سالوں تک ان نو آباد کاروں کے خلاف سینہ سپر رہے اور متعدد بار انہیں ہزیمتوں سے بھی دو چار کیا۔ ڈاکٹر عبداللہ ابراہیم عبدالرزاق نے اس صومالی صوفی تحریک اور اس کی جدو جہد کا مفصل طور پر تعارف کرایا ہے۔ (۴۴)

شمالی افریقہ کے مشرقی گوشے سے جب ہم اس کے مغربی گوشے کی طرف رُخ کرتے ہیں تو ہمیں قدم قدم پر صوفی تحریکات کی جدو جہد کے آثار ملتے ہیں ساتھ ہی ساتھ ہر ایک گام پر نو آبادیاتی نظام کے ظلم وستم کے نشان بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ عرب اس خطے کو مغرب عربی کے نام سے جانتے ہیں اور اس میں لیبیا، تیونسیا، الجزائر، مراکش اور موریتانیہ پانچ ملک شامل ہیں۔

یہ پورا خطہ زمانۂ قدیم سے تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ تصوف ہمیشہ سے یہاں کی آب وہوا اور مٹی میں بسا ہوا تھا۔ یہاں صوفی زاویے اور رباطیں وہ محور تھیں جن کے چہار طرف سماجی زندگی کی چکی گھومتی تھی۔ یہ تعلیم وتربیت کا مرکز تھیں۔ رشد وہدایت کا منبع تھیں۔ عوامی تنازعوں میں عدالت کا کام انجام دیتی تھیں۔ سماج کی وحدت واتفاق کا ذریعہ تھیں۔ ان خانقاہوں کے شیوخ حکمرانوں اور امرا تک لوگوں کی سفارشات بھی کرتے تھے اور ان حکمرانوں کو انہیں قبول بھی کرنا پڑتا تھا کبھی خوشی خوشی اور کبھی مجبوراً۔ ان خانقاہوں میں یتیم خانے اور بیوہ خانے بھی چلتے تھے اور مصائب وآفات کے وقت یہ خانقاہیں مادی اور معنوی امداد کے لیے بھی آگے آتی تھیں۔ مختصر یہ کہ صوفی نظام مغرب عربی کی سماجی زندگی کے ریشے ریشے میں پیوست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مغربی نو آبادیات کے خلاف صوفیہ اور صوفی تحریکات نے اپنی جدو جہد شروع کی تو پورا سماج ان کے ساتھ ہولیا۔

لیبیا کا نام آتے ہی عمر مختار کا نام زبانوں پر آجاتا ہے۔ لیبیا پہنچنے سے پہلے راقم السطور بھی بہتوں کی طرح اس غلط فہمی کا شکار تھا کہ عمر مختار کوئی شدت پسند یا پھر کوئی کامریڈ قسم کے مسلمان رہے ہوں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لیبیا کے ایک بڑے سلسلۂ تصوف یعنی سنوسی سلسلے سے وابستہ تھے اور خود بھی مشائخ سلسلہ کی طرف سے ماذون ومجاز تھے اور اس بڑی سنوسی تحریک آزادی کا حصہ تھے جس کا آغاز سیدی احمد شریف سنوسی نے کیا تھا۔ اس سلسلے کی بنیاد شیخ محمد بن علی سنوسی کے ہاتھوں پڑی تھی اور اس کا شروع ہی سے یہ امتیاز تھا کہ اس سلسلے کی خانقاہوں میں ذکر وفکر کے ساتھ ساتھ آلات حرب کے استعمال کی تربیت اور تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی کے آمر مسولینی نے لیبیا پر حملہ کیا تو اس نو آبادیاتی نظام کے خلاف جدو جہد کرنے والے صوفی سلسلوں اور تحریکوں میں سلسلۂ سنوسیہ سب سے نمایاں ہو کر سامنے آیا کیونکہ اس سلسلے کے وابستگان ایمانی حرارت کے ساتھ ساتھ جنگی تربیت سے بھی آراستہ تھے۔ مورخین کا اتفاق ہے

کہ اس سلسلے نے لیبیا سے جہل وتوہم کو دور کرنے اور علم وعمل کی نشرواشاعت میں زبردست کرد
کیا ہے۔ اس سلسلے کے بانی لیبیائی تحریک آزادی کے قائد اعلی سیدی احمد سنوی کے دادا تھے
احمد سنوسی اور ان کے ساتھیوں نے اپنی سرفروشی سے قرون اولیٰ کے مجاہدین کی یاد تازہ کردی
شیخ احمد شریف تصوف اور جہاد کی جامعیت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ ۱۹۱۱ء میں جب اٹلی نے حملہ کر
لیبیا کو اپنی نوآبادیات میں شامل کرنے کی کوشش کی تو صوفی تحریکات بالخصوص سلسلۂ سنوسیہ
بزرگ میدان کارزار میں اتر آئے۔ اطالویوں نے اعلان کیا کہ وہ طرابلس اور برقہ پر پندر
میں قبضہ کرلیں گے۔ انگریز جرنلوں نے اسے اطالویوں کی حربی ناپختگی قرار دیا اور یہ خیال ظ
کہ اس معرکے کو سر کرنے میں انہیں کم از کم تین ماہ کا وقت لگے گا۔ لیکن سلسلۂ سنوسیہ کے صو
بے مثال شجاعت ومزاحمت نے انگریز جرنلوں کے اندازوں کو بھی غلط ثابت کردیا اور اطالوی
ان دونوں شہروں پر قبضہ کرنے میں پورے پندرہ سال لگ گئے اور اس کے بعد بھی جدو
سلسلہ رکا نہیں، بلکہ ۱۹۵۹ء میں لیبیا کی آزادی تک کسی نہ کسی شکل میں جاری رہا۔

دراصل سلسلۂ سنوسیہ میں مزاحمت کی یہ روح سلسلۂ شاذلیہ سے آئی جو اس سلسلے کی
ہے۔ امام ابوالحسن شاذلی کی جہادی مساعی کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس وقت
سنوسیہ کے صوفیہ کی شجاعت اور بے مثال جدوجہد کی بازگشت چہار دانگ عالم میں سنائی د
تھی۔ ہندوستان کی صحافت اور ہندوستانی شعرا کے کلام میں بھی اس کا چرچہ تھا۔ علامہ اقبال
شہدائے طرابلس کے لہو کو ایسی جنس نایاب قرار دیا ہے جو جنت میں بھی دستیاب نہیں ہے،
بانگ درا کی ایک نظم ''حضور رسالت مآب میں'' لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
عالم خیال کی ملاقات میں مجھ سے پوچھا کہ میرے لیے تحفہ کیا لائے ہو؟ تو میں نے عرض کی:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزار لالہ و گل میں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
میں نذر کرنے کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
چھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں
(۳۴)

مولانا حمید الدین فراہی شیراز ہند کی ایک دور افتادہ بستی میں بیٹھ کر طرابلس میں مسلمانوں کی شکست کو پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے بے قراری کا موجب قرار دے رہے ہیں۔

كيف القرار و قد نكس
أعلامنا بطرابلس

شیخ عمر مختار کو اسد الصحراء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اطالوی فوجوں کے لیے خوف ودہشت کی علامت بن گئے تھے۔ انہوں نے دو دہائیوں تک اطالوی جرنلوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ امیر الشعراء احمد شوقی انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ آپ کا جسمِ مصلوب صحراء میں اس پرچم کی طرح ہے جو صبح وشام اہل وادی کو ابھارتا اور بیدار کرتا ہے۔

ركزوا رفاتك في الرمال الواء
يستنهض الوادي صباح مساء

الجزائر میں استعماری قوتوں کے ظلم وستم کی داستاں سب سے زیادہ خوں چکاں ہے۔ چونکہ فرانس کا ارادہ الجزائر کو صرف اپنی نو آبادیات کا حصہ بنانے کا نہیں تھا بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے فرانس میں جذب کر لینے کا تھا۔ فرانسیسی توسیع پسندوں کا دعوی بھی یہی تھا کہ الجزائر فرانس کی سرزمین کا ہی ایک حصہ ہے جسے سمندر نے اس سے الگ کر دیا تھا اور الجزائر پر فرانسیسی قبضے کے بعد گویا وہ پھر اپنی اصلی زمین سے جڑ گیا ہے اور درمیان کا سمندر صرف ایک نیلگوں ہالے کی مانند ہے۔ اس نقطہ نظر کے بموجب فرانس نے الجزائر میں صرف مال و دولت بٹورنے پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ اس ملک کی پہچان اور اس کے تشخص کو مٹا دینے کا ارادہ بھی کیا تھا۔ یہ صرف معاش و اقتصادی استعمار نہیں تھا جیسا کہ انگریز اور دوسرے مستعمرین نے مصر سے ملیشیا تک کر رکھا تھا، بلکہ فرانس نے الجزائر کے فکری، تہذیبی اور ثقافتی استعمار کی کوشش کی تھی، جس کے لیے غیر معمولی قوت وطاقت اور ظلم وستم کا استعمال کیا گیا۔ دینی وقومی تشخص کی حفاظت کے لیے الجزائری بھی سربکف ہو گئے کیونکہ یہ تشخص اقوام وملل کو مالی وسائل سے زیادہ عزیز ہوتا ہے لہذا مسلمانوں نے بھی الجزائر کی آزادی وخود مختاری کو بچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں رکھا۔ فرانسیسی نو آبادیاتی نظام نے اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے مسجدوں کو چرچوں میں تبدیل کر دیا۔ عربی زبان کی جگہ فرانسیسی کو مدارس میں داخل کر دیا یہاں تک کہ عربی لباس کے استعمال پر پابندی لگا دی تھی۔

لیکن شاید فرانسیسی نو آبادکاروں کو ملک میں تصوف کے اثر اور اس کی گرفت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ وہاں کی صوفی تحریکات نو آبادکاروں کے خلاف صف بستہ ہو گئیں اور انسانی تاریخ میں جدوجہد کی ایک عظیم داستان تحریر کی۔ الجزائر کی جدوجہد آزادی میں جن صوفی تحریکات اور

سلسلوں نے حصہ لیا ان میں سلسلہ قادریہ، تیجانیہ، رحمانیہ، درقاویہ، سنوسیہ اور طیبیہ وغیرہ نمایاں سلسلے ہیں۔ فرانسیسی مورخ مارسیل ایمپیری لکھتا ہے:

''انیسویں صدی میں الجزائر میں ہونے والے بیشتر انقلابات کے پس پشت صوفی سلسلے تھے۔ امیر عبدالقادر بھی انہیں میں سے ایک سلسلۂ قادریہ کے شیخ تھے۔'' (۳۵)

ایک دوسرا فوجی آفیسر دی نو وو ۱۸۴۵ء میں شائع اپنی کتاب ''الاخوان'' میں لکھتا ہے کہ ''نو آبادیاتی نظام کے خلاف سب سے اہم کردار صوفی تحریکات کا ہوتا ہے۔''

۱۸۴۵ء میں ہونے والے ظہرہ کے انقلاب کے بارے میں کیپٹن ریچرڈ کا بیان ہے کہ صوفیوں نے یہ ہنگامہ برپا کیا تھا۔ کیپٹن ریچرڈ کو اس انقلاب کو کچلنے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ فرانسیسیوں نے اس انقلاب کو ''صوفی سلسلوں کی شورش'' کا نام دیا تھا؛ کیوں کہ اس میں قادری، رحمانی اور طیبی کئی سلسلوں کے مشائخ شریک تھے۔

۱۹۶۴ء میں الجزائر کے فرانسیسی انسپکٹر جنرل کے آفس کی ایک رپورٹ کے مطابق حکومت کے خلاف سورش برپا کرنے میں صوفی سلسلہ درقاوی بے حد سرگرم ہے۔ رپورٹ کے الفاظ میں: ''درقاوی سلسلے کے صوفی ہمارے سخت ترین دشمن ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد سیاسی ہے۔ وہ لوگ از سر نو اسلامی مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہمیں یہاں سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ صوفی سلسلہ جنوب میں زیادہ پھیلا ہوا ہے۔'' (۳۶)

۱۸۶۰ء میں جرنل سونیز کی قیادت میں فرانسیسی فوجوں نے تیجانی سلسلے کی ''بغاوت'' کو کچلنے کے لئے شہر 'عین ماضی' پر لشکر کشی کی یہ شہر شیخ احمد عمار کا شہر تھا جو تیجانی بغاوت کی قیادت کر رہے تھے اور ایک خوں ریز لڑائی کے بعد فرانسیسی فوجیں شیخ احمد کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئیں اور ایک عرصے تک حکومت نے انہیں الجزائر اور فرانس میں قید رکھا کیونکہ ان کے اثر ونفوذ کے پیش نظر فرانسیسی حکومت نہ انہیں سزائے موت دینا چاہتی تھی اور نہ انہیں آزاد کرنے کا خطرہ مول لے سکتی تھی۔ بعد میں بغاوت کی کمان شیخ احمد عمار کے بھائی شریف محمد بشیر نے سنبھالی حکومت نے انہیں بھی گرفتار کر لیا۔ تصوف اور جدوجہد کی یہ مشترکہ میراث شریف خاندان کے اگلی نسلوں کو منتقل ہوئی۔ چنانچہ شریف بشیر کے بیٹے شریف محمود اور ان کے بعد پوتے شریف ابن عمر نے نو آبادیاتی نظام کے خلاف تیجانی سلسلے کی جدوجہد کو جاری رکھا۔

نو آبادیاتی نظام کے خلاف سلسلۂ رحمانیہ کی جدوجہد بھی آب زر سے لکھی جانے کے قابل ہے۔ اس سلسلے نے استعماری فوجوں کے الجزائر میں داخلے کے ساتھ ہی بغاوت وانقلاب کے جس علم کو بلند کیا وہ الجزائر کی آزادی تک بلند رہا۔ اس سلسلے کی اہم بغاوتوں میں الحاج عمر کی بغاوت جو

۲ر ستمبر ۱۸۵۶ء میں ہوئی۔ شیخ ابن جاراتہ کی بغاوت جس کے شعلے ۳۰ رمئی ۱۸۷۹ء میں بلند ہوئے اور شیخ ہاشمی بن علی دردور کی بغاوت الجزائر کی تاریخ جنگ آزادی میں اہم مقام کی حامل ہیں۔

اس سلسلے کی مزاحمت وجد وجہد کی سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جن میں لالہ فاطمہ نسومر کی بغاوت اور جدو جہد سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ فرانسیسی جنرل روندون اور جرنل میک موہن سے ہونے والی کئی لڑائیوں میں انہوں نے حصہ لیا بلکہ بعض معرکوں کی قیادت بھی کی۔ ایک معرکے میں ان دونوں جرنلوں کے ساتھ ساتھ آغا جودی نام کا ایک الجزائری خائن بھی تھا۔ معرکے میں لالہ فاطمہ نے اس غدار کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا اور اپنی جان پر کھیل کر اپنے ساتھی قائد اور الجزائر کی جنگ آزادی کے ایک عظیم مجاہد شریف محمد بن عبداللہ بوبغلہ کی جان بھی بچائی۔ لالہ فاطمہ کے ساتھ ان معرکوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کی بھی بڑی تعداد شریک ہوتی تھی۔ 'آیت تسورغ' کی لڑائی میں لالہ فاطمہ گرفتار کی گئیں اور انہیں جنوب کی ایک خانقاہ میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ سات سال مقیم رہیں اور ۱۸۶۲ء میں محض ۳۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ (۳۷)

الجزائر میں فرانسیسی نو آباد کاروں کے خلاف جدو جہد کی تاریخ کا سب سے سنہرا باب امیر عبدالقادر جزائری نے تحریر کیا۔ ان کے والد شیخ محی الدین، معروف قادری بزرگ اور شیخ طریقت تھے۔ جب ۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر پر حملہ کیا تھا تو تمام حریت پسند شیخ محی الدین کی قیادت میں جمع ہو گئے جن میں سرفہرست صوفی سلاسل کے مشائخ تھے اور اس جماعت نے الجزائر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ جب لوگوں نے شیخ محی الدین کو باضابطہ طور پر اپنا امیر بنانا چاہا تو انہوں نے اپنی کبر سنی اور ضعیفی کا حوالہ دیکر معذرت کر لی تو لوگوں نے ان کے جواں سال صاحبزادے یعنی عبدالقادر کو اپنا امیر منتخب کر لیا۔ یہ انتخاب ۲۱ رنومبر ۱۸۳۲ء کو عمل میں آیا۔ امیر عبدالقادر نے سترہ سال تک فرانسیسیوں سے مقابلہ کیا اور اپنی بہادری اور حکمت عملی سے بڑے بڑے فرانسیسی جرنلوں کو ششدر کر دیا۔ جنرل بیگو کو متعدد معرکوں میں پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا تو کئی بار مذاکرات کی میز تک انہیں لانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن طویل لڑائی اور جنگی رسد کی کمی نے اس صوفی مجاہد کو آخرش ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے اپنی بقیہ عمر دمشق میں جلاوطنی میں گزارا جہاں ان کا وقت مجاہدۂ نفس، تصنیف و تالیف، لوگوں کی تزکیہ و تعلیم اور بندگان خدا کی خدمت میں گزرتا تھا۔ اس طرح اس عظیم صوفی نے اپنی پوری عمر جہاد اور مجاہدے میں گزاردی اور انتقال کے بعد حسب وصیت شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے بغل میں مدفون ہوئے۔ (۳۸)

ان کی زندگی کا ایک انسانی پہلو اس وقت دیکھنے میں آیا جب دمشق میں ایک زبردست

فرقہ وارانہ فساد کے وقت انہوں نے اپنے اثر ونفوذ کا استعمال کر کے ہزاروں عیسائیوں کی جا
بچائی۔ روس، انگلستان اور فرانس نے سرکاری طور پر ان کی اس انسانی خدمت کا اعتراف کیا
(۳۹) شاید صوفیۂ کرام کی شخصیات کے انھیں روشن انسانی پہلوؤں کے سبب ان کے جہا
دہشت گردی اور شدت پسندی سے ممتاز ومختلف ہوتے ہیں۔ مجاہدۂ نفس کی منزلوں سے گزر
کے بعد وہ اپنے مزکیٰ وطاہر نفس کے ساتھ کبھی بھی حد سے تجاوز نہیں کرتے، کیونکہ ''اللہ تعالی
سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا'' (سورۃ البقرۃ: ۱۹۰)

امیر عبد القادر علم تصوف میں بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ تصوف میں ان کی کتا
''المواقف'' اس فن شریف میں ان کے مقام ومرتبے کی گواہ ہے۔ (۴۰) وہ صرف نظری ہی نہی
عملی صوفی تھے۔ امیر شکیب ارسلان اپنی کتاب ''حاضر العالم الاسلامی'' میں لکھتے ہیں:

**و کان المرحوم الأمیر عبد القادر متضلعا فی العلم و الادب، سامی الف
راسخ القدم فی التصوف لا یکتفی به نظرا حتی یمارسه عملاً و لا یحن الیه شوقا ح
یعرفه ذوقا۔۔۔(۴۱)**

(یعنی مرحوم عبد القادر الجزائری علم وادب میں ماہر تھے، بلند فکر تھے اور تصوف میں ر
القدم تھے۔ تصوف سے صرف علمی طور پر واقف نہیں تھے بلکہ اسے عملاً برتتے بھی تھے۔ صر
انہیں تصوف کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک باذوق صوفی بھی تھے۔)

مراکش میں بھی صوفی شخصیات وتحریکات نے فرانسیسی اور اسپینی نو آبادیاتی نظام
خلاف مزاحمت وجدو جہد کی طویل تاریخ رقم کی ہے۔ سلسلۂ تیجانیہ نے مراکش، موریتانیہ
سینگال وغیرہ میں دراندازوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ مراکش وموریتانیا میں نو آبادیاتی طاقتوں
خلاف جدو جہد کرنے والے صوفیہ کی تعداد بھی کافی ہے، جن میں سرفہرست شیخ عبد الکریم خط
(۱۸۸۲۔ ۱۹۶۳ء) کا نام آتا ہے۔ اس صوفی مجاہد نے اسپینی اور فرانسیسی افواج کو کئی بار شکس
دی۔ ان کے مقابلے میں اسپینی فوجوں کو ''انوال'' کی لڑائی میں زبردست ہزیمت کا سامنا
پڑا۔ اس فتح کے بعد ایک طرف تو ان کی شہرت پوری دنیا میں پھیل گئی۔ دوسری طرف ان کی بڑ
ہوئی قوت سے خوف زدہ ہو کر فرانسیسیوں اور اسپینیوں نے آپس میں ہاتھ ملالیا۔ شیخ خطابی
ان کے رفقا ان دونوں ملکوں کی مشترکہ فوج سے بہت دنوں تک مقابلہ جاری نہ رکھ سکے اور شیخ
مصر میں آکر پناہ لے لی اور وہیں ان کا انتقال ہوا''۔ (۴۲)

اس ضمن میں مراکش میں دوسرا اہم نام شیخ محمد بن عبد الکریم کتانی کا ہے۔ جو صوفی سلس
کتانی کے بانی تھے۔ اس صوفی بزرگ کی بے مثال جدو جہد نے درحقیقت مراکش کی آزادی

راہ ہموار کی۔فرانسیسیوں کے ہاتھوں آپ کی شہادت ہوئی لیکن آپ نے اپنے خون سے مزاحمت کی جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی میں اہل مراکش آزادی کی صبح تک پہنچے۔(۴۳)

نو آبادیاتی نظام کے خلاف صوفیہ کی جدو جہد کے اس مختصر سے جائزے کے بعد یہ بات پورے یقین واعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ صوفیہ ہمیشہ رھبان اللیل و فرسان النھار کی مثال رہے ہیں۔مغربی استعمار کے خلاف اہل تصوف ہی نے اصل جدو جہد کی ہے اور وہی قافلہ حریت کے سرخیل رہے ہیں۔اس سرسری مطالعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ تصوف پر بے عملی کا الزام سراسر بے بنیاد ہے البتہ اہل تصوف کسی بھی حال میں انسانی نقطۂ نظر سے غافل نہیں ہوئے۔بے گناہوں کے خون سے انہوں نے ہمیشہ اجتناب کیا اور جہاد وفساد میں واضح طور پر ایک خط فاصل قائم رکھا۔

حوالے وحواشی

۱۔ T.W. Arnold, The Preaching of Islam, Delhi: low-price bublication, 2nd edition, (Reprinted) 1990.

۲۔ شیخ علی ہجویری، کشف المحجوب، اردو ترجمہ: فضل الدین گوہر، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۳۔ صفۃ الصفوۃ، تحقیق: محمود فاخوری، بیروت: دار المعارف ۱۹۸۵ء، ۴:۲۵۵ وما بعدہ

۴۔ تاریخ بغداد، دمشق: دار الفکر، غیر مؤرخ، ۱۰:۱۵۴۔

۵۔ البدایہ والنہایہ، بار اول؛ بیروت: دار المعارف، ۱۹۶۶ء، ۱۰:۴۴۔

۶۔ سیر اعلام النبلاء، بار چہارم؛ بیروت: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۸۸۶ء، ۱۶:۳۱۳،؛
فوات الوفیات، تحقیق: احسان عباس، بیروت: دار صادر، غیر مورخ، ۲:۴۶۷۔

۷۔ ظہر الاسلام، بار سوم؛ قاہرہ: النہضۃ المصریہ، ۱۹۶۶ء، ۴:۲۲۲۔

۸۔ ''ہکذا ظہر جیل صلاح الدین وھکذا اعادت القدس''، ورجینا (امریکہ)، انٹرنیشنل انسٹیوٹ فار اسلامک تھاٹس، ۱۹۹۶ء

9 مرجع سابق

۱۰۔ مرجع سابق، ۱۷۰، ومابعدہ۔

۱۱۔ تاریخ مشائخ چشت، کراچی: احمد برادرز پرنٹرس، ۱۹۸۳ء ۱:۱۴۴،۱۵۶۔

۱۲۔ مرجع سابق، ۱:۱۴۶

۱۳۔ تاریخ ابن خلدون (العبر فی دیوان المبتدو الخبر) بیروت موسسہ العالمی للمطبوعات، غیر مورخ، ۶:۲۲۶۔

۱۴۔ وفیات الاعیان، بیروت: غیر مورخ ۵:۱۸۳۔

۱۵۔ صلاح الدین البطل الانقی للاسلام، ترجمہ: سعید ابوالحسن : دار طلاس، ۱۹۸۸ء، ۱۱۷

۱۶۔ عیون الروضتین فی اخبار الدولتین، دمشق: منشورات وزارت ثقافت، ۱۹۹۲ء ۲: ۱۷۷

۱۷۔ الفتح القسی فی الفتح القدسی، تحقیق: محمد محمود، قاہرہ: الموسسہ العالمیہ للتالیف، ۱۹۶۵ء، ۱۴۵

۱۸۔ خیر الدین زرکلی، الاعلام، بارہشتم؛ بیروت: دار العلم للملایین، ۱: ۱۷۵۔

۱۹۔ دیکھئے: ویکی پیڈیا (عربی) تحت امام شامل

۲۰۔ شیخ شمس الدین عاق شام کے نامور عالم اور صوفی تھے اور سلطان محمد فاتح کے استاذ و مربی تھے۔ انہوں نے بچپن سے ہی سلطان کے ذہن میں یہ بات ڈالنے کی کوشش کی کہ وہ بڑے ہو کر قسطنطنیہ کو فتح کریں اور اس حدیث کا مصداق ہو جائیں جس میں قسطنطنیہ کی فتح کی بشارت اور فاتح اور اس کے لشکر کی تعریف کی گئی ہے۔ شیخ کی پیدائش ۱۳۸۹ء میں دمشق میں ہوئی اور انقرہ میں ۱۴۵۹ء میں انتقال ہوا ان کا شجرۂ نسب خلیفہ اول تک پہنچتا ہے۔

۲۱۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں: لتفتحن القسطنطینہ فنعم الامیر أمیرھا و نعم الجیش جیشھا'' یعنی تم لوگ قسطنطنیہ کو ضرور فتح کرو گے۔ قسطنطنیہ فتح کرنے والا قائد کیا ہی اچھا قائد ہوگا اور اس کا لشکر کیا ہی اچھا لشکر ہوگا۔ اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند میں روایت کیا ہے۔ دیکھئے حدیث رقم ۱۸۱۸۹۔

۲۲۔ ظاہر بیبرس ۱۲۲۱ء میں وسط ایشیاء کے علاقے میں پیدا ہوئے اور بطور غلام مصر میں اپنی شعوری زندگی کا آغاز کیا۔ اور اپنی خداداد حربی و انتظامی صلاحیتوں کی بدولت مصر کے اقتدار اعلیٰ تک پہنچے۔ ۱۲۷۷ء میں انتقال ہوا۔ عین جالوت کی لڑائی میں ملک المظفر قطز کے سپہ سالار تھے اور انہیں کے بعد مصر کے حکمران ہوئے۔ صلیبیوں کے خلاف منصورہ کے معرکے میں بھی شریک تھے۔ عین جالوت، فلسطین میں واقع ایک چشمہ ہے، جس کے قریب میدان میں اسلامی تاریخ کی یہ فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی۔ اب یہ جگہ اسرائیل کے قبضے میں ہے۔

۲۳۔ سیوطی (متوفی: ۱۵۰۸ء) حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ، قاہرہ: عیسی بابی حلبی ۱: ۳۱۵

۲۴۔ شیخ عبدالحلیم محمود (سابق شیخ ازہر) ابوالحسن الشاذلی، الصوفی المجاہد، سلسلہ مشاہیر عرب قاہرہ: ۱۹۵۶ء، ۶۰ و مابعدہ۔

۲۵۔ شذرات الذہب فی اخبار من ذہب، ۵: ۲۷۹۔

۲۶۔ الاسلام وحرکات التحرر العربیہ، بار اول؛ دمشق: دار الرشید، ۱۹۷۶ء ۶۰ و مابعدہ۔ ڈاکٹر شوقی ابوخلیل کی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ مصنف نے حریت پسندوں کے مسلک و مشرب کو بیان نہیں کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس کتاب کے

سرسری مطالعے سے بھی یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ ایشیاء اور افریقہ کے تمام عرب ممالک میں صوفیاء کرام نے ہی آزادی کے پرچم کو بلند کیا اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانیاں پیش کیں۔

۲۷۔ شوقی ابو خلیل، الاسلام وحرکات التحرر العربیہ ، ۴۳-۴۶

۲۸۔ کتاب التاریخ ، قاہرہ، ۱۹۶۵ء۔ یہ کتاب مصر میں فرانسیسی نوآبادیاتی نظام کے خلاف اہل تصوف کے جدوجہد کی ایک معاصر دستاویز ہے۔ مصنف نے بیشتر واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے یہ ایک بے حد اہم اور وقیع کتاب ہے۔

۲۹۔ نفس مرجع، بحوالہ الاسلام وحرکات التحرر العربیہ، ۲۰۔

۳۰۔ الزرکلی، الاعلام، ۵:۲۲۹؛ وعبدالرزاق البیطار، حلیۃ البشر فی تاریخ القرن الثالث عشر، تحقیق: محمد بہجہ البیطار، بار اول؛
بیروت: الدار العلمیہ ،۱۹۸۵ء ۱:۱۰۹۔

۳۱۔ شوقی ابو خلیل: الاسلام وحرکات التحرر العربیہ، ۳۳۔

۳۲۔ عبدالرزاق البیطار، حلیۃ البشر، ۲:۸۰۱۔

۳۳۔ عبداللہ عبدالرزاق ابراہیم، المسلمون والاستعمار الاوربی لافریقیا (مسلمان اور براعظم افریقہ میں یوروپین استعمار)، کویت: سلسلہ عالم المعرفہ نمبر: ۱۳۹ جولائی ۱۹۸۹ء ۲۲۳ ومابعدہ

۳۴۔ کلیات اقبال ، دہلی دعوت آفسٹ پرنٹرز ، ۱۹۹۲: ۱۶۲۔

۳۵۔ مقالہ ڈاکٹر عبدالمنعم قاسمی مراکشی، دیکھئے :www. djelfa.info۔

۳۶۔ نفس مرجع۔

۳۷۔ نفس مرجع۔

۳۸۔ سید ابوالحسن ندوی، اہل تصوف کی دینی جدوجہد در کتاب ''تصوف کیا ہے'' (مرتب منظور نعمانی) لکھنؤ کتب خانہ الفرقان، ۱۹۸۱ء ۱۲۰، ومابعدہ

۳۹۔ دیکھئے: www.etmoureclion.com۔

۴۰۔ عبدالقادر الجزائری، المواقف ،مصر: مطبعۃ الشباب ، ۱۳۴۴ھ۔

۴۱۔ شکیب ارسلان، حاضر العالم الاسلامی، بحوالہ اہل تصوف کی دینی جدوجہد، مرجع سابق

۴۲۔ ویکی پیڈیا (عربی) تحت عبدالکریم خطابی۔

۴۳۔ اشرف الامانی بترجمۃ الشیخ سیدی محمد الکتانی، تالیف محمد باقر الکتانی، بیروت: دار ابن حرم

○○○

مولانا شاہ ہلال احمد قادری

تصوف اور صوفیہ پر اعتراضات کا علمی محاسبہ

ماہ نامہ معارف اعظم گڑھ شمارہ جنوری فروری ۲۰۱۲ء میں جناب پروفیسر الطاف احمد اعظمی کی تحریر ''تصوف کیا ہے؟'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اول نظر میں یہ تحریر ایسی تو نہیں تھی جس کا جواب دیا جاتا، کیوں کہ جو اسکالر تحکمات کے عادی ہوں ان کے سامنے دلائل کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ یہ تحریر معارف کے عام قارئین کے ذہن وفکر میں اکابر دین کے حوالے سے منفی تاثرات پیدا کرنے والی تھی، اس لیے اکابر کی محبت وغلامی نے مجبور کیا کہ ایک وضاحتی تحریر لکھی جائے۔ ''استدراک'' کے نام سے میں نے نہایت عجلت میں ایک تحریر لکھی جو معارف کے مئی میں ہی شائع ہوئی۔ جلد بازی کی وجہ سے بعض پہلو تشنہ رہ گئے تھے اس لیے دوبارہ قلم اٹھانا پڑا۔

اعظمی صاحب کی تحریر تصوف وصوفیہ کے خلاف نفرت انگیزی سے پر ہے۔ جگہ جگہ آیات اور احادیث سے استدلال میں خیانت کی گئی ہے۔ ایک غلط بات ثابت کرنے کے لیے آیات و احادیث سے غلط نتائج اخذ کر کے قارئین کو فریب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطالعے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ صوفیہ کو بے دین ثابت کرنے کی کوئی دلیل بھی دعوی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ استدراک میں موصوف کے فریب ومغالطے کو ہم واضح کر چکے ہیں، یہاں کچھ اور باتیں زیر بحث ہیں:

کیا تصوف دین میں اضافہ ہے؟

قسط اول (معارف رجنوری) میں پروفیسر اعظمی نے دعوی کیا ہے کہ ''تصوف دین میں اضافہ ہے'' دلیل میں یہ آیت کریمہ پیش کی ہے: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا۔ (المائدہ: ۳) اور اس پر حسب ذیل تبصرہ کیا ہے۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اگر کوئی شخص اس دین میں کوئی نئی چیز داخل کرتا ہے تو گویا اپنے اس فعل سے اللہ کے اس قول کی تکذیب کرتا ہے کہ دین مکمل کر دیا گیا ہے۔''

پہلے پوری آیت کریمہ ملاحظہ کیجئے اور پھر داد دیجئے موصوف کے فہم قرآن کی:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (المائدہ: ۳)

ترجمہ: تم پر مرا ہوا جانور اور (بہتا) خون اور سور کا گوشت اور جس جانور پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور چوٹ لگ کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے، یہ سب حرام ہیں، اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں، مگر تم جو (مرنے سے پہلے) ذبح کرلو۔ اور وہ جانور بھی (حرام ہے) جو تھان پر ذبح کیا گیا ہو، اور یہ بھی کہ پانسے سے قسمت معلوم کرو۔ یہ سب گناہ کے کام ہیں۔ آج کافر تمہارے دین سے (دین کے مغلوب ہونے سے) ناامید ہو گئے ہیں تو تم ان سے مت ڈرو (کہ تم پر وہ غالب آجائیں گے) اور مجھ سے ڈرتے رہو۔ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطور دین پسند کیا، ہاں! جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

آیت کریمہ میں حرام وحلال کے مسائل بیان کیے گئے ہیں، اس سے قبل اور بعد کی آیتوں میں بھی حلال وحرام کے مسائل ہیں، جانوروں کی حلت وحرمت کا مسئلہ بتا کر الیوم کہہ کر تکمیل دین کا ذکر فرمایا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ دین کی تکمیل حلت وحرمت کے اعتبار سے ہوئی ہے، تکمیل دین کے ذکر کے بعد پھر اس کی وضاحت فرمائی کہ فاقے کی حالت میں کوئی شدید بھوک سے مجبور ہو کر حرام گوشت کھالے اور اس کا دل اس کی طرف مائل نہ ہو تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اگر کھانے میں اس کو ذرا بھی رغبت محسوس ہوئی تو وہ گناہگار اور قابل مواخذہ ہوگا۔ آیت کریمہ سے واضح ہے کہ اگر یہاں تکمیل دین سے عقیدہ وعمل کے اصول وفروع مراد لیے جائیں تو پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ انبیائے ماسبق کا دین مکمل نہیں تھا، سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا دین تشنۂ تکمیل رہ گیا تھا؟ وَاتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے گویا ناقص اور غیر مکمل دین کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ مزید یہ کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشہور قول کے مطابق اس آیت کریمہ کے نزول کے بعد اکیاسی (۸۱) دن حیات رہے، تقریباً تین ماہ اور اس کے بعد حلت وحرمت سے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا، تو (نعوذ باللہ) آپ اپنے اصحاب کے

ساتھ ترسٹھ سالہ دور نبوت میں ناقص اور نامکمل دین پر رہے، کیا اعظمی صاحب اس کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں؟

حضرت عبداللہ بن عباس کے قول کے مطابق تکمیل دین سے یہاں حلت وحرمت کے مسائل کی تکمیل مراد ہے، ورنہ اسلام بحیثیت دین ہونے کے ازل میں ہی مکمل تھا اور ابد تک مکمل رہے گا، کسی بھی نبی مرسل کے دور میں دین اسلام ناقص ونامکمل نہیں تھا، البتہ شریعتیں بدلتی رہیں یعنی قانون اسلامی میں تبدیلی ہوتی رہی ہے، اور نزول آیت مذکورہ کے وقت پہلے نبی سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام تک حلت وحرمت کے احکام میں تغیر وتبدل کا سلسلہ آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس لیے قدرت کی طرف سے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم سنایا گیا کہ اب حلت وحرمت کے احکام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، حرمت وحلت کے الٰہی فتوی پر آخری مہر لگ چکی ہے۔ یہی تکمیل دین ہے، اور اس مفہوم میں تکمیل دین امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل اور اس کی بڑی نعمت ہے، دوسری امتوں کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوئی۔

رد تصوف میں جناب اعظمی کو احساس نہیں ہوا کہ ان کے انداز بیان اور تعبیر الفاظ سے بات کہاں سے کہاں جا رہی ہے، خود اسلام اور شارع علیہ السلام پر ضرب پڑ رہی ہے، مثلاً ان کی یہ عبارت:

"اسلام ایک مکمل دین ہے اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہیں ہے، نہ فکر کے اعتبار سے اور نہ ہی عمل کے لحاظ سے"

جو دعوی وہ کر چکے ہیں آیت مذکورہ کی روشنی میں اس کے بعد ان کی مذکورہ عبارت کا مفہوم کیا ہوا، کیا نتیجہ ظاہر ہوا ذرا غور کیجئے۔

اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے تک اسلام نہ فکر کے اعتبار سے مکمل تھا نہ ہی عمل کے لحاظ سے۔ پورے قرآن کا نزول ہو گیا، اختتام وحی کو فقط تین ماہ باقی رہ گئے ہیں اور دین حق کی فکری تکمیل نہیں ہو سکی۔ تا آں کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ سے تکمیل دین کا اعلان کیا گیا۔ استغفر اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

دین پہلے سے مکمل تھا، حجۃ الوداع کے موقع پر حلت وحرمت کے اعتبار سے مکمل کر دیا گیا، اب ان ہی اصول کی روشنی میں دین کے فروع اور جزئیات کے استنباط کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ دین کی تفہیم وتشریح لوگوں کو دین سے قریب لانے، دین کے تحفظ اور اللہ تک پہنچنے اور پہنچانے کی تدبیریں مختلف صورتوں میں روبعمل ہوتی رہیں گی۔ ان باتوں کو دین میں اضافہ کہنا کج فہمی ہے۔

احداث فی الدین والی حدیث جو اعظمی صاحب نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نقل کی ہے، اس سے عقائد وایمانیات مراد ہیں، جبریہ، قدریہ معتزلہ اور خوارج اس حدیث کے مصداق ہیں، صوفیہ کے یہاں جو چیزیں ملتی ہیں ان کا تعلق عمل اور نتائج عمل سے ہے، یہاں بھی حدیث بے محل نقل کی ہے۔ تصوف کو دین میں اضافہ قرار دینے میں پروفیسر اعظمی صاحب کو بڑی محنت کرنی پڑی ہے اور اس میں انہوں نے تنکوں کا سہارا لینے کی کوشش کی ہے۔ تنکے بھلا اتنے بڑے ''محقق'' کو کہاں سنبھال سکتے ہیں؟

مقالہ نگار نے اپنے اسی دعوے کے ثبوت میں دارمی کی طویل حدیث ازالۃ الخفا کے حوالے سے نقل کی ہے جس میں حضرت عبداللہ بن مسعود نے تسبیحات (سبحان اللہ، اللہ اکبر) پڑھنے کو بدعت فرمایا۔ وہ روایت جرح وتعدیل کے پیمانے پر کتنی درست ہوتی ہے؟ اس کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس طرح کی روایات قرآن کریم کی ترغیب کثرت ذکر کی آیات سے معارض ہوتی ہیں۔ مذکورہ روایت ایک صحابی کا قیاس ہے انہوں نے اس کے بدعت ہونے کی دلیل میں جو حدیث پیش کی ہے وہ خوارج سے متعلق ہے۔ دیکھئے بخاری جلد اول باب **علامات النبوۃ** **یقرأون القرآن ولایجاوز تراقیھم یمرقون من الدین کمایمرق السھم من الرمیۃ۔** (وہ قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے نکلے ہوئے ہوں گے جس طرح کمان سے تیر نکل جاتا ہے) اور اس باب کی دوسری حدیث میں یہ بھی ارشاد ہوا: **فاینما لقیتموھم فاقتلوھم۔** (ان کو جہاں پاؤ قتل کرو) اس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مخصوص جماعت ہے۔ اس کو ان تابعین یا صحابہ پر منطبق کرنا حضرت عبداللہ بن مسعود کی خطائے اجتہادی ہے۔ ان کو اشتباہ ہوا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے تسبیحات کی تعلیم دی ہے۔ حضرت علی اور حضرت فاطمہ نے جب آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر غلام یا لونڈی کی درخواست کی تو اس کے جواب میں ارشاد ہوا: **ألا ادلکما علی خیر مما سالتماہ، اذا اخذتما مضاجعکما فکبر اللہ اربعا وثلثین وحمدا ثلاثا وثلثین وسبحا ثلثا وثلثین۔** (بخاری جلد اول باب الدلیل علی ان الخمس لنوائب رسول اللہ ﷺ) یعنی جو چیز تم دونوں طلب کر رہے ہو اس سے بہتر میں تم کو بتاتا ہوں، جب بستر پر جانے لگو تو ۳۴ بار اللہ اکبر، ۳۳ بار الحمد للہ اور ۳۳ بار سبحان اللہ پڑھو۔

بخاری جلد دوم باب فضل التسبیح میں تسبیحات کو مزید عام کیا گیا اور تعداد بھی بڑھائی گئی کہ جو شخص ہر روز سو بار سبحان اللہ وبحمدہ پڑھے گا تو اس کے گناہ دھل جائیں گے، اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

ایک طویل حدیث ذکر کی فضیلت میں ہے۔ حدیث کا ضروری حصہ یہ ہے کہ فرشتے اہل

ذکر کی تلاش میں گلیوں میں گھومتے رہتے ہیں، جب وہ لوگوں کو ذکر کرتے ہوئے پاتے ہیں تو دوسرے فرشتوں کو آواز دے کر بلاتے ہیں کہ یہاں آجاؤ۔ پھر آسمان دنیا تک فرشتے ذاکرین کو اپنے پروں میں چھپالیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ میرے بندے کیا کر رہے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں کہ وہ تسبیح و تکبیر اور تحمید و تمجید کر رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کیا انہوں نے مجھ کو دیکھا ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں بخدا انہوں نے تجھ کو نہیں دیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب مجھ کو دیکھ لیں گے تو کیا کریں گے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں، جب وہ تجھ کو دیکھ لیں گے تو اور شدت سے تیری تمجید کریں گے، زیادہ سے زیادہ تیری عبادت کریں گے اور بہت زیادہ تیری تسبیح کریں گے۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے میرے بندے مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ فرشتے جواب دیں گے تجھ سے جنت کے طالب ہیں۔ (دیکھئے بخاری جلد دوم باب فضل ذکر اللہ)

جب صحاح کی احادیث موجود ہوں تو غیر صحاح کی ایک غیر مرفوع روایت کس طرح حجت ہوسکتی ہے؟ بخاری کی آخری حدیث میں جو اوپر نقل کی گئی، تسبیح و تحمید کے مخصوص الفاظ بھی نہیں، تعداد اور وقت کی قید بھی نہیں رکھی گئی ہے، اس کو دین میں اضافہ کہنا بڑی عجیب سی بات ہے۔ اس سے کتاب و سنت کا انکار لازم آتا ہے۔ قرآن کی شہادت حدیث سے بھی افضل ہے۔ منکرین تصوف اس آیت کریمہ کے بارے میں کیا کہیں گے؟ یَا اَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا، وَسَبِّحُوهُ بُکْرَةً وَّ اَصِیلًا۔ (الاحزاب، رکوع: ۲-۴۲-۴۱) (اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو)

پروفیسر اعظمی نے جو روایت نقل کی ہے اس میں فجر کے وقت تسبیح کا ذکر ہے اور مسجد میں لوگ حکم الٰہی کی تعمیل ہی تو کر رہے تھے، دارمی کی حدیث جو ابن مسعود کا اثر ہے، اسی کو صحیح تسلیم کیا جائے تو صحاح کی احادیث مرفوعہ کا انکار لازم آئے گا اور قرآن کی تردید ہوگی۔ قرآن فرماتا ہے کہ ذکر الٰہی کثرت سے کرو۔ جناب اعظمی کہتے ہیں کہ ذکر الٰہی یہ دین میں اضافہ ہے۔ قرآن فرماتا ہے صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو (یعنی سبحان اللہ کہو) جناب اعظمی کہتے ہیں یہ دین میں اضافہ ہے۔ بخاری کی حدیث کے مطابق فرشتے ذکر و تسبیح کرنے والوں کی تلاش میں رہتے ہیں، منکرین تصوف کے خیال میں ملائکہ کا یہ عمل غلط ہوگا کیوں کہ وہ دین میں اضافہ کرنے والے بدعتیوں کی تلاش و تعریف کر رہے ہیں۔

تصوف کے دین میں اضافہ ہونے کی تیسری دلیل وہ ترمذی سے لائے ہیں، حدیث کا ایک ٹکڑا نقل کیا ہے، کوئی حوالہ نہیں، صرف ترمذی لکھ دیا، پوری بحث، ترمذی کے تین ابواب میں پھیلی ہوئی ہے، پروفیسر اعظمی کے دلیل کی حقیقت ملاحظہ فرمایئے:

عن عبداللہ بن مغفل قال سمعنی ابی وانا فی الصلوٰۃ اقول بسم اللہ الرحمن الرحیم فقال: یابنی محدث، ایاک والحدث، قال: ولم ار احدا من اصحاب رسول اللہ ﷺ کان ابغض الیہ الحدث فی الاسلام یعنی منہ۔ وقال صلیت مع النبی ﷺ و مع ابی بکر وعمر ومع عثمان فلم اسمع احدامنھم یقولھا، فلاتقلھا اذاانت صلیت فقل الحمدللہ رب العلمین۔

(سنن ترمذی جلد اول باب ماجاء فی ترک الجھر ببسم اللہ الرحمن الرحیم)

ترجمہ: عبداللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ میرے والد نے مجھ کو نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے سنا تو کہا: اے بیٹے یہ نئی بات ہے اور نئی بات سے بچو۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کے اصحاب میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ اسلام میں نئی بات سے زیادہ کسی چیز کو برا سمجھتے ہوں۔ میں نے رسول اللہ ﷺ، ابوبکر، عمر اور عثمان کی اقتدا میں نماز پڑھی ہے۔ میں نے کسی کو نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کہتے نہیں سنا۔ جب تم نماز پڑھو تو الحمد للہ رب العلمین کہو (بلاتسمیہ)

یہ وہ روایت ہے جو مضمون نگار الطاف احمد اعظمی نے ناقص نقل کی ہے جہاں تک عبارت خط کشیدہ ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ''جس دین میں ذکر الٰہی کے ایک نئے طریقے کو ناپسند کیا گیا وہ ان باتوں کو کیسے پسند کرے گا جو صوفیہ نے ریاضات اور مجاہدات کی غرض سے اس دین میں داخل کردی ہیں۔ یعنی نماز میں بسم اللہ پڑھنا بدعت اور دین میں اضافہ ہے۔

امام ترمذی اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ترجمہ: ابوعیسیٰ کہتا ہے کہ عبداللہ بن مغفل کی حدیث حسن ہے اور اسی پر اکثر اہل علم اصحاب رسول ﷺ کا عمل ہے یعنی ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کا اور ان کے بعد کے تابعین کا اسی پر عمل ہے۔ یہی قول سفیان ثوری، ابن مبارک، احمد اور اسحٰق کا ہے۔ یہ لوگ نماز میں باآواز بلند بسم اللہ پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ نمازی بسم اللہ اپنے دل میں کہے۔

امام ترمذی نے واضح کردیا کہ یہ مسئلہ بدعت اور احداث فی الدین کا نہیں ہے بلکہ فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۂ فاتحہ سے پہلے جہری نمازوں میں بلند آواز سے پڑھی جائے یا نہ پڑھی جائے؟ باب کی مناسبت سے بالجہر بسم اللہ نہ پڑھنے کی حدیث روایت کی اور صحابہ وتابعین کا عمل بتایا۔ یہ بھی واضح ہوا کہ یہاں پر اعتراض بسم اللہ پڑھنے پر نہیں ہے بلکہ زور سے پڑھنے پر ہے جب ہی تو عبداللہ بن مغفل کے والد نے ان کو روکا اور اس کو احداث فی الاسلام سمجھا۔ عبداللہ بن مغفل کے والد کا خیال حجت نہیں ہوسکتا کیوں کہ اس مسئلے پر ان کو دیگر اصحاب کی

رائے معلوم نہیں تھی۔ تیسرے باب کی حدیث اس مسئلے کو مزید واضح کرتی ہے۔

عن ابن عباس قال کان النبی ﷺ یبدا صلوتہ ببسم اللہ الرحمن الرحیم۔

(باب من رای الجھر بسم اللہ الرحمن الرحیم)

ترجمہ: عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اپنی نماز بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ساتھ شروع کرتے تھے۔

امام ترمذی کی وضاحت ملاحظہ کیجئے:

ترجمہ: ابوعیسی کہتا ہے اس حدیث کی اسناد ویسی قوی نہیں ہے اور بسم اللہ زور سے کہنے کی بات کئی اہل علم صحابہ کا قول ہے، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر ہیں اور ان کے بعد کے تابعین ہیں۔ یہ لوگ نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم جہر سے پڑھنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ یہی قول امام شافعی، اسمٰعیل بن حماد جو ابن ابی سلمان ہیں اور ابو خالد والبی کا ہے۔ ابو خالد کا نام ہرمز ہے اور وہ کوفی ہیں۔

عبداللہ بن مغفل کے والد نے نماز میں بالجہر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے کو احداث فی الدین سمجھا، اس مسئلے میں ان کو اشتباہ ہوا اور اعظمی صاحب نے اسی کو دلیل بنا کر صوفیہ پر دین میں اضافے کا الزام عائد کیا ہے لیکن امام ترمذی کی دوسری روایت اور ان کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ "بدعت" "احداث فی الدین" اور دین میں اضافہ کے مرتکب (نعوذ باللہ) حضرت ابو ہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے اصحاب بھی ہیں اور ائمہ اربعہ میں ایک جلیل القدر امام فقہ، امام شافعی بھی۔ اعظمی صاحب یا تو اصحاب رسول اور امام شافعی کو بھی بدعتی اور دین میں اضافہ کرنے والا قرار دیں یا اپنے مہمل دعوے سے دست بردار ہو جائیں۔ امام ترمذی نے یہ بحث یہیں پر ختم نہیں کی ہے: **باب فی افتتاح القرأۃ بالحمد للہ رب العلمین** میں حدیث باب نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

ترجمہ: امام شافعی نے فرمایا کہ یہ حدیث کہ نبی ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر وعثمان **الحمد للہ رب الغلمین** سے قرأت شروع کرتے تھے، اس کا معنی یہ ہے کہ سورہ کی قرأت سے پہلے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی نہیں پڑھتے تھے۔ امام شافعی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے قرات شروع کرنا اور جہری نمازوں میں بسم اللہ زور سے پڑھنا جائز سمجھتے تھے۔

اس تفصیل سے قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اعظمی صاحب نے بات کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، وہ جس چھری سے اہل تصوف کو ذبح کرنے چلے تھے، وہ چھری کئی جلیل القدر اصحاب رسول اور

ائمہ فقہ کے گلوں تک پہنچ رہی ہے۔صوفیوں کے خلاف ان کے دعویٰ کی تیسری دلیل بھی باطل ہوئی۔

کیا صوفیہ غلوفی الزہد کے شکار ہیں؟

اعظمی صاحب نے تصوف اور صوفیوں کو زہد میں غلو سے متہم کیا ہے۔چنانچہ ''غلوفی الزہد'' کے عنوان کے تحت وہ لکھتے ہیں:

''کوئی عمل بذات خود کتنا اچھا ہولیکن اگر وہ اعتدال کے دائرے سے باہر نکل جائے تو ناپسندیدہ بن جاتا ہے۔دیکھیں کہ عیسائی رہبان نے محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے رہبانیت کا راستہ اختیار کیا لیکن اس کے باوجود، اللہ نے ان کے اس فعل کو ناپسند کیا۔قرآن کے الفاظ ہیں: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ (الحدید:۲۷)

غلوفی الزہد کے الزام کی دلیل میں موصوف نے سورۂ حدید کی مذکورہ آیت پیش کی ہے۔ ان کی اس دلیل پر ہم نے ''استدراک'' میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

اس بحث پر پھر ایک نظر ڈالیں اور سورۂ حدید کی آیت مذکورہ کا آخری جملہ دیکھیں:

فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ۔ (الحدید:۲۷) ''تو ان لوگوں کو ہم ان کا اجر دیں گے جو راہبوں میں ایمان والے ہیں اور ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں۔''

قارئین غور کریں، آیت مذکورہ کی آخری عبارت سے واضح ہو رہا ہے کہ رہبانیت اختیار کرنے والے جو نصاریٰ، رہبانیت پر قائم نہیں رہ سکے وہ ایمان سے پھرے ہوئے لوگ تھے، اس کے علاوہ دوسری اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھے۔جو نصاریٰ رضائے الٰہی کے لیے ایمان کے ساتھ رہبانیت پر قائم رہے ان کو اللہ تعالیٰ نے اجر کا مستحق قرار دیا ہے۔قارئین کی مزید سہولت کے لیے سورۂ حدید کی پوری آیت کا ترجمہ ہم یہاں نقل کر دیتے ہیں:

''اور ہم نے ان ہی (ابراہیم ونوح وغیرہ) کے نقش قدم پر اپنے (دوسرے) رسولوں کو چلایا، پھر ان کے بعد عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور ان کو انجیل عطا کی اور ان کے متبعین کے دلوں میں رافت ورحمت رکھی اور رہبانیت، اس کو انہوں نے خود اختیار کر لیا مگر اللہ کی خوشنودی کے لیے (اختیار کیا) ہم نے ان پر فرض نہیں کیا تھا تو وہ اس کی رعایت کا حق ادا نہیں کر سکے (رضائے الٰہی کے لیے اپنی ہی منتخب کردہ راہ پر قائم نہیں رہ سکے) تو ہم ان راہبوں میں ایمان والوں کو ان کا اجر عطا کریں گے اور ان میں اکثر لوگ فاسق ہیں۔ (ایمان اور حسن عمل سے دور ہیں)۔''

آیت مبارکہ سے تین نکتوں کا انکشاف ہوا:

(الف) رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے ابتداع جائز ہے، یعنی کوئی بھی ایسا طریقہ

اختیار کیا جا سکتا ہے جو سلف کا معمول بہا نہیں ہے۔

(ب) رضائے الٰہی جیسے مقصد عظیم کے حصول کے لیے دنیا اور آسائش دنیا کا ترک جائز ومباح ہے۔

(ج) رضائے الٰہی کے لیے ایمان، حسن عمل اور ورع وتقویٰ کے ساتھ دنیا و مافیہا سے کنارہ کش رہنے والے مستحق اجر ہیں۔

اس کی تائید میں ہم نے استدراک میں بخاری اور ترمذی کی حدیثیں نقل کی ہیں، یہاں بھی حجت تمام کرنے کے لیے دو حدیثیں نقل کرتے ہیں:

۱۔ عن ابی سعید الخدری جاء اعرابی الی النبی ﷺ فقال یارسول اللہ ای الناس خیر؟ قال رجل یجاھد بنفسه و ماله و رجل فی شعب من الشعاب یعبد ربه و یدع الناس من شره۔ (صحیح البخاری، باب العزلة راحة من خلاط السوء)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس نے پوچھا: یارسول اللہ! سب سے اچھا کون شخص ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ شخص جو اپنے جان و مال سے راہ حق میں جہاد کرے اور وہ شخص جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دے ان کے شر کی وجہ سے۔

اس حدیث سے معاشرتی زندگی کو ترک کر کے، انسانوں کو آبادی سے دور رہ کر عبادت کرنے کا جواز ظاہر ہو رہا ہے اور بخاری نے جس عنوان سے باب باندھا ہے وہ بھی منکرین تصوف کے لیے قابل غور ہے: (العزلة راحة من خلاط السوء)

''برائیوں سے بچنے کے لیے عزلت گزینی میں راحت ہے''

۲۔ عن ابی ھریرة قال قال رسول اللہ ﷺ ستکون فتن، القاعد فیھا خیر من القائم، والقائم فیھا خیر من الماشی والماشی خیر من الساعی من تشرف لھا تستشرفه فمن وجد فیھا ملجأ او معاذا فلیعذ به۔ (بخاری، ۲ر باب الفتن)

ترجمہ: ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عنقریب فتنے ہوں گے۔ اس زمانے میں بیٹھنے والا کھڑا رہنے والے سے بہتر ہوگا اور کھڑا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا لپکنے والے سے بہتر ہوگا۔ جو شخص فتنہ پر غالب آنا چاہے گا تو فتنہ اس پر غالب آ جائے گا، جو شخص اس وقت کوئی ٹھکانا اور پناہ پائے وہ پناہ لے لے۔

سورۂ حدید اور احادیث بخاری سے ثابت ہو گیا کہ ترک دنیا اور گوشہ نشینی غلو فی الزھد نہیں ہے۔

اعظمی صاحب کی دوسری دلیل بخاری کی حدیث ہے۔حدیث طویل ہے مختصراً یہ کہ صحابہ کی ایک جماعت گفتگو کررہی تھی۔بعض صحابہ نے کہا کہ وہ عمر بھر روزے رکھیں گے اور کبھی ناغہ نہیں کریں گے۔ایک نے کہا وہ ساری رات نماز پڑھیں گے،سوئیں گے نہیں۔کسی نے کہا کہ وہ عورتوں سے دور رہے گا نکاح نہیں کرے گا۔ان لوگوں کی باتیں سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:انتم القوم الذین قلتم کذاو کذا؟واللہ انی لاخشاکم للہ و اتقاکم لہ، لکنی اصوم وافطر،واصلی وارقد،واتزوج النساء فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

تم ہی وہ لوگ ہو جو اس قسم کی باتیں کررہے تھے؟ بخدا میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ اللہ کی نافرمانی سے بچنے والا ہوں،مگر میں روزے بھی رکھتا ہوں (روزہ چھوڑ بھی دیتا ہوں) اور نماز پڑھتا ہوں اور (راتوں کو) سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔جو میرے طریقے سے اعراض کرے وہ میری جماعت سے نہیں ہے۔

حدیث نقل کرنے کے بعد اعظمی صاحب نے صوفیہ کے بارے میں جو ''کلمات خیر'' ارشاد فرمائے ہیں،وہ ملاحظہ فرمایئے:

''قرآن اور نبی کی واضح تعلیمات کے باوجود صوفیہ نے رہبانیت کی راہ اختیار کی اور عیسائی رہبان کی طرح عبادت میں غلو کیا،ایک بزرگ بیس سال تک مستقل کھڑے رہے،صرف نماز میں تشہد کے لیے بیٹھتے تھے،سری سقطی، ایک بڑے عبادت گذار بزرگ گزرے ہیں وہ اٹھانوے برس تک زندہ رہے اور کہا جاتا ہے کہ سوائے مرض الموت کے کبھی نہیں لیٹے''

اولاً تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ جن بزرگوں کے بارے میں جناب اعظمی نے کشف المحجوب اور احیاء العلوم کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے؟ جب قرآن و حدیث پیش کرنے میں وہ خیانت کی جرأت کرسکتے ہیں تو صوفیہ کی کتابوں کے حوالے میں خیانت کرنا واجب سمجھتے ہوں گے۔بیس سال تک کسی انسان کا کھڑا رہنا اور اٹھانوے برس تک کی مدت بغیر لیٹے گزار دینا طاقت بشری سے باہر ہے۔ یا تو کتاب کی عبارت کا مفہوم کچھ اور ہوگا یا اعظمی صاحب نے اپنے مطلب کے مطابق ترمیم کرلی ہوگی۔صرف تشہد میں بیٹھنے کا مطلب تو یہ ہے کہ روزانہ صبح سے رات تک کی فرض واجب نمازوں میں لگاتار بیٹھنا لازم آئے گا۔سنن اور نوافل اس کے علاوہ ہیں۔فرائض وواجبات میں روزانہ گیارہ بار بیٹھنے والا،بیس سال کی مدت میں کتنی بار بیٹھے گا؟اس کو بیس سال تک مستقل کھڑے رہنا کیسے کہا جائے گا؟

بخاری کی حدیث مذکورہ سے اعظمی صاحب،صوفیہ کا غلوفی الزہد ثابت کرنا چاہتے ہیں، حالاں کہ ان کا دعویٰ اس دلیل سے بھی ثابت نہیں ہورہا ہے: کیوں کہ خود قرآن ایسے اصحاب

رسول کی مدح فرما رہا ہے جو راتوں کو سوتے نہیں تھے، ساری رات دعا، استغفار و مناجات اور عبادتوں میں مشغول رہتے تھے۔ سورۂ سجدہ کی آیت کریمہ ملاحظہ کیجئے: تَتَجَافٰی جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ۔ (السجدہ:۱۶) یہ لوگ بستروں سے اپنے پہلو الگ رکھتے ہیں اور اپنے رب سے خوف وطمع کے ساتھ دعا کرتے ہیں اور جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے (راہ حق) میں خرچ کرتے ہیں۔

یہ بات یاد رہے کہ سورۂ سجدہ مکے میں نازل ہوئی ہے اور بخاری کی حدیث کا تعلق مدینہ سے ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حدیث میں عام لوگ مراد ہیں اور بر بنائے شفقت یہ بات کہی گئی ہے۔ لفظ ''عام'' سے ہوسکتا ہے ناقد تصوف کی رگ اعتراض پھڑ کنے لگے، تو یہ عرض کروں کہ عام سے جماعت صحابہ کے عوام مراد ہیں نہ کہ غیر صحابہ کے عوام، اصحاب رسول میں عوام وخواص کی تقسیم خود قرآن سے ہی ثابت ہے۔

متواتر روزہ رکھنے سے متعلق بخاری جلد:۲ رکتاب الاعتصام ''باب مایکرہ من التعمق و التنازع والغلو فی الدین والبدع لقوله یااهل الکتاب لاتغلوفی دینکم و لاتقولوا علی الله الاالحق'' میں ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متواتر روزہ رکھنے کو (یعنی بغیر سحری کھائے صوم وصال رکھنے کو) منع فرمایا۔ اصحاب نے عرض کی کہ آپ بھی تو صوم وصال رکھتے ہیں؟ تو جواب میں آپ نے فرمایا: انی لست مثلکم انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی۔ یعنی میں تمہارے جیسا نہیں ہوں، مجھ کو تو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے۔ امام بخاری نے غلو فی الدین والبدع کا باب قائم کیا ہے لیکن حدیث میں غلو وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہاں بھی شفقت ورحمت کی بنا پر صحابہ کو منع کیا گیا۔ اگر یہ غلط ہوتا یا زہد میں غلو ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کیوں رکھتے؟ جب اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو دین میں غلو سے منع فرما رہا ہے تو دین میں غلو مرضی الٰہی کے خلاف ہے، لیکن سورۂ سجدہ کی آیت مذکورہ میں رات بھر بیدار رہ کر عبادت کرنے والوں کی مدح فرماتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ باتیں غلو کے زمرے میں نہیں آتی ہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ عبادت اور زہد میں کوئی غلو نہیں ہے۔ غلو ہوگا تو رہبانیت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتا اور اس پر سطور ماسبق میں گفتگو کی جاچکی۔ عبادت میں غلو یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ عبادت ہونے لگے اور کثرت ذکر وعبادت ہر حال میں رضائے الٰہی کا سبب ہے۔ زہد وعبادت میں اعتدال پسندی اور غلو کا ذکر اور اس کی ممانعت نہ کہیں قرآن کریم میں وارد ہے نہ حدیث شریف میں۔ یہاں پر شاید قارئین کے ذہن میں یہ آیت کریمہ آئے:

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ۔ (النساء:۱۷۱) اے اہل کتاب! دین میں غلو نہ کرو۔

تو یہ حکم یہود و نصاریٰ کے متعلق ہے، مسلمانوں کے بارے میں کہیں ایسی آیت کریمہ ہوتو منکرین تصوف ضرور بتائیں۔ اہل کتاب کا غلو کیا تھا؟ بعد کی آیت میں واضح ہے: وَ لَا تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ۔ (النساء:۱۷۱) اور اللہ کے بارے میں حق کہو۔ وہ اللہ کے بارے میں کہتے تھے: اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ۔ (المائدہ:۷۳) اللہ تین کا تیسرا ہے۔ یعنی خدا تین ہیں، اللہ، عیسیٰ بن مریم اور روح القدس۔ صوفیوں کا دامن ایسی آلائشوں سے پاک ہے۔

بخاری کی جو حدیث اعظمی صاحب نے پیش کی ہے، اس سلسلے میں قارئین کو ایک بنیادی مسئلہ سمجھ لینا چاہیے کہ نبی، امت کی تعلیم میں امت کی اکثریت کی رعایت کرتے ہیں، اور اکثریت عوام پر مشتمل ہوتی ہے، خواص ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، خواص کی رعایت کی جائے تو عوام مسلمین کے لیے مشکل پیش آئے گی۔ فرائض و واجبات تو سب کے لیے برابر ہیں لیکن اعمال نافلہ میں عام لوگوں کی رعایت ضروری ہے اور یہی سبب ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمول کی زندگی پر فقر کی زندگی کو ترجیح دی، کیوں کہ اہل ثروت کی تعداد کم ہوتی ہے۔ لوگ یہ سمجھ لیتے کہ خشیت الٰہی اور تقویٰ کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے صحابہ کی جماعت کے سامنے یہ بات کہی گئی تا کہ لوگ بیداری، صوم وصال اور تجرد کو ہی تقویٰ و خشیت کا معیار نہ سمجھ لیں۔ یہی آپ کا طریقہ اور سنت ہے جس سے اعراض کی اجازت نہیں۔ ازدواجی تعلقات اور معتاد طریقۂ عبادت سے بھی اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہو سکتا ہے۔ بہت سے صوفیوں نے شادیاں کیں اور بعض نے کئی نکاح کیے۔ جن صوفیوں نے تجردگی کی زندگی گزاری انھوں نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کو کبھی نکاح سے نہیں روکا۔ خود ان کا نکاح نہ کرنا، ان کی ذاتی اور داخلی زندگی کا مسئلہ ہے اور اس کا کوئی بھی سبب ہو سکتا ہے۔ حدیث میں ان لوگوں کو روزہ رکھنے کی تلقین کی گئی ہے جو نکاح کی استطاعت نہیں رکھتے یعنی اپنے اہل کی کفالت نہیں کر سکتے۔ یہاں پر یہ بات غور طلب ہے کہ ایک آدمی مالی مسئلے کی وجہ سے نکاح جیسی سنت سے محروم ہے اور اس کا شمار تارک سنت میں نہیں ہوتا اور ایک آدمی اس لیے نکاح نہیں کر رہا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ ازدواجی تعلقات میں پڑ کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عبادت سے غافل ہو جائے گا، منکرین تصوف اس کو تارک سنت اور تعلیمات نبوی کا مخالف قرار دینے پر بضد ہیں۔ وَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ۔ (البقرۃ:۱۶۵) کے مطابق ایسے جذبے کا دل میں پیدا ہونا طبائع انسانی سے بعید تو نہیں ہے؟ آخر جہاد میں محبت الٰہی کا جذبہ ہی تو جان دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ ایسے مغلوب المحبۃ بندوں کو ہدف لعنت و ملامت بنانا دراصل حب الٰہی کا استہزا ہے۔ کاش منکرین تصوف، ذات باری جل شانہ کے مقام کو سمجھ لیتے تو محبت الٰہی کے استہزا کے وبال میں نہ پڑتے۔ وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی، فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی (النازعات:۴۱-۴۰)

غلو فی التوکل کا الزام

غلو فی الزہد کے زیر عنوان، ناقد تصوف نے توکل پر بھی طویل گفتگو کی ہے اور حسب عادت اہل تصوف کو مطعون کیا ہے، مثلاً یہ لکھا ہے:

''توکل کے معاملے میں بھی بہت سے صوفیا نے غلو کیا ہے اور اسباب وتدابیر کی نفی ہے۔''

اہل تصوف میں حضرت جنید بغدادی، امام غزالی، شیخ صدرالدین، ذوالنون مصری، حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کے اقوال توکل کے متعلق پیش کر کے حسب ذیل رائے ظاہر کی ہے۔

''اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ صوفیا نے بعض سے قطع نظر، زہد و توکل کے نام سے رہبانیت یعنی ترک دنیا کی تعلیم دی جس سے اسلام کے تعبدی نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ انھوں نے ریاضات اور مجاہدات کے نام سے ایسے اعمال واوراد اختراع کیے جن کا اسلامی شریعت میں کوئی وجود نہیں، نہ عہد نبوت میں اور نہ ہی اس کے بعد کسی صحابی نے اس طرح کے اعمال واوراد سے کبھی کوئی شغف رکھا۔ ان اصحاب رسول کے یہاں بھی ان چیزوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا جو زہد و عبادت میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔''

''یہ تعبدی اضافات محض اس لیے غلط نہیں ہیں کہ رسول اللہ نے ان کی تعلیم نہیں دی ہے اور صحابہ ان باتوں سے ناواقف تھے، بلکہ اس وجہ سے بھی غلط ہیں کہ وہ غلو پر مبنی اور نفس کشی کے مترادف ہیں۔ انہوں نے کھلے طور پر قرآن اور نبی کی تعلیمات سے انحراف کیا ہے اور اپنے اعمال سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درج ذیل ارشاد کی تردید کی ہے: **لاتشددوا علی انفسکم فشدد علیکم فان قوما شددوا علی انفسھم فشدد اللہ علیھم، فتلک بقایا ھم فی الصوامع والدیار، رھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنھا علیھم**''

توکل کے معاملے میں پروفیسر اعظمی نے حسب عادت الجھی ہوئی باتیں کی ہیں۔ سیدھا اور آسان طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے توکل فی الرزق میں تدبیر و اسباب کی شرط کا لازم ہونا کتاب وسنت سے ثابت کرتے جو ان کا اور ان کے ہم خیالوں کا نظریہ ہے۔ اس کے بعد صوفیہ کے موقف کو ظاہر کر کے اپنے مذاق ومعیار کے مطابق صوفیوں پر لعنت وملامت کرتے۔ اس کے برعکس انھوں نے اپنے نظریے پر کوئی دلیل نہیں پیش کی، نہ قرآن سے نہ حدیث سے، بات کو الجھا کر چھوڑ دیا۔ موصوف کی عبارت سے ان کا نظریہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کوشش وتدبیر کے رزق نہیں دیتا۔ پہلے آدمی کوشش وتدبیر کرے اس کے بعد اللہ پر توکل کرے، یا یہ کہ بغیر کوشش وتدبیر کے رزق کی امید اللہ تعالیٰ سے رکھنا توکل میں غلو ہے۔ صوفیوں کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر تدبیر و کوشش کے بھی رزق دینے پر قادر ہے۔ قارئین غور کریں پروفیسر اعظمی جس عقیدے کو لوگوں

پر مسلط کرر ہے ہیں وہ اسلامی عقیدہ کیا ہوگا اس سے تو اللہ تعالیٰ کے قدرت و اختیار کی نفی ہو رہی ہے۔ صوفیوں نے تو اپنے موقف پر دلیل پیش کی اور وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (الھود:٦) سے استدلال کیا۔ بغیر کوشش و تدبیر کے رزق حاصل کرنے کی واضح مثال اہل صفہ ہیں، جو حضرت ابو ہریرہ کے ارشاد کے مطابق اضیاف الاسلام تھے۔ وہ اسباب و تدبیر سے دست بردار ہو کر صفہ پر بیٹھ گئے تھے۔ اہل تصوف کے نزدیک ''توکل خالص'' کی یہ مثال موجود تھی۔ قرآن کا یہ ارشاد: وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا، وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ۔ (الطلاق:٢) بھی اہل تصوف کے پیش نظر رہا لیکن پروفیسر موصوف اپنے موقف پر کوئی دلیل نہیں پیش کر سکے بلکہ ان کے نظریے سے توحید پر ضرب پڑتی ہے، معاذ اللہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو رزق دینے میں بندوں کی کوشش و تدبیر کا پابند ہو۔ بغیر کوشش اوز اسباب کے رزق ملنے کی دلیل خود قرآن حکیم میں موجود ہے، منکرین تصوف کے کتمان حق سے حقیقت نہیں چھپ سکتی۔ کلام پاک کی یہ آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیے:

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (آل عمران:٣٧)

زکریا جب کبھی عبادت گاہ میں ان کے پاس جاتے تو ان کے پاس کھانا پاتے (یہ کیفیت دیکھ کر ایک دن) مریم سے پوچھنے لگے، یہ کھانا تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے؟ وہ بولیں: خدا کے یہاں سے آتا ہے۔ بے شک خدا جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔

توکل میں غلو کا الزام بھی پروفیسر اعظمی ثابت نہیں کر سکے۔ ان کا دعویٰ بلا دلیل قابل اعتنا نہیں، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسب کی فضیلت بیان کی۔ حصول رزق کی جدوجہد کو کار ثواب فرمایا۔ محنت کی کمائی کو اہمیت دی ہے۔ بعض اصحاب مہاجرین کو روزی حاصل کرنے کے لیے اسباب مہیا فرمائے۔ حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ عام لوگوں کے لیے اس درجہ توکل پر قائم رہنا مشکل ہے جس توکل پر انبیائے کرام اور خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فائز رہے اور آپ کے خاص اصحاب اہل صفہ قائم تھے اور جس طرح بعض صوفیہ قائم رہے۔ اس لیے کسب معاش عوام کے لیے ضروری ہے کیوں کہ معاش چھوڑ دینے سے مسلمانوں کی نہ صرف اجتماعی زندگی متاثر ہوگی بلکہ معیشت پر گہرا اثر پڑے گا، جب کہ خواص کے اس توکل پر قائم رہنے سے اجتماعی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا اور وہ اس توکل پر عزیمت کے ساتھ قائم رہ سکتے ہیں۔

علی الصباح چو مردم بہ کار و بار روند
بلاکشان محبت بہ کوئے یار روند

اعظمی صاحب کا یہ خیال کہ: ''صوفیہ کے اوراد واذکار، ریاضات ومجاہدات نفس سے اسلام کے تعبدی نظام کو سخت نقصان پہنچا'' بالکل خلاف واقعہ ہے، بلکہ منکرین تصوف کے نظریے سے صورت حال اس کے برعکس ہوگئی۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد یادالٰہی سے غافل ہوگئی، اذکار وتسبیحات، نوافل ومستحبات چھوڑ کر بیٹھ گئی اور اس کو غیر ضروری چیز سمجھ لیا۔ نوافل واذکار چھوڑ دینے کی بے برکتی ایسی بڑھی کہ سنن موکدہ کی اہمیت بھی ختم ہوگئی۔ حرمین شریفین میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ تلاوت قرآن حکیم جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَلَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ۔ (البقرة:۱۲۱) وہ تلاوت بجائے عبادت کے اسٹڈی اور مطالعہ بن گئی۔ کلام اللہ کا احترام دلوں سے نکل گیا۔ ان نظریات نے نہ صرف رسول اکرم ﷺ کی عظمت مجروح کی بلکہ قرآن کریم اور دیگر غیر دینی کتب کے درمیان بلحاظ ادب واحترام کوئی فرق باقی نہیں رکھا۔ قرآن کریم کو پیروں اور جوتوں کے پاس رکھنا بلکہ قرآن کی طرف بلا تکلف پیر پھیلانا، حرمین شریفین میں ہر شخص ملاحظہ کرسکتا ہے۔ یہ وہی لوگ کر رہے ہیں جو صوفیہ کو غالی فی الدین ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔ صوفیۂ کرام کے زہد وتوکل اور ان کے اذکار و نوافل سے اسلام کے تعبدی نظام میں کوئی خلل نہیں پڑا، نوافل کا استحباب اپنی جگہ ہے، فرائض و واجبات اپنے مقام پر ہیں، بلکہ صوفیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوا، عبادت کا ذوق وشوق بڑھا، ذکر الٰہی میں لوگوں کو لذت محسوس ہونے لگی، تعلق مع اللہ کی ڈور مضبوط ہوئی، عبادت، منکرین تصوف کی طرح صرف ادائے رسم نہیں رہی، دل کی آواز بن گئی، روح کا تقاضا ہوگئی۔ صوفیوں کی زاہدانہ زندگی تعلیم نبوی کی عملی صورت ہے۔ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم اجنبی ہو یا کوئی مسافر۔ اس کے برعکس منکرین تصوف امت مسلمہ کو ''بابر بہ عیش کوش کہ دوبارہ نیست'' کی تعلیم دے رہے ہیں۔

کیا سواداعظم شرک میں مبتلا ہے؟

پروفیسر موصوف اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ''آج مسلمانوں کا سواداعظم اسی شرک میں مبتلا ہے اور اس کے ذمہ دار دنیا پرست صوفیہ اور تصوف کے حامی علما ہیں۔'' (معارف فروری ۱۲) اور موصوف یہ حدیث بھول جاتے ہیں: ان اللہ لایجمع امتی ام قال امة محمد علی ضلالة ویداللہ علی الجماعة ومن شذشذ الی النار۔ (ترمذی، باب لزوم الجماعة) اللہ میری امت کو یا یہ فرمایا: امت محمد کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا۔ (یعنی امت کا سواداعظم گمراہ نہیں ہوگا) اور جماعت پر اللہ کی حمایت کا ہاتھ ہے۔ جو اس سے علاحدہ ہوا وہ جہنم میں ڈالا گیا۔

علیکم بالجماعة وایاکم و الفرقة۔۔۔من اراد بحبوحة الجنة فلیلزم

الجماعۃ۔ (ترمذی، باب لزوم الجماعۃ) تم پر جماعت کا اتباع لازم ہے اور تفرقہ پھیلانے سے بچو۔ جو شخص جنت میں جانا چاہے اس پر جماعت کا اتباع لازم ہے۔

مگر اعظمی صاحب کو ایسی حدیثیں کیوں یاد آنے لگیں۔ وہ اپنی ''شرذمہ قلیلہ'' کے ساتھ ہر ایسے خیر کے مخالف ہیں جس پر امت کا سواد اعظم عامل ہے۔ سواد اعظم سے الگ ہو کر اور اس کے مخالف ہو کر وہ اور ان کی جماعت کے معدودے چند من شذ شذ فی النار کے مصداق بنتے ہیں۔

اعتبار مقصد کا ہوتا ہے

اعظمی صاحب نے صوفیوں کے زہد اور ترک دنیا کو خودکشی کے مترادف قرار دیا ہے۔ ان کی وہ عبارت ملاحظہ کیجئے جو ہم نے گذشتہ سطور میں نقل کی ہے۔ اس طرح کی سطحی اور مضحکہ خیز باتیں وہ جہلا کے درمیان کہتے تو ان کی واہ واہ ہوتی لیکن بدقسمتی سے ان کی باتیں اہل علم تک پہنچ گئیں۔ اعظمی صاحب کے ''اقوال زریں'' سے یہ نتیجہ نکلا کہ کوئی دینی عمل غلو کی حد سے متجاوز ہو جائے اور خودکشی کے مترادف ہو تو اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اس نتیجے کے مطابق کوئی ایسا دینی عمل جو خودکشی اور ہلاکت کے مترادف ہی نہیں بلکہ فی الواقع اس میں ہلاک ہو تو اس کو بدرجہ اولیٰ چھوڑ دینا چاہیے۔ جہاد ایک ایسا دینی عمل ہے جس میں ہلاکت کا محض اندیشہ نہیں، یقین ہوتا ہے۔ مجاہد مرنے کی تمنا لے کر ہی جاتا ہے۔ کیا اس کو بھی چھوڑ دینا چاہیے؟ جب کہ صوفیوں کے بارے میں تاریخ نے ایسی اطلاع نہیں دی ہے کہ صوفیوں کی جماعت کا کوئی ایک فرد فقر و فاقہ، زہد و تقویٰ اور کثرت قیام و سجود سے مر گیا ہو۔

اصلا اعتبار مقصد کا ہوتا ہے، مقصد بلند ہو، نیت درست ہو تو حصول مقصد میں سود و زیاں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ عشق الٰہی اور محبت ازلی کا فلسفہ خوارج کی سمجھ میں آیا ہے نہ آئے گا۔ عشق الٰہی میں صوفیہ سوختہ دل، زبان حال سے کہتے ہیں:

اے دل تمام نفع ہو سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

لقمان را حکمت آموختن

توکل پر خامہ فرسائی کے بعد پروفیسر اعظمی صاحب نے عنان قلم توحید کی طرف موڑا ہے اور غلو فی العقیدہ کا عنوان قائم کر کے توحید کی وضاحت فرمائی ہے۔ یعنی بمصداق ''لقمان را حکمت آموختن'' صوفیہ کو توحید کا مسئلہ بتایا ہے۔ یہ بھی آثار قیامت سے ہے۔ جو شخص عالم تکوین کی تمام جاندار و غیر جاندار چیزوں کو وجود میں باری تعالیٰ کا سہیم و شریک ٹھہرائے وہ دوسروں کو توحید کا مسئلہ بتا رہا ہے۔ اس دعوے پر تین دلیلیں پیش کی ہیں۔ سورۂ اخلاص، سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۱۱،

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۵۔ تمہیدی عبارت حسب ذیل ہے:

''صوفیا نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اسلام میں رہبانیت کے تصور کو فروغ دیا جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر ہوا، بلکہ اس کی بنیادی فکر توحید الوہیت کے مفہوم میں بھی حذف و اضافہ کیا، یہ حذف و اضافہ رہبانیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، کیوں کہ بنیاد کے مخدوش ہو جانے کے بعد عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔''

''قرآن مجید میں توحید کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات وصفات اور اختیارات وقدرت میں واحد و یکتا ہے، کوئی اس کے برابر کا نہیں، وہ حسب ونسب سے پاک ہے اور وہی اپنے بندوں کا اکیلا حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔''

توحید کی اس سے زیادہ بہتر وضاحت شیخ اکبر نے کی ہے۔ استدراک میں شیخ کی پوری عبارت موجود ہے۔ پروفیسر موصوف نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا ہے۔ ان کا اصل مقصد مسئلۂ توحید بیان کرنا نہیں ہے بلکہ صوفیوں پر غلو فی العقیدہ کا الزام عائد کرنا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت، ۱۶۵: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلهِ۔ نقل کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب کا دعویٰ ملاحظہ کیجیے۔ اس کے بعد ہم کچھ عرض کریں گے۔

''یہودیوں اور عیسائیوں دونوں میں یہ خیال عام تھا کہ ان کی قوم کے اولیا صاحب اختیار ہیں اور لوگوں کو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس خیال کے تحت وہ ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے اور مصیبتوں اور حاجتوں میں انہیں مدد کے لیے پکارتے تھے، جیسا کہ آج کل بہت سے مسلمان بزرگان دین کے مقابر پر جا کر ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس خیال کی تردید میں فرمایا ہے۔''

اعظمی صاحب نے آیت کریمہ سے استدلال میں چار غلطیاں کی ہیں۔

اولاً تو ان کا مقصد صوفیوں کا غلو فی العقیدہ دکھانا ہے اور آیت مذکورہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

ثانیاً آیت مذکورہ کا مصداق یہود ونصاریٰ کو قرار دیا ہے جب کہ اس سے مشرکین مراد ہیں۔ قرآن میں یہود ونصاری کے عقائد کے بیان میں یہ ذکر تو مختلف مقامات پر آیا ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کو خدا بنا لیا، نصاریٰ کا عقیدہ تو بہت واضح ہے، لیکن قرآن میں کہیں بھی یہود ونصاریٰ کا اپنے اولیا سے استمداد و استغاثہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ثالثاً مضمون نگار یہود ونصاریٰ کے استمداد و استعانت کا دعویٰ کر رہے ہیں اور آیت کریمہ شرک جلی سے متعلق پیش کر رہے ہیں۔ آیت مذکورہ میں فرمایا گیا کہ ''بعض لوگ اللہ کے لیے شرکا

ٹھہراتے ہیں اوران سے اللہ کی محبت کی طرح محبت کرتے ہیں اور ایمان والے تو اللہ ہی سے زیادہ محبت کرتے ہیں'' قارئین ملاحظہ کریں، ان کے دعوی اور دلیل میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔

رابعاً اس آیت مذکورہ کے ضمن میں مسلمانوں کو شامل کرنا تو بالکل بے تکی بات ہے۔ قرآن سے ایسی بات ثابت کرنا جو قرآن میں مذکور نہیں ہے، مضمون نگار اور ان کی جماعت کا پرانا حربہ ہے اور یہ افتراء علی اللہ کے حکم میں ہے۔سورۂ اخلاص اور سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ بقرہ کی آیات سے پروفیسر صاحب کا الزام غلو فی العقیدہ ثابت نہیں ہوتا ہے۔

آگے کی بحث میں وہ شاہ ولی اللہ صاحب کی بیان کردہ توحید ذاتی وصفاتی کی تشریح نقل کرتے ہوئے امام غزالی کی عبارت پیش کرتے ہیں اور پھر کود کر مسئلۂ غیب پر آجاتے ہیں اور بعض صوفیہ کے خیالات پر اعتراض کرتے ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بحث سے وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔توحید ذاتی وصفاتی سے عقیدہ توحید میں کیا خلل واقع ہوا، اس کو واضح نہیں کرسکے۔صرف یہ دعوی کرنا کہ توحید ذاتی کا یہ تصور قرآن میں پیش نہیں کیا گیا ہے کافی نہیں۔شاہ ولی اللہ اور امام غزالی مطالعۂ قرآن کے بعد ہی اس فکر تک پہنچے ہیں اور توحید کے اس مرتبے پر پہنچنے کے لیے وہی ذکر و تسبیح حق تعالی ہے جس سے اعظمی صاحب مسلمانوں کو روکنا چاہتے ہیں۔جو شخص ذکر الہی اور تسبیح وتحمید، تہلیل وتمجید کو بدعت اور دین میں اضافہ قرار دے، ذکر الہی سے غافل رہے۔اللہ کے علاوہ غیر اللہ سے دل بہلانے اور ان کو دل و دماغ میں بسانے کی بات کرے، اللہ کے بجائے غیر اللہ سے تصحیح خیال کو ضروری سمجھے وہ توحید کے مسئلے کو عوام کے ذہن سے سمجھے گا اور اس کی توحید عوام الناس کی توحید ہوگی۔توحید کا مسئلہ پڑھ لینے سے توحید کا وہ درجہ حاصل نہیں ہوسکتا جس پر صوفیہ فائز رہے ہیں۔ پروفیسر اعظمی اور ان کے ہم خیال افراد یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک آدمی صرف اللہ کا ہو کر کیسے رہ سکتا ہے اور صرف اللہ کو سوچ کر کیسے جی سکتا ہے۔جس طرح مشرکین ایک معبود کی عبادت پر حیران ہوتے تھے کہ ہمارا ایک معبود کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ بے شمار الہ کی عبادت پر مطمئن ہوتے تھے، اسی طرح منکرین تصوف صرف ایک اللہ ہی کو دیکھنے اور سوچنے اور اسی کی یاد میں رہنے کی صوفیانہ دعوت پر حیران و سرگرداں ہیں اور جب بات سمجھ میں نہیں آتی تو انکار کرتے ہیں، اس طریق تصوف پر عمل کرنے میں جب دنیا کی بہت سی پرکشش چیزوں سے محرومی پر غور کرتے ہیں تو اس طریق حق کو غیر اسلامی کہہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جنت نگاہ اور فردوس گوش دنیا سے کون محروم ہونا چاہے گا؟

صوفیہ کے علم وتصرف پر اعتراض

پروفیسر اعظمی کو جب عقیدے میں غلو کے دعوے پر کتاب وسنت سے کوئی دلیل نہیں ملی تو

صوفیہ کے تصرفات اور اشراقات پر اعتراض شروع کر دیا اور شاید اسی کو وہ غلو فی العقیدہ کہتے ہیں۔
موصوف کو صوفیہ کے امور غیبیہ کی معرفت پر بھی شدید اعتراض ہے۔اس حوالے سے صفحہ ۲۱/اور ۲۲ پر شیخ عبدالکریم جیلی اور شیخ اکبر کی عبارت جو اعظمی صاحب نے نقل کی ہے، اس میں ان بزرگوں نے غیب کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا ہے، مثلاً شیخ جیلی نے صوفی کے بارے میں لکھا ہے:

''ان میں کا ہر ایک پرندوں کی بولیوں کے علاوہ زمین اور آسمان میں جو بھی حرکت ہوتی ہے وہ اس کو جانتا ہے''

شیخ اکبر نے لکھا ہے:

اوتاد زمین کے ہر چہار سمت کی حفاظت پر مامور ہیں اور ان کو اوتاد (میخیں) اس لیے کہا جاتا ہے کہ زمین ان ہی کی وجہ سے اپنی جگہ پر رکی ہوئی ہے۔اس کو اعظمی صاحب نے غیب دانی قرار دیا ہے، اس پر استدراک میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔اب ان کی یہ عبارت پڑھیے جو وہ شیخ اکبر کی تشریحات کے ذکر کے بعد لکھتے ہیں:

''اس اقتباسات کو سامنے رکھیں اور سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیات کو پڑھیں جو اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہیں، جن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور نہ یہ بات ہے کہ وہ تنہا اپنی سلطنت کا انتظام کرنے سے قاصر ہے، اس لیے کچھ لوگ اس کے مددگار رہیں'' اور پھر خود فیصلہ کریں کہ اقطاب و اوتاد کے ذریعہ سے انتظام عالم کی بات اسلام کے تصور توحید کے منافی ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کھلا ہوا شرک ہے۔''

اعظمی صاحب کی پریشانی یہی ہے اور اس کو وہ غلو فی العقیدہ کہتے ہیں۔موصوف کو صالحین اور علمائے امت پر تہمت وافترا سے پہلے اس آیت مبارکہ پر غور کر لینا چاہیے تھا: وَلَا تَقْفُ مَالَيْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ (بنی اسرائیل: ۳۶) امت کے سواد اعظم کو کھلے شرک کا مرتکب قرار دینا، اولاً تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے انحراف ہے کہ میری امت ضلالت پر جمع نہیں ہوگی، ثانیاً شذوذ کی اسلام میں اجازت نہیں، لزوم جماعت واجب ہے، ثالثاً شرک جلی قرآن کی روشنی میں غیر اللہ کی عبادت کا نام ہے۔سورہ کہف کی آخری آیت ہے: فَمَنْ کَانَ یَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا۔ (۱۱۰) جس کسی کو اللہ سے لقاء کی تمنا ہے اس کو نیک عمل کرنا چاہیے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے'' باقی امور میں اہل علم کے درمیان فرق و اختلاف علمی دائرے کی چیز ہے، تعبیر و تشریح کا فرق ہے، انداز فکر کا فرق ہے، ورنہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت مذکورہ سے کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔مشرکین عرب کا جو کچھ رد قرآن نے

کیا ہے، وہ اسی لیے کہ انھوں نے شرک فی العبادت شروع کر دیا تھا، وہ شرک فی العبادت کو صحیح سمجھتے تھے، جس طرح اعظمی صاحب اور ان کے ہم خیال شرک فی الوجود کو توحید کے منافی نہیں سمجھتے۔ خود مشرکین کا اعتراف بھی قرآن میں موجود ہے: مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللهِ زُلْفٰى۔ (الزمر: ۳) ''ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب کر دیں۔''

وَجَدْنَا آبَائَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُونَ۔ (الشعرا: ۷۴)

ہم نے اپنے آباء کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے (عبادت کرتے ہوئے)۔

انتظام وانصرام عالم کے سلسلے میں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ اس کے حدود کیا ہیں؟ پانی برسانا، زمین سے درخت و پودے اگانا، موت وحیات دینا، پیدا کرنا، شمس وقمر کے نظام طلوع وغروب پر نظر رکھنا، لیل ونہار کے تقلبات، موسم کے تغیرات، جاندار وغیر جاندار کی پرورش اور نشوو نما کرنا، رزق دینا، بیمار کرنا، صحت دینا، ہوا چلانا، یہی باتیں انتظام وانصرام کے دائرے میں آتی ہیں یا حسب ذیل باتیں بھی اس میں شامل ہیں:

دنیا میں امن وامان قائم کرنا، ظلم وستم کا خاتمہ کرنا، عدل وانصاف کا نفاذ کرنا، کمزوروں کو سہارا دینا، محتاجوں کی حاجت دور کرنا، اسلام کی اشاعت کرنا، گمراہوں کو ہدایت کی طرف بلانا، نماز قائم کرنا، زکوۃ کا نظام قائم کرنا، قانون الٰہی کو دنیا میں نافذ کرنا، راہ حق میں جہاد کرنا، مکارم اخلاق کی تکمیل کرنا، تزکیہ نفس اور تطہیر باطن کرنا، کتاب وسنت کی تعلیمات کو عام کرنا، قیام خلافت اسلامیہ کی سعی کرنا، حکومت الٰہی کو وسیع کرنا، سزا وتعزیر کے حدود مجرموں پر نافذ کرنا وغیرہ۔

اگر انتظام وانصرام عالم کا تعلق صرف اول الذکر چیزوں سے ہے تو اس کو ناقص انتظام تسلیم کرنا ہوگا، اور اگر ثانی الذکر امور کو بھی شامل کرلیں تو اس میں انسانوں کا شریک ہونا ضروری ہوگا۔ کیا اعظمی صاحب اس کو بھی شرک میں شمار کریں گے؟ اگر اول الذکر امور میں بعض چیزیں اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے سپرد کر دے تو وہ شرک ہے اور ثانی الذکر امور مکمل طور پر بندوں کے ذریعے انجام پائیں تو وہ شرک نہیں ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ اپنے دین کے قیام وفروغ کے لیے بندوں کا محتاج ہے، انبیا ومرسلین کے بغیر دین کی اشاعت نہیں ہوسکتی تھی؟ بلکہ کتابوں کی بھی کیا ضرورت تھی، اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت دیتا؟

منکرین تصوف کے حلق سے یہ بات نیچے نہیں اترتی کہ سب کام اللہ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ اقطاب واوتاد کا ذکر بعض حدیث سے ثابت ہے اور وہ حکم الٰہی کے پابند ہیں۔ نظام کائنات کے کسی شعبے سے ان کا وابستہ ہونا حکم الٰہی کے تحت ہے۔ اس کو کسی اعتبار سے شرک نہیں کہہ سکتے۔ اگر شرک اسی کا نام ہے تو ملائکہ بھی بہت سے کائناتی نظام کی نگرانی پر متعین ہیں، اس کو بھی شرک

کہنا ہوگا۔ جبریل علیہ السلام کے بارے میں کون نہیں جانتا؟ ملک الجبال کا ذکر سیرت میں سفر طائف کے موقع پر آیا ہے، قیامت میں صور پھونکنے، پر فرشتہ متعین ہے، حدیث میں اس کا ذکر ہے قیامت کے دن آٹھ فرشتے عرش الٰہی کو اٹھائے ہوئے ہوں گے، سورہ الحاقہ دیکھئے!

سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قوت واقتدار فی الارض کو ان آیات میں ملاحظہ کریں:

وَحُشِرَ لِسُلَیمَانَ جُنودُهُ مِنَ الجِنِّ وَالإِنسِ وَالطَّیرِ فَهُمْ یوزَعونَ۔ (نمل:۱۷) عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّیرِ وَأُوتِینَا مِن كُلِّ شَیءٍ۔ (نمل:۱۶) فَسَخَّرنَا لَهُ الرِّیحَ تَجرِی بِأَمرِهِ رُخَاءً حَیثُ أَصَابَ۔ (ص:۳۶)

جس طرح ملائکہ کبھی حکم الٰہی سے سرتابی نہیں کر سکتے، اسی طرح اولیاء اللہ بھی اس کے کسی حکم سے اعراض نہیں کرتے۔ اعظمی صاحب اور ان کے ہم خیال یہ سمجھتے ہیں کہ اقطاب واوتاد کو نعوذ باللہ اختیار ذاتی حاصل ہے، جو بات اہل تصوف نہیں کہتے، عصبیت زدہ لوگ ان پر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بادشاہ کے غلاموں اور کنیزوں کو ملک کے نظم ونسق میں مصروف دیکھ کر کوئی ان کو بادشاہت میں شریک سمجھنے لگے تو یہ اس کی ناسمجھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں، ان کے مقربین، فرشتوں اور انسانوں کا مختلف کاموں پر مامور ہونا، شرک نہیں ہے، خدمت ہے، اس فرق کو ایک پڑھا لکھا آدمی بھی نہ سمجھے تو جاہل سے کیا امید؟ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت سے اللہ تعالیٰ کا اختیار اور اس کی قدرت بالذات ثابت ہوتی ہے، اعظمی صاحب اس کو تسلیم بھی کر رہے ہیں، ہم بھی یہی کہتے ہیں، ہم اس میں اضافہ کرتے ہیں کہ قدرت واقتدار کا مالک، کچھ قدرت واقتدار حسب حال کسی کو دے بھی سکتا ہے، کیوں کہ اس کے قدرت واختیار کا یہی تقاضا ہے۔ وہ کہتے ہیں نہیں دے سکتا، ان کو قرآن سے حوالہ چاہیے۔ غیب کے سلسلے میں کچھ قرآنی دلائل استدراک میں دیے گئے ہیں، تصرف کے سلسلے میں عیسیٰ علیہ السلام کے احیائے موتی اور تخلیق طیور اور اس میں نفخ روح کی آیات پیش نظر رکھیں اور اعظمی صاحب کے انداز فکر کو دیکھیں۔ جو بات قرآن سے ممکن نظر آرہی ہے وہ بھی ان کے نزدیک ناممکن ہے۔ العیاذ باللہ۔

ذکر وفکر میں تفریق کا شوشہ

اعظمی صاحب اپنے مضمون کی دوسری قسط (معارف، فروری ۲۰۱۲ء) میں یہ عنوان قائم کرتے ہیں ''ذکر وفکر میں تفریق''۔ اس عنوان کے تحت انھوں نے مولانا عبدالباری ندوی کے حوالے سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں آل عمران کی ایک آیت سے دوام ذکر پر گفتگو کی ہے مگر یہاں پر مزید گفتگو کی ضرورت ہے، پہلے موصوف کا انداز فکر ملاحظہ کریں:

''اکثر علما اور صوفیہ کی عادت ہے کہ وہ قرآن کی صرف ان ہی آیات سے دلچسپی رکھتے ہیں

جوان کی طبیعت اور مذہبی فکر کے مطابق ہوتی ہیں اور ان آیات سے صرف نظر کر جاتے ہیں جو اس کے برعکس ہوتی ہیں۔قرآن میں اہل کتاب سے کہا گیا ہے :أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ۔(البقرة:) کیا تم کتاب کی بعض باتوں کو مانتے ہو اور بعض باتوں کو نہیں مانتے:

''مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کو قرآن میں :الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَ عَلَى جُنُوبِهِمْ۔ کی آیت تو نظر آئی جس سے انھوں نے دوام ذکر پر استدلال فرمایا ہے لیکن ٹھیک اس کے بعد کی آیت وہ نہ دیکھ سکے کہ یہ آیت تو تصوف کی بنیاد ہی ڈھا دیتی ہے۔تصوف میں مراقبہ اور مشاہدہ حق ہی اصل دین ہے اور آیت، کائنات کی تخلیق میں غور وفکر کی دعوت دیتی ہے تاکہ خدا کی سچی معرفت حاصل ہو:إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ،الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (ال عمران:۱۹۱-۱۹۰)

بلا شبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے آنے جانے (کے نظام میں) اہل عقل کے لیے دلائل ہیں جو ایسے ہیں کہ اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں (اور اس غور وفکر سے ان پر حقیقت کھل جاتی ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب تو نے اس کائنات کو بے مقصد نہیں پیدا کیا، تیری ذات پاک ہے (کہ تو کوئی بے مقصد کام کرے) پس ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالے۔''

اعظمی صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ صوفیہ انھی آیات سے دلچسپی رکھتے ہیں جو ان کی طبیعت اور مذہبی فکر کے مطابق ہوتی ہیں اور ان آیات سے صرف نظر کر جاتے ہیں جو اس کے برعکس ہوتی ہیں، دلیل میں وہ آل عمران کی مذکورہ آیت کریمہ لائے ہیں، قارئین ان کے دعوے اور دلیل پر نظر رکھتے ہوئے غور کریں۔اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ میں اولوالالباب کی دو صفت بیان فرمائی ہے (۱) ہر حالت و ہیئت میں اللہ کو یاد کرنا (۲) اور آسمان و زمین کی تخلیق میں غور وفکر کرنا۔کیا دونوں صفتوں میں ایک صفت دوسری صفت کے برعکس ہے؟ اگر تفکر، ذکر کے برعکس ہے تو عدم ذکر ہوا یعنی جب وہ ارض وسما کی تخلیق میں فکر کرتے ہیں تو اللہ کا ذکر بالکل نہیں کرتے، اس کے یہ مطلب بھی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات بیان فرماتا ہے تو اس کے بعد دوسری بات اس کے برعکس بیان کرتا ہے۔اعظمی صاحب کے اس نتیجۂ فکر سے تصوف تو کیا قرآن کی بنیاد منہدم ہو جاتی ہے۔(نعوذ باللہ) کیا قرآن کے احکام میں یا اعمال صالحہ کی تلقین میں تضاد پایا جاتا ہے؟ یہ کیسی نامعقول بات ہے؟ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔ (النساء:

۸۲)اگر قرآن کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں بہت اختلاف پاتے۔

ان آیات میں کون سی نئی بات اور نیا انکشاف ہے جس کو اعظمی صاحب، ظاہر کر کے صوفیہ کو ذکر وفکر میں تفریق کرنے کا ملزم ٹھہرا رہے ہیں۔صوفیہ ساری زندگی یہی دعائیں کرتے رہے ہیں۔ تخلیق ارض وسما میں تفکر کا نتیجہ تبتل وانابت الی اللہ کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔صوفیہ کے اسی تبتل اور انابت الی اللہ کو اعظمی صاحب، ایک طرف رہبانیت بھی کہتے ہیں۔ ذکر وفکر میں تفریق کے عنوان سے صفحات سیاہ کر کے اعظمی صاحب، نہ جانے کس نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ اعظمی صاحب کا یہ خیال کہ صوفیہ ان ہی آیات سے دلچسپی رکھتے ہیں جو ان کی طبیعت اور مذہب فکر کے مطابق ہوتی ہیں، خلاف واقعہ ہی نہیں بہتان وافترا ہے۔کیا ذکر الٰہی محض صوفیہ کی طبیعت اور ان کے مخصوص مذہبی رجحان کا نتیجہ ہے؟ تھوڑی سی دینی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی ذکر الٰہی کے متعلق ایسی بات نہیں کہہ سکتا، چہ جائے کہ ایک فاضل پروفیسر کے قلم سے ایسی گمراہ کن بات نکلے۔سورہ آل عمران میں اَلَّذِینَ یَذْکُرُونَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰی جُنُوبِھِم سے اولوا الالباب کی صفت بیان کی گئی ہے اور سورۂ نساء میں اسی انداز میں ذکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ بھی میدان جہاد میں۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۰۲ میں جہاں میدان جہاد میں صلوٰۃ الخوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، وہیں آیت نمبر ۱۰۳ ملاحظہ فرمائیں: فَإِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلَاۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰی جُنُوبِکُمْ (نساء: ۱۰۳) اسی طرح سورہ انفال آیت ۴۵ میں فرمایا: إِذَا لَقِیتُمْ فِئَۃً فَاثْبُتُوا وَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَثِیرًا لَّعَلَّکُمْ تُفْلِحُونَ۔ (انفال: ۴۵) جب تم کو دشمن کی کسی فوج سے مقابلہ کرنا پڑے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم کامیاب رہو (دنیا اور آخرت میں)

اعظمی صاحب غور کریں، وہ مسلمانوں کو قرآن سے دور کر رہے ہیں یا نزدیک؟ صوفیہ اپنی طبیعت اور مزاج اور اپنے مسلک ومشرب کے مطابق آیات ذکر کو ترجیح دیتے رہے ہیں یا اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے رہے ہیں؟ چند آیات ملاحظہ کیجئے، ہم کو معلوم ہے کہ ان آیات سے اعظمی صاحب اور ان کے ہم مذہب اچھی طرح واقف ہیں، لیکن صوفیوں پر سب وشتم اور ان کی دل آزاری، منکرین تصوف کی سرشت میں شامل ہے، اس لیے وہ مکر وفریب اور مغالطہ انگیزی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر سکتے۔

(۱) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ إِلَیْہِ تَبْتِیلًا

ترجمہ: اپنے رب کا نام ذکر کرو اور اس کی طرف پورے طور پر ایک سو ہو جاؤ۔

(۲) وَاذْکُرْ رَّبَّکَ فِی نَفْسِکَ تَضَرُّعًا وَّخِیفَۃً وَّدُونَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَکُنْ مِّنَ الْغَافِلِینَ۔

ترجمہ: اپنے رب کا ذکر کرو اپنے دل میں اس طرح کہ (اس میں) تضرع ہو اور خوف ہو اور زبان سے نہ ہو، صبح اور شام (ذکر) کرو اور غافل نہ رہو (ذکر سے)

(۳) فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْهُ۔ (نصر)

ترجمہ: تو تسبیح کیجئے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اور اس سے مغفرت چاہیے۔

(۴) یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا اذْکُرُوا اللهَ ذِکْرًا کَثِیرًا وَسَبِّحُوهُ بُکْرَةً وَأَصِیلًا۔ (الاحزاب: ۴۲-۴۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کا بہت ذکر کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔

(۵) فَإِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْکُرُوا اللهَ قِیَامًا وَقُعُودًا وَعَلَی جُنُوبِکُمْ۔ (النساء: ۱۰۳)

ترجمہ: تو جب تم نماز پوری کرلو تو اللہ کا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔

یہ بات تسلیم کرلی جائے کہ صوفی ان ہی آیات سے دلچسپی رکھتے ہیں جو ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہوتی ہیں، تو بھی صحیح ہے، ذکر الٰہی ان کی طبیعت اور مزاج کے مطابق ہے، کیوں کہ: من احب شیئا اکثر ذکرہ (جس سے محبت ہوتی ہے آدمی اس کا ذکر زیادہ کرتا ہے) کے مطابق ، ذکر کی کثرت محبت الٰہی کا تقاضا ہے۔ جو لوگ اللہ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اس کے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار رہتے ہیں، وہ اس کو صبح وشام، اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر حال میں اور ہر وقت یاد کرتے رہتے ہیں۔ عشق الٰہی کا یہ فلسفہ، دنیا سے محبت کرنے والوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا.....ع

ذوق ایں مے نشناشی بخدا تانہ چشی

کیا مراقبہ ومشاہدہ عجم کی پیداوار ہیں؟

اعظمی صاحب اور ان کے ہم خیالوں کے دلوں میں مراقبہ اور مشاہدہ تیر نیم کش کی طرح چبھا ہوا ہے، وہ بار بار اس کا رونا روتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: ''صوفیہ نے ذکر کے پردے میں مراقبہ اور مشاہدۂ حق کے نام سے ایک عجمی چیز کو دین اسلام میں داخل کردیا ہے اور امت کے ایک بڑے حصے نے اس اضافے کو عین اسلام سمجھ لیا''

عجم سے شاید ان کی مراد ایران و ہند ہے، قبل اسلام، ایران میں مجوسیت تھی، ہندوستان میں عربوں کی طرح اصنام پرستی تھی، یہ آتش پرست اور اصنام پرست، کس طرح مراقبہ کرتے تھے؟ اور کسی چیز کے مشاہدے کی کوشش کرتے تھے؟ مراقبہ ومشاہدہ کے بارے میں ان کے نظریات و خیالات کیا تھے؟ اعظمی صاحب نے اس کی کوئی ایک مثال نہیں دی۔ وہ تو بڑے ذی علم اور صاحب تحقیق ہیں۔ تاریخ مجوس اور تاریخ ہنود سے مراقبہ ومشاہدہ کی مثالیں پیش کرسکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی معقول اور مسکت دلیل سے عاجز ہوجاتا ہے تو سب وشتم کی راہ اختیار کرتا ہے۔

تصوف وتاریخ کی کتابوں کے مطالعے سے موصوف کو یقینا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ صوفیہ کے مراقبے کی حقیقت کیا ہے اوران کے یہاں مراقبے کا مفہوم کیا ہے؟ لیکن اس کے باوجوداس کو بار بار عجمی چیز کہہ کروہ ایک جھوٹ کو سچ بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

مراقبہ اصلانگہبانی کا نام ہے، جب اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: وَلَاتَکُنْ مِنَ الْغَافِلِیْنَ۔ اللہ کے ذکر سے غافل نہ رہو، تولازم ہوا کہ بندہ اپنے قلب کی نگہبانی کرتارہے کہ اس کادل یادالٰہی سے غافل تونہیں ہورہا، غیراللہ نے اس کے دل میں جگہ تونہیں بنالی۔ لفظ مراقبہ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے معنوی وسعت رکھتاہے۔ زندگی کے دیگرامور میں بھی اس کا استعمال جائز ہے، جیسے قرآن کی یہ آیت: اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا۔ (النساء:۱) اللہ تم پرنگہبان ہے کہ تم حقوق کی ادائیگی میں کتنا انصاف کرتے ہو۔ اسی طرح مسلمان کو بالخصوص سالک کواپنے فکر، خیال، کیفیات اوراعمال میں مراقبے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی فکر کاکوئی لمحہ، اس کی کیفیات قلبی کاکوئی وقفہ، اس کے اعمال صالحہ میں کوئی عمل، نفس وشیطان کے زیراثر نہ آجائے اورذکرالٰہی سے غفلت نہ ہوجائے۔ مشرکین عجم اس نکتے سے واقف ہی نہیں تھے۔ اگروہ اپنادھیان اللہ کی طرف درست کرنے کے لیے مراقبہ کرتے بھی ہوں تووہ لاحاصل تھا؛ کیوں کہ اللہ کی عبادت میں غیراللہ کو شریک کرلینے کے بعد توحید کاکوئی تصور ہی باقی نہیں رہتا۔

یہی دل کی نگہبانی اوراحتساب، صوفیہ کامراقبہ ہے۔ قلب کی نگرانی اور پاسداری کی طرف قرآن متنبہ فرماتاہے۔ سورہ منافقون میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تُلْهِکُمْ أَمْوَالُکُمْ وَلَا أَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَأُولٰئِکَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ۔ (المنافقون:۹)

یعنی ہوشیاررہواوراپنے قلب اورقلب کی کیفیات کی نگرانی کرتے رہو، لباس وجسم کو ظاہری آلائشوں سے بچانے کی کوشش ایک فطری اورطبعی عمل ہے، قلب اور باطن کوداخلی آلائشوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی ایک متقی اورذاکرحق کی طبیعت اورمزاج کاخاصہ ہے۔ اس کوغیر اسلامی کہنارموز دین سے بےخبری ہے۔ مراقبے کا مقصد ہی کیفیات ایمانی کی حفاظت اورکثرت ذکر سے پیداہونے والی واردات قلبی کوباقی رکھناہے۔

اگریہ تسلیم کرلیاجائے کہ مشرکین عجم بھی مراقبہ کیاکرتے تھے تواس سے مسلمانوں کے مراقبے پرکیااثرپڑتاہے؟ قبل بعثت مشرکین عرب بھی طواف وسعی کیاکرتے تھے، تحویل قبلہ سے پہلے تک مسجداقصی کی طرف رخ کرکے رسول اللہ ﷺ اورآپ کے اصحاب نے نمازیں پڑھیں جواس وقت ''مغضوب علیہم یہود'' کاقبلہ تھا، ہجرت کے بعدرسول اللہ ﷺ نے عاشورے

کا روزہ رکھنا اختیار فرمایا جو مدینہ کے یہود کا عمل تھا۔ مجھے حیرت ہے کہ اعظمی صاحب نے کون سی عینک لگا کر یہ مضمون لکھا ہے؟ ان کی فکر کی کوئی سمت سیدھی نہیں ہے، دوسرے مذاہب کی تمام باتوں کا غلط ہونا عقل کے خلاف ہے۔ انبیا کی ننانوے فی صد تعلیمات کا گم ہو کر چند ایک تعلیم کا ان کی قوم میں باقی رہ جانا عین ممکن ہے۔ اسلام کا اختلاف دوسرے مذاہب سے، اصولی عقائد کی بنا پر ہے، عملی جزئیات کے چند ایک مسئلے میں یکسانیت پائی جا سکتی ہے، مثلاً بیت اللہ کا احترام، بعض مناسک حج، صوم عاشورہ، تعین قبلہ میں یہود کی موافقت وغیرہ۔ کسی عمل کو صرف اس لیے غلط کہنا کہ اس کی مثالیں مشرکین عجم کے یہاں بھی پائی جاتی ہیں، مسلکی تعصب اور شدت پسندی ہے۔ یہود و نصاریٰ اور مشرکین سے اشتراک عمل کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن اعظمی صاحب کی طرح خواہ مخواہ بات کو طول دینا مقصود نہیں۔ اولاً تو مراقبے کی نوعیتوں اور مراقبے کے مقاصد کے سلسلے میں کوئی عجمی مثال اعظمی صاحب نہیں دے سکے، ثانیاً مراقبات کی ''عجمی'' نوعیت متعین بھی ہو جاتی تو صوفیوں کے مراقبے اور مشرکین کے مراقبے میں وہی فرق ہوگا جو فرق معجزہ اور استدراج میں پایا جاتا ہے۔ ثالثاً دونوں کے مراقبوں میں نیتوں اور مقاصد کے فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ورنہ صورت ظاہری کی مماثلت اور استدراج پر فیصلہ کر لیا جائے، تو کرگس و شاہین کی طرح مومن و کافر میں بھی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ہاں! اعتراض اس وقت ہوگا جب کسی عمل کی صورت و ہیئت نصوص شرعیہ سے ثابت ہو اور کوئی مسلمان اس کے خلاف کرے۔ خدا کی تلاش، خدا تک پہنچنے اور پہنچانے کا جذبہ ہر قوم میں موجود رہا ہے اور ابھی بھی ہے، اس لیے ان کے یہاں ریاضت، ضبط نفس اور خدا کی طرف دھیان لگانے (توجہ)، یکسو کرنے کے طریقے میں کوئی طریقہ صوفیہ کے طریقے کے موافق ہو جائے تو اس کے یہ مطلب نہیں ہیں کہ صوفیوں نے ان سے اخذ کیا ہے، یہ تو تلاش حق کے فطری جذبے کی رہنمائی ہے کہ دو مختلف المذہب شخص ایک ہی نتیجے پر پہنچیں۔ اور اگر ضبط نفس اور توجہ کی یکسوئی کے لیے کوئی طریقہ غیروں سے لے لیا جائے تو اس میں بھی کسی واویلے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں نے علوم و فنون میں بہت کچھ غیروں سے لیا ہے، ہر اچھی چیز ''ضالۃ المومن'' ہے۔ تدبیر و علاج نفس تو مومن ہی کی چیز ہے، مشرکین عرب و عجم اس سے استفادہ کرنا کیا جانیں۔

رہ گیا مشاہدہ، تو یہ کثرت ذکر اور مراقبۂ ذات و صفات کا نتیجہ ہے۔ مشاہدہ سے اعظمی صاحب نے آنکھوں سے دیکھنا سمجھ لیا، حالاں کہ یہ مشاہدہ محسوسات و کیفیات سے عبارت ہے۔

اس کو قلبی اور فکری مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔رسول اکرم ﷺ جب قیامت کی ہولنا کیوں پر خطبہ ارشاد فرماتے تھے، تو اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ صحابہ کہتے تھے کہ معلوم ہوتا کہ قیامت نظروں کے سامنے ہے۔خوشی اور غم کے گزرے ہوئے واقعات کا تصور مدت گزرنے کے بعد بھی آدمی کو مسرور اور مغموم کرتا ہے، اگرچہ کسی انسان نے اللہ کو آنکھوں سے دیکھا نہیں مگر اس کی عظمت ذات اور ہمہ گیری صفات کا تصور کرنے سے دل پر اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور خشیت کا طاری ہو جانا، اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت عامہ کے تصور سے دل میں اس کی محبت کا بڑھ جانا، ایک واضح بات ہے جس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔تعجب ہے کہ یہ بات اعظمی صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی۔

محاسن اخلاق میں تفریق کی تہمت

جب صوفیہ پر ذکر وفکر میں تفریق کا الزام ثابت کرنے میں ناکام رہے تو اس کے بعد انہوں نے ''محاسن اخلاق میں تفریق'' کا عنوان قائم کیا ہے۔اس کے تحت لکھتے ہیں:

''صوفیا نے اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں بھی تفریق کی ہے۔قرآن میں اخلاقی محاسن کا ذکر متعدد صورتوں میں ہوا ہے اور اس میں کافی تنوع ہے، اگر ایک طرف عفو ودرگزر، تواضع، خاکساری، عفت، حیا، توکل، رضا، شکر وقناعت اور حلم جیسے اہم اخلاقی اوصاف کو بتکرار بیان کیا گیا ہے تو دوسری طرف ارادے کی مضبوطی، بلند ہمتی، اولوالعزمی، استقلال وثبات (صبر) راہ خدا میں جہاد، کسب معاش میں جد وجہد، انفاق میں اعتدال، حق گوئی، خودداری اور ظالم کے خلاف نبرد آزمائی جیسی اخلاقی تعلیمات بھی موجود ہیں۔

صوفیہ نے ان اخلاقی تعلیمات میں سے صرف اول الذکر تعلیم کو لیا اور مؤخر الذکر کو چھوڑ دیا کیوں کہ وہ ان کے مزاج اور راہبانہ تصور زندگی کے خلاف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں راہ خدا میں جہاد کے بجائے چلّہ کشی اور مراقبہ کو ترجیح حاصل ہے۔اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ جو چیزیں اسلام کے تصور اخلاق میں ناپسندیدہ ہیں ان کو محمود قرار دیا۔مثلاً اسلام میں افلاس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے، جیسا کہ درجہ ذیل آیات سے ظاہر ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا۔ (بنی اسرائیل:۲۹)

ترجمہ: تم نہ اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ ہی اس کو بالکل کھول دو (یعنی فضول خرچی کرو) کہ ملامت زدہ اور تہی دست ہو کر بیٹھ رہو۔

لیکن صوفیہ نے اس کی ستائش کی ہے، ان کے یہاں ترک معاش اولیٰ اور کسب معاش توکل کے خلاف ہے''

اولاً تو اعظمی صاحب نے محاسن اخلاق کا جو معجون مرکب تیار کیا ہے وہ کسی صاحب فہم کو

مشکل ہی سے ہضم ہوگا کیوں کہ ارادے کی مضبوطی ، بلند ہمتی، اولوالعزمی، استقلال و ثابت قدمی، اور خودداری جیسی صفات، بذات خود محاسن اخلاق میں نہیں آتیں اور نہ فی نفسہ قابل تعریف ہیں، جب تک کہ کار خیر کے لیے نہ ہوں۔ خودداری، جس کا دوسرا نام غیرت ہے، دوسری قوموں میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ سب محاسن اخلاق کی تکمیل کرنے والی صفات ہیں، مثلاً دشمن سے عفوودرگزر کے لیے بلند ہمت ہونا ضروری ہے، جس کی ہمت عالی نہ ہو وہ دشمنوں کو تو کجا دوستوں کو بھی معاف نہیں کرے گا۔ پاک دامن رہنے اور محارم الٰہی سے دل ونگاہ کو بچا کر رکھنے کے لیے ارادے کا مضبوط ہونا ضروری ہے۔ اولوالعزم لوگ جب اپنی اولوالعزمی کو دین وملت کے لیے استعمال کرتے ہیں تو بڑے بڑے انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ آدمی خوددار نہ ہو تو توکل علی اللہ پر قایم نہیں رہ سکتا۔ گداگروں کے اندر خودداری کی صفت پیدا ہو جائے تو دنیا سے گداگری ختم ہو جائے گی، ''فقیر خدا مست'' اپنی غیرت اور خودداری کی بنا پر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ مزاج میں استقلال نہ ہو تو آدمی مہمات امور تو کجا زندگی کا کوئی کام سلیقے سے نہیں کر سکتا، ثبات قدمی کے بغیر میدان جنگ میں کوئی مجاہد نہیں ٹھہر سکتا۔ اعظمی صاحب نے حسب عادت مضمون ومفہوم میں خلط کیا ہے، یا وہ سمجھ نہیں پاتے کہ ان کو کیا لکھنا چاہیے۔ انھوں نے راہ خدا میں جہاد کو بھی اخلاقیات میں شمار کر لیا ،قناعت کو اول الذکر تعلیمات میں شمار کیا اور انفاق میں اعتدال کو مؤخر الذکر صفات میں، جبکہ قناعت اور انفاق میں اعتدال ایک دوسرے کا لازمہ ہے۔ دونوں الگ الگ صفات نہیں ہیں۔

اگر اعظمی صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ صوفیہ نے ان دوسرے امور میں حصہ نہیں لیا تو وہ غلط ہیں تصوف کی کتابوں کے مطالعے کے بعد بھی وہ یہ الزام لگاتے ہیں تو یہ ان کا تعصب ہے۔ کتنے واقعات بیان کیے جائیں، صوفیہ نے جہاد بالسیف بھی کیا اور علاقے فتح کیے، مسلمان بادشاہوں کو ان کی غیر شرعی حرکات پر برسر منبر ٹوکنا، کم ہمتی کی بات ہے؟ سیدنا عبدالقادر جیلانی کے حالات ملاحظہ کر لیں، وہ عباسی خلفا پر کڑی تنقید فرماتے تھے، کیا اس کا شمار حق گوئی میں نہیں ہے؟ ارشاد نبوی: **افضل الجھاد کلمۃ حق عند السلطان الجائر** کی اور کیا تفسیر ہو سکتی ہے؟ اس طرح کے ایک ہی نہیں بے شمار واقعات ہیں۔ عباسی خلیفہ ہارون رشید ملنے کے لیے آیا تو مشہور صوفی فضیل ابن عیاض نے رعایا کے ساتھ نیک سلوک کی ترغیب دی۔ سفیان ثوری نے خلیفہ ابوجعفر منصور کو منیٰ میں اس کے سفر حج کی فضول خرچی پر ٹوکا۔ ملک شاہ سلجوقی کے شاہانہ کروفر کو دیکھ کر امام غزالی نے اس کو مخاطب کر کے فرمایا تھا: افسوس مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی گردنیں طوقہائے زریں سے۔

شیخ برہان الدین غریب کے خلیفہ شیخ زین الدین نے والی دکن سلطان محمد بہمنی کو منہیات

شرعی کا مرتکب پا کر اس کی دعوت پر اس کے پاس جانے سے انکار کیا اور اس بے باکی کے ساتھ وعظ و نصیحت بھرا خط لکھا کہ بادشاہ نے غصے میں شہر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ وہ شہر سے نکل گئے۔ بعد میں جب بادشاہ کو ندامت ہوئی تو اس نے معذرت کی۔ شیخ نے اپنی ناراضگی دور ہونے کے لیے شرط رکھی کہ بادشاہ ممالک محروسہ سے شراب خانے یک قلم اٹھا لے اور اپنے باپ کے طریقے کے مطابق نہی عن المنکر، اور امر بالمعروف کی سعی کرے۔ بادشاہ نے شرط منظور کر لی۔

حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شاہ رکن عالم ملتانی نے ایک موقع پر بادشاہ کو مسلمانوں کا خون بہانے سے روکا، کشلو خان نے سلطان محمد تغلق کے خلاف بغاوت کی اور بغاوت کچل دی گئی لیکن بادشاہ نے بدلہ لینے کے لیے اہل ملتان کے قتل کا حکم نافذ کر دیا۔ شاہ رکن عالم ملتانی کو معلوم ہوا تو انہوں نے خود بادشاہ کے پاس جا کر اس کو اس ظالمانہ ارادے سے روکا، نصیحت اور تنبیہ کی، اس طرح اہل ملتان کی جان بچی۔

مشہور چشتی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (جن کے وحدۃ الوجود پر اشعار ہیں) اپنے عہد کے حکمرانوں کو ہمیشہ عدل گستری اور قوانین شرعیہ پر عمل کرانے کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔ بابر جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس کو بھی ایک مکتوب لکھا، جس میں اوامر و نواہی کی پابندی، اقامت صلوٰۃ اور شرع محمدی کے نفاذ کی تلقین فرمائی۔

مشہور قادری سہروردی بزرگ شیخ نورالدین مبارک غزنوی، عہد التمش میں شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے مگر بھرے دربار میں آزادانہ تنقید کرتے تھے۔ ان واقعات کے لیے یہ کتابیں دیکھیے: تاریخ مشائخ چشت، تاریخ دعوت و عزیمت ج:۱ ص:۳، آب کوثر، رود کوثر، مخدوم جہانیاں جہاں گشت، تذکرۂ مشائخ نقشبندیہ۔

مجدد الف ثانی کی دینی خدمات اور شریعت کے معاملے میں بادشاہ وقت سے ٹکر لینے کے واقعات مشہور ہیں۔ یہ سب باتیں اس کو بتائی جائیں جو نہیں جانتا، اعظمی صاحب سب کچھ جانتے ہیں، لیکن صوفیہ سے ان کا بغض و عناد، ان کو اعتراف حقیقت سے روکتا ہے۔ تصوف اور اہل تصوف سے بے زاری ان کا مسلک ہے۔ ان کی مصیبت یہ ہے کہ وہ ان حقائق کو تسلیم کر لیں تو ان کے مسلک و مشرب کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

کفار و مشرکین کے درمیان رہ کر اور اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اسلام کی اشاعت کرنا، صوفیہ کو اولوالعزم، بلند ہمت، ثابت قدم اور آہنی ارادوں کا مالک ثابت کرتا ہے۔ شیخ ہجویری، سیدنا جیلانی، شیخ اسحٰق گازرونی، حضرت بوعلی قلندر، خواجہ اجمیری، شیخ جلال الدین تبریزی اور ان جیسے بے شمار صوفیہ کی خدمات جلیلہ اشاعت اسلام کے سلسلے میں تاریخ میں موجود ہیں۔ اس

سے انکار کی گنجائش نہیں مگر جس کو ''ضعف بصر'' کا عارضہ ہو اس کو کون دکھائے، جس کو ''سوء فہم'' کی بیماری ہو وہ کیسے سمجھے اور جس کو ''سوء ظن'' کی شکایت ہو وہ حسن ظن کی اہمیت کیا جانے؟

اعظمی صاحب نے اپنے دعوے پر کوئی دلیل نہیں دی، ان کو بتانا چاہیے تھا کہ کن صوفیوں نے پست ہمتی دکھائی؟ کن صوفیوں نے موقع آنے پر حق کی حمایت نہیں کی اور حق گوئی سے دور رہے، وہ کون صوفی ہیں؟ جنہوں نے انفاق میں اعتدال نہیں کیا، فضول خرچی اور اسراف سے کام لیا؟ یہ بات ذہن میں رہے کہ معاشرے میں اہل حق کی نمائندگی چند ہی افراد کرتے ہیں، عملاً سارے لوگ میدان میں نہیں اترتے، البتہ نمائندہ شخصیتوں کو سب کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ جس جس عہد میں جن صوفیوں نے بادشاہوں کو ان کے مظالم پر متنبہ کیا، عدل وانصاف پر آمادہ کیا، قوانین شریعت کا نفاذ کرایا اور غیر شرعی امور پر دارو گیر کی، وہ اپنے اپنے عہد کے تمام اہل تصوف کے نمائندہ تھے۔

کیا صوفیہ نے جہاد نہیں کیا؟

اعظمی صاحب کا ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ''صوفیوں نے راہ خدا میں جہاد کے بجائے مراقبہ اور چلہ کشی کو ترجیح دی'' اولاً تو یہ خلاف واقعہ ہے، ثانیاً جہاد کے لیے تلوار اٹھانا ہی کیوں ضروری ہے، ظالم کو ظلم سے روکنا، اس کے سامنے کلمۂ حق کہنا بھی جہاد ہے، اپنے حسن عمل اور اعلیٰ اخلاق سے اسلام کی اشاعت کرنا جہاد کا مقصد ہی تو ہے، بغیر جہاد بالسیف کے صوفیہ وہی کام کرتے رہے تو ان کو جہاد نہ کرنے کا طعنہ دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ یہاں اعظمی صاحب دانستہ قارئین کی توجہ اس اصولی مسئلے سے پھیرنا چاہتے ہیں کہ ''ہر کسے را بہر کارے ساختہ اند'' سلطنت کے تمام لوگ میدان کے سپاہی نہیں ہوتے، کچھ لوگ اگر محاذ جنگ سنبھالتے ہیں تو کچھ لوگوں کو علم وفن کی تدریس کے لیے بھی اپنی جگہ رہنا ضروری ہے اور کچھ لوگوں کو معاشرے کی اصلاح اور لوگوں کی دینی تربیت میں مشغول رہنا بھی ضروری ہے۔ کیا قرآن کریم کی اس ہدایت سے اعظمی صاحب اور ان کے ہم مذہب اتفاق نہیں رکھتے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ۔ (التوبۃ: ۱۲۲) اور تم میں ایک جماعت ہونی چاہیے جو دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرے اور اپنی قوم کو (عذاب آخرت سے) ڈرائے (یعنی ان کی تہذیب نفس کرے)

امور سلطنت کی انجام دہی کے لیے اراکین سلطنت کو محاذ جنگ سے زیادہ شہر میں رہنا لازمی ہے۔ تمام لوگوں کا جنگ کے لیے نکل جانا، امور سلطنت میں خلل وانتشار اور نقصان امن کا سبب ہوگا۔ پھر اگر جہاد نہ کرنے کا الزام صوفیوں پر ہے تو یہی الزام فقہا اور محدثین پر بھی عائد ہونا

چاہیے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، جیسے ائمۂ فقہ اور صحاح ستہ کے جامعین، امام بخاری، امام مسلم، امام نسائی، امام ترمذی، امام ابن ماجہ، امام ابوداؤد اور ان جیسے دیگر محدثین نے کب تلوار بدست جہاد کیا ہے؟

منکرین تصوف، ذرا تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، عباسیوں، امویوں، ترکوں، سلجوقیوں اور خلجیوں وغیرہ کے عہد میں علما، حکما، فقہاء، ائمۂ حدیث، علمائے فلسفہ و منطق کی بڑی تعداد میدان جہاد کے بجائے شہروں اور دیہاتوں میں بیٹھ کر اپنے فرائض منصبی انجام دیتی نظر آئے گی۔ پروفیسر اعظمی خلافت راشدہ کی تاریخ پر بھی نظر ڈال لیں، کیا عہد صدیقی و فاروقی میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ لوگوں سے خالی ہو جاتا تھا۔ تمام لوگ ہمہ وقت میدان جہاد میں ہوتے تھے؟ عہد تابعین کے فقہاو محدثین، زمانۂ جنگ میں بھی مسجد نبوی میں درس دیتے نظر آتے ہیں۔

افراد کار کی یہ تقسیم فطری ہے اور قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ سورۂ مزمل کی آخری آیت ملاحظہ کریں: عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَى وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ۔ (المزمل:۲۰)

اعظمی صاحب یہ بھی بتا دیں کہ عباسیوں اور امویوں کے زمانے میں جتنی جنگیں ہوئیں، ان کا فائدہ کس کو ہوا؟ اسلام کو فائدہ ہوتا تو خلافت راشدہ قائم ہو جاتی، مسلمانوں کو فائدہ ہوتا تو ملک سے ظلم و ستم کا خاتمہ ہو جاتا، فائدہ صرف حکمراں طبقے کو ہوتا رہا، ان کے خزانے مال غنیمت سے بھرتے رہے، ان کی آغوش میں حسین کنیزیں آتی رہیں، ان کے عیش و نشاط کی محفلیں زیادہ بارونق ہو گئیں، جہاد تو ایک آپریشن ہے، زمین پر امن و امان قائم رکھنے اور اللہ کا قانون نافذ کرنے کی ایک صورت ہے، انسانیت کے جسم پر پیدا ہونے والے ناسور کو کاٹ کر پھینک دینے کے لیے یہ آپریشن ضروری ہے، اعظمی صاحب بتا سکتے ہیں کہ جہاد کا سلسلہ جاری رہنے کے باوجود، اسلام کے صحت جسم پر جبر و استبداد اور ظلم و ناانصافی کے ناسور کیوں بڑھتے رہے؟

صوفیوں کی تاریخ میں جہاد بالسیف کی کئی مثالیں بھی موجود ہیں لیکن منکرین تصوف نے کب جہاد کیا؟ جنہوں نے تصوف کو ''چنیا بیگم'' کہہ کر اس کا استہزا کیا تھا وہ صرف تخیل میں جہاد کرتے رہے۔ ان کے ہاتھ میں کبھی تلوار نہیں دیکھی گئی، یہاں تک کہ ''سلطنت خداداد'' کی سرزمین میں پہنچنے کے بعد بھی کوئی اسلامی قانون نافذ نہیں کرا سکے بلکہ وہاں بھی رائے عامہ حاصل کرنے کے لیے الیکشن کا وہی طریقہ برقرار رکھا جو یہود و نصاریٰ کا رائج کردہ ہے۔ ہندوستان میں ووٹ دینے کو معاونت شرک کہتے تھے اور سرزمین پاکستان میں اسی طریقۂ انتخاب اور ان ہی قوانین کے نفاذ کو جائز سمجھتے تھے جو ہندوستان میں انگریز جاری کر گئے تھے۔

صوفیہ پر افلاس کا طعنہ

اعظمی صاحب، محاسن اخلاق میں تفریق کا عنوان قائم کر کے صوفیہ پر الزام ثابت نہ کر سکے تو ان پر افلاس پسندی کا الزام عائد کر دیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں افلاس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے، اس دعوے پر ان کو قرآن کریم سے کوئی واضح دلیل نہیں ملی تو کھینچ تان کر کے انہوں نے بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۲۹ سے کام چلانے کی کوشش کی ہے، لیکن وہ اس میں خود الجھ گئے ہیں اور اپنا موقف واضح نہیں کر سکے۔ آیت مذکورہ کا جو ترجمہ انہوں نے کیا ہے، اس میں ان کے اضافی جملے نے ان کے استدلال کو اور کمزور کر دیا ہے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے: ''تم نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ ہی اس کو بالکل کھول دو (یعنی فضول خرچی کرو)'' اگر ہم ان کے وضاحتی جملے کو تسلیم کر لیں تو آیت کریمہ سے فضول خرچی کی مذمت ثابت ہوگی نہ کہ افلاس کی، اگرچہ افلاس کا ایک سبب فضول خرچی بھی ہے، لیکن انہی لوگوں کے لیے جو محدود اور بندھی ٹکی آمدنی رکھتے ہیں۔ فضول خرچی یقیناً ان کی معیشت کو متاثر کرے گی، لیکن وہ لوگ جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے، آمدنی کے ذرائع وسیع ہیں، وہ افلاس تو کجا تنگی کا بھی شکار نہیں ہوتے۔ اعظمی صاحب آیت مذکورہ سے افلاس کی مذمت ثابت کرنا چاہتے ہیں، مگر ان کے طرز استدلال سے ثابت یہ ہو رہا ہے کہ افلاس کا ایک ہی سبب ہے، فضول خرچی اور فضول خرچی کا ایک ہی نتیجہ ہے افلاس۔ ان کے اس نظریے سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ فضول خرچی قلیل آمدنی والوں کو مفلس بناتی ہے، دولت مند کی فضول خرچی افلاس کا سبب نہیں ہے، گویا دولت مند کے لیے فضول خرچی جائز ہوئی اور غیر دولت مند کے لیے نا جائز۔ قارئین ملاحظہ کریں یہ ہے اعظمی صاحب کی فضول اور واہی فکر کا نمونہ۔ وہ آیت قرآنی کی ایسی تعبیر و تشریح کر رہے ہیں جو پورے حالات پر صادق نہیں آتی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی بات بیان فرمائے جس کا مقصد صحیح نہ ہو، وہ فتقعد ملوما محسورا کو ولا تبسط کل البسط کی علت بنا رہے ہیں اور وہ صرف متوسط طبقے کے لیے علت ہے، اہل ثروت کے لیے نہیں۔ اعظمی صاحب چشم بینا رکھتے ہوں تو اس کی مثالیں ان کو اپنے ارد گرد مل جائیں گی۔ اہل ثروت کی فضول خرچیاں جاری رہتی ہیں، پھر بھی ان کو پیسے کی تنگی نہیں ہوتی۔

اصلاً آیت مذکورہ میں نہ افلاس کی مذمت ہے نہ فضول خرچی کا ذکر، فضول خرچی کو ''تبذیر'' کے لفظ سے اسی سورہ میں ان ہی آیات میں بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ ''تبذیر'' کو شیطانی کام قرار دیا گیا ہے۔ فوراً ہی اس کو آیت ۲۹ میں ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انفاق میں اعتدال کی روش اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے، مال کا خرچ دنیوی کاموں میں ہو یا دینی کاموں میں سب میں اعتدال مقصود ہے، ایسا نہ ہو کہ کسی کار خیر کے جوش میں

سب مال اٹھا کر دے دے اور بعد میں تنگی معیشت کی بنا پر اس کو اپنے ایثار پر پشیمانی ہو تو ایثار و اخلاص کے باوجود اس کا اجر مارا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے مخلص بندے حالات کا شکار ہو کر آئندہ ایثار و قربانی سے منہ موڑ لیں؛ کیوں کہ زندگی کے حقائق بہت تلخ ہیں اور حالات کی سختی بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیتی ہے۔ ایسے مواقع میں نفس و شیطان بھی اپنا کام شروع کر دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بعض اصحاب کو بھی رسول اللہ ﷺ نے تمام مال و جائداد راہ حق میں دینے سے منع فرمایا اور یہی سبب ہے کہ انسانی طبیعت و مزاج کے پیش نظر رسالت مآب ﷺ نے محصلین زکوٰۃ کو زکوٰۃ میں کرائم اموال الناس لینے سے روکا۔ ایک سخی و جواد شخص کو بھی سخاوت میں اعتدال چاہیے، ذاتی ضرورتوں میں بے اعتدالی بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا کر دے گی۔

یہاں پر یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیت کے مخاطب عوام ہیں ورنہ سب مال غزوہ تبوک میں دے دینے پر فتقعد ملوما محسورا کی تفسیر صدیق اکبر ہوتے۔ (دیکھئے سیر رحمۃ للعلمین، ج:۱)

''عمر فاروق نے تمام اثاث نقد و جنس کا نصف جو کئی ہزار روپیہ تھا، پیش کیا، ابو بکر صدیق جو کچھ لائے اگر چہ وہ قیمت میں کم تھا مگر معلوم ہوا کہ وہ گھر میں اللہ و رسول کی محبت کے سوا اور کچھ بھی باقی چھوڑ کر نہ آئے تھے''

کیا حضرت صدیق کا یہ ایثار جناب اعظمی کے مطابق قابل ملامت ہے؟ ہر گز نہیں، ایسے ہی مخلصین مقربین کے متعلق کہا گیا ہے: وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (الحشر:۹) پروفیسر موصوف اور ان کے ہم خیال حضرات مطالعے سے اپنی معلومات میں اضافہ تو کر لیتے ہیں لیکن رموز دین سے بے خبر رہتے ہیں۔ اعظمی صاحب نے اپنے نظریے کی تائید میں اقبال کا حوالہ پیش کیا ہے، حالاں کہ یہ شعر بھی اقبال ہی کا ہے۔

اگر چہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

اعظمی صاحب نے، صوفیہ کے ''فقر غیور''، ''فقر جسور'' اور ''فقر حجازی'' کو افلاس کہہ کر اس کا استہزا کیا ہے، ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن و حدیث میں ''فتنۂ افلاس کے بجائے ''فتنۂ دنیا'' اور فتنۂ مال'' سے بچنے کی ترغیب زیادہ ہے۔ مال زیادہ، گمرہی اور بد اخلاقی کا سبب ہوتا ہے۔ ایک حدیث ملاحظہ فرمایئے:

عن کعب بن عیاض قال سمعت رسول اللہ ﷺ ان لکل امۃ فتنۃ و فتنۃ امتی المال۔ (ترمذی ج:۲، باب ماجاء ان فتنۃ ھذہ الامۃ المال)

کعب بن عیاض سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے فرماتے ہوئے سنا، بے شک ہر امت میں ایک فتنہ ہے اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث ذیل بھی منکرین تصوف کے لیے کافی ہوگی:

فو اللہ ماالفقر اخشی علیکم ولکن اخشی علیکم ان تبسط علیکم الدنیا کمابسطت علی ما کان قبلکم۔ (ج:۲، باب ما یحذر من زھرۃ الدنیا)

یعنی مجھ کو تمہارے فقیر ہو جانے سے اندیشہ نہیں، مجھے ڈر اس بات کا ہے کہ تم پر دنیا غالب آجائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر غالب آ گئی تھی۔ آگے کے الفاظ ہیں کہ دنیا تمہارے آپس میں جدال پیدا کرے گی اور تم دنیا کے پیچھے بھاگو گے اور دنیا تم کو راہ سے بھٹکائے گی۔ صوفیۂ کرام نے فقر کی تائید بلا وجہ نہیں کی ہے۔ کتاب وسنت اور رسول اللہ ﷺ کے طریقۂ زندگانی کے مطالعے کے بعد ہی وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ہر زمانے میں حب دنیا اور ہوس زر نے مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے، بڑی بڑی مسلم سلطنتیں اسی حب دنیا میں خاک بسر ہو گئیں، مال وزر اور تخت و تاج کی ہوس ہی تھی جس میں پڑ کر مسلم حکمرانوں نے خوں ریزیاں کیں۔ کیا آج دنیا اس فتنے میں مبتلا نہیں ہے؟ اعظمی صاحب کو کچھ نظر نہیں آتا تو اس میں اہل نظر کا کیا قصور؟ یہ حقیقت تو نصف النہار پر ہے۔ صوفیہ نے اپنے لیے فقر کو اختیار کیا تو رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کیا۔ ترمذی کی حدیث کے مطابق جب رسول اللہ ﷺ کو یہ اختیار دیا گیا کہ آپ چاہیں تو آپ کے لیے مکے کی کنکریوں کو سونے چاندی میں تبدیل کر دیا جائے (یعنی آپ متمول اور شاہانہ زندگی گزاریں) تو آپ نے فقر کی زندگی کو ترجیح دیا اور فرمایا: نہیں، اے رب! میں چاہتا ہوں کہ ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں تاکہ تجھے یاد رکھوں۔ اعظمی صاحب کے دعوے کے مطابق اسلام نے افلاس کو ناپسند کیا ہے، یہ مفلسی (فقر) کی کون سی قسم ہے؟ اور وہ کون سا اسلام ہے جو رسول علیہ السلام کی مرضی اور خواہش کے خلاف فقیری ومسکینی کو ناپسند قرار دیتا ہے؟ یہ اعظمی صاحب اور ان کے ہم مذہبوں کا خود ساختہ اور خانہ ساز مذہب ہے۔ صوفیہ کا فقر، اختیاری فقر ہے، اضطراری نہیں ہے۔ اس فقر کی اہمیت جناب اعظمی کیا جانیں؟ یہ رسول اللہ ﷺ کے فقر اختیاری کا عملی نمونہ ہے، جو صرف صوفیوں کے یہاں ملتا ہے۔ فقر اختیاری کی اہمیت حدیث ذیل میں ملاحظہ کیجیے:

حضرت انس سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مولیٰ! مجھے حالت مسکینی میں زندہ رکھ، حالت مسکینی میں موت دے اور قیامت کے دن مسکینوں کے ساتھ ہی میرا حشر فرما۔ حضرت عائشہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟ فرمایا: مساکین مالداروں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ (ترمذی)

اولیا کی کارسازی کا عقیدہ

اعظمی صاحب کی اس تحریر میں جو بات ان کے لیے ''خار مغیلاں'' بنی ہوئی ہے، وہ ''اولیاء کی کارسازی کا عقیدہ'' ہے۔ یہ بھی ان کا افترا ہے۔ کارسازی اور کارکشائی پر لغوی اور معنوی بحث کی جائے تو بات طویل ہو جائے گی، عقیدے کے طور پر کارساز، کارآفریں اور کارکشا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اللہ اپنے بندوں سے کام لیتا ہے، اس پر گفتگو سطور ماسبق میں کی جا چکی ہے۔ انبیا اور اولیا کی کارسازی اللہ کی عطا کردہ قوتوں کی وجہ سے ہے، خواہ زندگی میں ہو یا بعد وفات، اعظمی صاحب کے کہنے کے مطابق، اولیا کے کارساز یعنی متصرف ہونے کا عقیدہ صوفیوں کا وضع کردہ ہے اور تمام اہل تصوف نے سلف ہوں یا خلف، یہ عقیدہ تیار کیا ہے۔ اتنا بڑا الزام بغیر کسی دلیل و برہان کے، صالحین امت پر عائد کرنے کی جرات وہی کر سکتا ہے، جس کو نہ خوف خدا ہو نہ یوم آخرت کے احتساب پر یقین۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا۔ (الکہف: ۵)

قرآن خود اس کی تائید کرتا ہے کہ انبیا اور اولیا اللہ کے حکم سے کارسازی و کارکشائی کرتے ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک درباری جن کو مفسرین آصف بن برخیا کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ان کی امت کے اولیا میں تھے، انہوں نے ایسا تصرف کیا کہ عقول انسانی آج بھی اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ واقعہ اہل علم کو معلوم ہے مگر قارئین کی سہولت کے لیے اس کا ذکر یہاں پر ضروری ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے دربار میں بیٹھ کر ملکۂ سبا کا عظیم الشان اور غیر معمولی تخت اٹھا کر لانے کی فرمائش کی، تو دربار میں دو دعوے دار اٹھے، ایک جن اور ایک انسان، جن بڑی قوتوں والا عفریت تھا، اس نے کہا: أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ۔ آپ کے دربار برخواست کرنے سے پہلے میں وہ تخت لے آؤں گا، لیکن دوسرے درباری نے دعویٰ کیا کہ آپ کی پلک جھپکتے میں لے آؤں گا، ان کی خصوصیت قرآن نے یہ بیان کی ہے: وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ۔ اس کے پاس کتاب کا علم تھا۔ انہوں نے أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ کا دعویٰ کیا۔ ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا اور تخت سبا سامنے رکھا تھا۔ نہ ان کو کسی نے دربار سے جاتے دیکھا اور نہ تخت اٹھا کر لاتے دیکھا، قرآن کے سیاق و سباق کے اعتبار سے وہ جن نہیں انسان تھے، اگر منکرین ان کو جن ہی سمجھنے پر مصر ہیں تو پھر جنوں کو کارساز تسلیم کرنا ہوگا۔ لیکن آصف بن برخیا نے اتنا بڑا کارنامہ روحانی قوت سے ہی انجام دیا، ایسے وہبی اور روحانی علوم کو منکرین تصوف اور خوارج تسلیم نہیں کرتے۔

یہود و نصاریٰ کے متعلق اعظمی صاحب کا یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ: ''اولیا کی کارسازی کا عقیدہ ہی وہ شرک تھا جس میں اہل کتاب مبتلا ہوئے''، اعظمی صاحب نے اپنے علم و تحقیق کے زعم

میں قرآن کی شہادت کو بھی نظر انداز کیا۔ اہل کتاب کا شرک وہ نہیں تھا بلکہ ان کا شرک، خدا کے لیے بیٹا قرار دینا تھا: وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ ذَٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ۔ (التوبہ: ۳۰)

قرآن کی کوئی ایسی شہادت ہماری نظر میں نہیں ہے کہ اولیا کی کارسازی کو قرآن نے یہود و نصاریٰ کا شرک قرار دیا ہو، بلکہ وہ خود کو بھی نعوذ باللہ، اللہ کی اولاد سمجھتے تھے۔ نحن ابناء اللہ و احباءہ۔ (مائدہ: ۱۸) محض صوفیہ کو مطعون کرنے کے لیے اعظمی صاحب نے قرآن کریم کے بالکل خلاف بات لکھی ہے۔

فقط زاہد کی کج فہمی تھی ورنہ کچھ نہ تھا قصہ
وہ محرابیں کہے ہم ابروئے خمدار کہتے ہیں

شریعت اور طریقت کا فرق

طریقت کے متعلق موصوف لکھتے ہیں: ''طریقت کی اصطلاح، تصوف کے لٹریچر میں کثیر الاستعمال ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ شریعت سے الگ ایک چیز ہے اور یہ ایک زبردست مغالطہ انگیزی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ شریعت اور طریقت دین کے دورخ ہیں''

مزید لکھتے ہیں: ''جہاں تک طریقت کے دوسرے جز کا تعلق ہے یعنی خدا کے اوامر ونواہی کی اچھے ڈھنگ سے پابندی تو یہ عین شریعت اور اس کا مقصود ہے۔ اس اعتبار سے طریقت شریعت ہی کا ایک حصہ ہے، اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ مجدد الف ثانی نے لکھا ہے کہ شریعت کے تین جز ہیں علم، عمل اور اخلاص، طریقت وحقیقت دونوں شریعت کے تیسرے جز یعنی اخلاص کے لیے شریعت کے خادم ہیں''

گویا اعظمی صاحب خود ہی اعتراض بھی کر رہے ہیں اور خود ہی جواب بھی دے رہے ہیں۔ حضرت مجدد تو حلقۂ صوفیہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، ان کے خیالات سے اعظمی صاحب گویا اتفاق کر رہے ہیں۔ یہ چند سطریں محض صوفیہ صافیہ متقدمین رحمہم اللہ کے خلاف الزامات رفع کرنے اور تصوف کے دفاع میں سپرد قلم کی گئی ہیں۔ کیونکہ

احب الصالحین ولست منهم
لعل اللہ یرزقنی صلاحا

○○○

مولانا طفیل احمد مصباحی

تصوف۔شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی نظر میں

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی: ۱۸۲۳ء) کے خانوادہ کا علوم وفنون کی ترقی اور دین وشریعت کی ترویج واشاعت میں نمایاں کردار رہا ہے۔قرآن وحدیث،فقہ وتفسیر اور تصوف اور تراجم قرآن کی جو خدمات اس خاندان کے جلیل القدر علماومحدثین اور صوفیہ نے انجام دی ہیں،انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

شاہ ولی اللہ محدثِ دہلوی کے وصال کے بعد آپ کے علمی وروحانی جانشین سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی: ۱۸۲۳ء) نے والدگرامی کی نیابت کا حق ادا کردیا۔ ایک جلیل القدر عالم دین،مایہ ناز محدث،لاجواب مفسر،بلند پایہ فقیہ ومحقق،بے مثال متکلم اور سلوک وتصوف کے امام کی حیثیت سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عظمت کا قصیدہ ملک و بیرون ملک میں آج بھی پڑھا جاتا ہے۔آپ نے نصف صدی تک دین متین کی خدمات انجام دیں اور مطلع ہند پر خورشید علم وفضل بن کر چمکتے رہے۔ہزاروں تشنگان باطن کو علم ومعرفت کی شراب طہور سے شادکام فرمایا اور تصنیف وتالیف کا قابل قدر ذخیرہ قوم مسلم کے حوالے کرکے داعی اجل کو لبیک کہا۔حضرت شاہ صاحب کی علمی جلالت اور عبقریت کا اعتراف کرتے ہوئے سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لکھتے ہیں:

''اعلم العلما،افضل الفضلا،اکمل الکملا،اعرف العرفا،اشرف الافاضل،فخر الاماجد و الاماثل،رشک سلف،داغ خلف،افضل المحدثین،اشرف علمائے ربانیین مولانا وبالفضل اولانا شاہ عبدالعزیز،ذات فیض سمات ان حضرت بابرکت کی،فنون کسبی ووہبی اور مجموعۂ فیوض ظاہری و باطنی تھی،علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اس میں یکتائی اور یک فنی نہ تھی،علم حدیث وتفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہوگیا۔'' (آثار الصنادید، ج:۲،ص:۵۱،قومی کونسل،دہلی)

سرسید احمد خان نے بجالکھا ہے کہ آپ کے بعد ہندوستان سے علم حدیث رخصت

ہوگیا۔شاہ صاحب نے اپنے زمانے میں حدیث وتفسیر کی جو خدمات انجام دیں اس سے سمرقند و بخارا کی یاد تازہ ہوگئی۔کہا جاتا ہے کہ اس زمانے کے ایک عالم نے اس لیے سیاحت کی کہ اسے علم حدیث کا کوئی ایسا استاذ ملے جو شاہ صاحب کا شاگرد نہ ہو،مگر پورے ہندوستان میں اسے ایک مدرس بھی ایسا نہیں ملا۔

آپ مرجع علما و مشائخ تھے،علوم عقلیہ ونقلیہ میں کامل دسترس رکھتے تھے،آپ کی ذات گرامی کے فیضان سے نہ صرف دہلی بلکہ برصغیر کے گوشے گوشے میں علم وہدایت کا اجالا پھیلا، آپ کی تصانیف وفتاویٰ اور دعوت وارشاد سے مسلمانوں کی ہدایت ہوئی اور مذہب میں در آئے داخلی اور خارجی فتنوں کا سد باب ہوا۔

نواب صدیق بھوپالی لکھتے ہیں:

''کثرت حفظ،علم تعبیر رویا،وعظ وانشا،تحقیقات علوم اور حریف کے ساتھ بحث ومناظرہ میں اپنے تمام اقران ومعاصرین میں ممتاز تھے،عمر بھر تدریس وفتویٰ نویسی،مختلف علمی معرکوں میں حتمی فیصلہ کرنے والے،وعظ ونصیحت،مریدوں کی روحانی تربیت اور شاگردوں کی علمی رہنمائی میں زندگی بھر مصروف رہے'' (اتحاف النبلاء،ص:۲۹۶)

آپ کی فکر وشخصیت کا ایک نمایاں پہلو سلوک ومعرفت اور احسان وتصوف سے آپ کی گہری وابستگی اور ذہنی آمادگی بھی ہے،آپ جتنے بڑے عالم ومحدث تھے،اس سے کہیں بڑھ کر صوفی اور جادۂ سلوک ومعرفت کے مسافر تھے،بھلا ایسا کیوں نہ ہو،ایک عالم ربانی کی شان بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ علم کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ اخلاص کی دولت سے مالا مال ہوا کرتے ہیں۔''اخلاص فی العلم والعمل'' کا نام ہی ''تصوف'' ہے۔شاہ صاحب کی پوری زندگی تصوف اور اخلاص فی العلم والعمل کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی،آپ اپنے مریدین کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے،یہی وجہ ہے کہ مریدوں کی روحانی تربیت کا سلسلہ زندگی بھر جاری رکھا،آپ کی مجلس میں بیٹھنے والا علم وادب اور اخلاص وتصوف کا درس لے کر اٹھتا،معرفت کے رموز واسرار سے واقف ہوتا،طالب حق شراب معرفت پیتا اور دین ودنیا کی سعادتوں سے مالا مال ہوتا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نہ صرف یہ کہ تصوف کے قائل تھے بلکہ تصوف کی طرف مائل بھی تھے۔حد درجہ سلوک ومعرفت کے میدان میں آپ ''ولی اللہی سلسلہ'' کے نقیب وترجمان تھے۔اور ولی اللہی سلسلۂ تصوف تمام سلاسل پر محیط ہے۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس حقیقت کا یوں اعتراف کیا ہے''ظاہری طور پر اس فقیر کو بیعت،صحبت،خرقہ،اجازت اور تلقین اشغال میں روئے زمین پر موجود تمام سلاسل طریقت یا ان میں سے اکثر کے ساتھ ارتباط

اور نسبت حاصل ہے" (رسائل شاہ ولی اللہ، ص:۵)

مرزا محمد بیگ دہلوی لکھتے ہیں:

"باید دانست کہ طریقہ سلوک ایشاں (شاہ عبدالعزیز دہلوی) موسوم بہ ولی اللہی است، وآں اقرب طرق وصول الی اللہ است" (فتاویٰ عزیزی، ج:۱ ص:۳)

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا طریقۂ سلوک و معرفت "ولی اللہی طریقۂ سلوک" سے موسوم ہے اور یہ وصول الی اللہ کی قریب ترین راہ ہے۔

ولی اللہی سلسلۂ تصوف کیا ہے؟

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "تفہیمات الٰہیہ" میں تحریر فرماتے ہیں:

قد من اللہ سبحانہ علی و علی اھل زمانی بان منحنی طریقا من السلوک ھی اقرب الطرق وھی مرکبۃ من خمس اقترابات اعنی الایمان الحقیقی، وقرب النوافل وقرب الوجوب وقرب الفرائض وقرب الملکوت وجعل ھذہ الطریقۃ غایۃ من ارادھا اتاھا اللہ و فھمنی ربی جل جلالہ انا جعلناک امام ھذہ الطریقۃ۔

(فتاویٰ عزیزی، ابتدائیہ، اول)

ترجمہ: اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایک سلسلۂ طریقت عطا فرما کر ہم تمام لوگوں پر انعام واحسان فرمایا۔ یہ سلسلہ دیگر سلاسل سے قریب تر ہے اور پانچ چیزوں سے مرکب ہے: (۱) ایمان حقیقی (۲) قرب نوافل (۳) قرب وجوب (۴) قرب فرائض (۵) قرب ملکوت۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہے وہ اس سلسلے سے وابستہ ہو جائے، خدا تک رسائی ہو جائے گی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے اس سلسلے کا امام مقرر کیا ہے۔

"ولی اللہی سلسلۂ تصوف" کی تفصیلی معلومات کے لیے "القول الجلی" "الانتباہ فی سلاسل الاولیا"، "انفاس العارفین" وغیرہ کا مطالعہ مفید ہوگا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز آخری دم تک "ولی اللہی سلسلۂ تصوف" سے وابستہ اور اس کے فروغ و استحکام کے لیے کوشاں رہے۔ مریدین کی روحانی تربیت بھی اسی طریقے کے مطابق انجام دیتے۔ شاہ صاحب حقیقی معنوں میں اپنے والد گرامی کے علمی و روحانی جانشین تھے۔ آپ کی زندگی میں تصوف کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ ہم عصر علما و مشائخ نے "رئیس الاتقیا" اور "قدوۃ الواصلین" کے نام سے آپ کو یاد کیا۔

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی کے بقول آپ کی تصانیف عالیہ کی تعداد ستائیس ہے، جن میں سے ایک "مسائل تصوف" کے نام سے فارسی زبان میں ہے۔ افسوس! بروقت یہ کتاب دستیاب نہ

ہوسکی، اگر یہ کتاب مل جاتی تو موضوع سے متعلق مزید گفتگو ہوسکتی تھی۔ اب تو ''فتاویٰ عزیزی'' اور ''تفسیر عزیزی'' کا اصل نسخہ بھی کم یاب ہے۔ ان دو کتابوں کا اردو ایڈیشن ہی مارکیٹ میں دستیاب ہے، تلاش بسیار کے بعد ''فتاویٰ عزیزی'' کا فارسی نسخہ دارالافتا جامعہ اشرفیہ، مبارکپور کی لائبریری میں دست یاب ہوا۔

''فتاویٰ عزیزی'' علوم ومعارف کا ایک گراں قدر خزانہ ہے، شرعی احکام اور مختلف دینی وفقہی مسائل کا قرآن وحدیث وارشادات ائمہ کی روشنی میں بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے، فتاویٰ عزیزی وتفسیر عزیزی کو از سرنو اپڈیٹ کر کے توضیح وتشریح اور تخریج کے ساتھ اصل فارسی زبان میں منظر عام پر لانا بہت ضروری ہے تاکہ اس علمی سرمائے کو زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھا جا سکے۔

شاہ صاحب نے ''فتاویٰ عزیزی'' میں مختلف مقامات پر تصوف کے چند بنیادی مسائل ونظریات پر بڑی نفیس بحثیں کی ہیں۔ یہ علمی افادات ہدیۂ قارئین ہیں۔

جو لوگ تصوف کو قرآن وحدیث سے خارج عجمی تصورات کا مجموعہ قرار دیتے ہیں، انہیں چاہیے کہ شاہ صاحب کی تحریر کا گہرا مطالعہ کریں اور تصوف کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ تصوف رہبانیت کا دوسرا نام یا پھر عجمی تصورات کا مجموعہ نہیں، بلکہ تصوف کا بنیادی ماخذ ومنبع قرآن وحدیث ہیں، یہ وہ روحانی پودا ہے جسے شریعت اسلامی نے اپنی شفاف نہروں سے سیراب کیا ہے۔ اسلامی تصوف کل بھی مسلمانوں کی ضرورت تھی، آج بھی ضرورت ہے اور قیامت تک اس کی ضرورت باقی رہے گی۔

طریق جذب وسلوک

''تصوف'' تزکیۂ نفس کا ایک علمی دستور، قرب الٰہی کا ایک مضبوط ذریعہ اور اوصاف حمیدہ کے زیور سے آراستہ ہو کر صفات ذمیمہ سے اپنے وجود کو پاک کرنے کا نام ہے۔ طریقۂ جذب وسلوک اختیار کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ تک رسائی حاصل کر سکے۔

شاہ سید محمد ذوقی فرماتے ہیں:

''سلوک'' خدائے تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ ہے، بطریق سیر کشفی عیانی نہ کہ بطریق استدلالی۔ اس راستہ پر چلنے والے کو ''سالک'' کہتے ہیں۔ وقت خاص یا اوقات خاص میں مبتدی پر یاد الٰہی کا اس درجہ غلبہ ہوتا ہے کہ دوسرے خیالات محو ہو جاتے ہیں۔ یہ منجانب اللہ ایک کشش ہوتی ہے جو باعث ترقیات مزید ہے۔ اس حالت کو ''صفائی مبتدی'' کہتے ہیں،...... اس مرتبہ کے صوفی کو ''سالک مجذوب'' کہتے ہیں۔ صوفی پر جب ایسے اوقات آتے ہیں جن میں اس پر تجلیات

وارد ہوتی ہیں تو اس حالت کو ''صوفی متوسط'' کہتے ہیں۔ اور اس مرتبہ کے صوفی کو ''مجذوب'' کہتے ہیں۔ جب صوفی واصل ذات ہو کر تمام مقام تمکین میں پہنچتا ہے تو اس حالت کو ''مقام منتہی'' کہتے ہیں اور اس مرتبہ کے صوفی کو ''مجذوب سالک'' کہتے ہیں''

(اصطلاحات تصوف، ص:۱۹۹، خانقاہ کمالیہ، حیدر آباد)

سلوک کے مندرجہ ذیل پانچ بنیادی تقاضے ہیں:

(۱) حصول علم و طاعت حق (۲) ارادت شیخ (۳) طعام، منام اور کلام میں تخفیف (۴) کثرت ذکر و عبادت (۵) تفکر و مراقبہ۔ (سلوک و تصوف کا علمی دستور، ص:۴۹)

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو احسان و تصوف اور جذب و سلوک کا فکری و عملی درس والد ماجد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے ملا۔ حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں:

''ہماری صحبت اور طریقت و سلوک حاصل کرنے کا سلسلہ صحیح اور متصل و مسلسل سند کے ذریعے آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ثابت ہے'' (رسائل شاہ ولی اللہ، ص:۹۰)

رسالہ ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' میں لکھتے ہیں:

''روحانی طور پر مجھے بیعت، صحبت، خرقہ پوشی، فیضان توجہ اور تلقین کا تعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی سے حاصل ہے'' (مصدر سابق، ص:۱۰۰، کتب خانہ، امجدیہ، دہلی)

اس اقتباس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز کا خاندان اور ان کے آبا و اجداد، طریقت و معرفت اور جذب و سلوک کے مرد میدان تھے اور شاہ عبدالعزیز کو یہ طریقۂ روحانیت ورثے میں ملا تھا۔ آپ نے بھی اپنی تعلیم و تلقین اور دعوت و تبلیغ میں اس روحانی نظام کا خوب خوب پرچار کیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فکری و عملی اعتبار سے تصوف کے حد درجہ شیدائی تھے اور اس طریقۂ روحانیت کو دینی و اخروی فلاح و کامرانی کا موثر ترین ذریعہ سمجھتے تھے۔

شاہ صاحب ''جذب اور سلوک'' کی حقیقت سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

''لفظ جذب و سلوک چہار معنیٰ دارد، اول: گسستہ گشتن رشتہ عقل بصدمہ وارد و ناگسستن آں۔ دوم: ظہور آثار مطلوبیت و محبوبیت در طالب و ظہور آثار محبت، ورود طلب در مطلوب ...... لیکن مراد از آثار محبوبیت سبق مشاہدہ است بر مجاہدہ و مراد از آثار محبت سبق مجاہدہ است بر مشاہدہ۔ سوم: خرق حجب وجود بفنا و بقا و تہذیب باطن باخلاق صالحہ و اقوال صالحہ فاضلہ۔ چہارم: وقوع سلوک بنوع مصالح معاش بوجہے کہ ایں مصالحہ فوت نہ شود و ایں مراتب را فہمیدہ تلقین آں نمودن می تواند شد، از کسے کہ قوت باطن دارد و طے مراتب فنا و بقا کردہ است۔ واللہ اعلم''

(فتاویٰ عزیزی، اول، ص:۱۶۸، رحمن گل پبلشر، پشاور، پاکستان)

ترجمہ: جذب اور سلوک کے چار معنی ہیں: پہلا معنی ہے صدمۂ وارد سے رشتہ عقل کا ٹوٹنا یا نہ ٹوٹنا دوسرا معنی یہ ہے کہ طالب میں مطلوبیت اور محبوبیت کے آثار ظاہر ہوں اور مطلوب میں محبت کے آثار اور ورود طلب کا ظہور ہو، آثار محبوبیت سے مراد یہ ہے کہ مشاہدہ، مجاہدہ پر مقدم ہو اور آثار محبت کا مطلب ہے کہ مجاہدہ، مشاہدہ پر مقدم ہو۔ تیسرا معنی ہے فنا و بقا میں وجود کے پردے کا پھٹ جانا اور اخلاق صالحہ واقوال فاضلہ سے باطن کو آراستہ کرنا۔ چوتھا معنی طریقہ مصالح معاش کے ساتھ وقوع سلوک ہے، بایں طور کہ یہ مصالح فوت نہ ہوں تو انہیں مراتب سمجھ کر ان کی تلقین ہوسکتی ہے، ایک ایسے شخص سے جو باطن کی قوت رکھتا ہے اور فنا و بقا کے مراحل طے کر چکا ہے۔ واللہ اعلم۔

یہاں سلوک کا دوسرا معنی بعینہ وہی ہے جسے سید محمد ذوقی نے بیان کیا ہے: ''مبتدی سالک پر یاد الٰہی کا اس درجہ غلبہ ہوتا ہے کہ دوسرے خیالات محو ہو جاتے ہیں''۔

''ایک دوسرے مقام پر آپ نے ''جذب و سلوک'' کی توضیح اس طرح کی ہے۔ ''جذب محض عنایت خداوندی ہے اور سلوک اجتہادات کسبی کا نام ہے'' (دلی کے بائیس خواجہ، ص:۲۵۹)

سیر نظری اور سیر قدمی صوفیہ کرام کے یہاں ایک خاص اصطلاح ہے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی کے کلام میں بھی مستعمل ہے۔ ان دونوں سے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''سیر نظری مشاہدہ مقامی بدون یافتن انوار و آثار آں در خود و سیر قدمی دخول در آں مقام و یافتن انوار و آثار آں در خود'' (فتاویٰ عزیزی، ج:۱، ص:۱۶۸، پشاور، پاکستان)

سیر نظری مشاہدہ مقامی کا نام ہے مگر اس طور پر کہ انوار و آثار سالک کے اندر نہ پائے جائیں اور سیر قدمی سے مراد اس مقام و مرتبے میں داخل ہونا اور اس کے انوار و آثار کا اپنے وجود میں مشاہدہ کرنا ہے۔

تصوف، احسان اور مجاہدہ

حدیث شریف میں تصوف کی تعبیر ''احسان'' سے کی گئی ہے اور قرآن میں مجاہدہ کی تعریف کی گئی ہے: وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ جن لوگوں نے ہماری راہ میں مجاہدہ کیا، ہم ان کی ضرور اپنے راستے کی طرف رہنمائی کریں گے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کے افکار کی روشنی میں احسان اور مجاہدہ کی اہمیت یہ ہے: ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین درجے فرمائے ہیں: اسلام، ایمان، احسان، اصلی مقصود تو احسان ہی ہے اور اسلام بے ایمان معتبر نہیں عبادت کا وجود بدون احسان کے ایسا سمجھنا چاہیے کہ جیسے روح بے بدن کے، ان میں سے ہر ایک کا ایک نتیجہ اور خاصہ ہے، جو شخص اسلام اور ایمان دونوں جمع رکھے، اس کو

نجات نصیب ہوگی اور جو احسان (تصوف) کے مرتبے تک پہنچ جائے اس کو اللہ تعالیٰ کی قربت نصیب ہوگی، گویا احسان ایمان کا کامل درجہ ہے۔'' (شاہ عبدالعزیز کے علمی وفقہی ملفوظات، ص: ۷۵، افادات اشرفیہ، باندہ)

''مجاہدہ'' سے متعلق فرماتے ہیں: ''چار چیزیں ہیں جن سے لڑائی ہوتی ہے اور ان کو مغلوب کرنا ہی مقصود ہوتا ہے (۱) شیطان (۲) نفس (۳) بداخلاقی (۴) دنیا۔

چاہیے کہ نماز، روزہ، لذائذ وحظائظ جو کچھ مناسب وقت ہوں، عمل میں لاوے، بالکل تباہ نہ ہوجاوے'' (ایضا، ص: ۷۸)

تصوف میں بھی انہیں چار چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیا جاتا ہے اور اعمال صالحہ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ شاہ صاحب یہاں مسلمانوں کو تصوف کی اسی اخلاقی تعلیم کا درس دے رہے ہیں۔

سلاسل طریقت کی تائید وحمایت

حضرت شاہ عبدالعزیز اپنے والد شاہ ولی اللہ دہلوی کے مرید وخلیفہ تھے انہیں اپنے والد شاہ عبدالرحیم سے بیعت وخلافت حاصل تھی اور شاہ عبدالرحیم کو کئی سلسلوں سے اجازت حاصل تھی۔ گویا شاہ عبدالعزیز کا گھرانہ مختلف سلاسل طریقت سے وابستہ ایک عظیم علمی وروحانی گھرانہ تھا۔ آپ اپنی تحریر وتقریر میں مختلف سلاسل کو صحیح اور حق گردانتے۔

کسی سائل نے ''سلسلۂ سہروردیہ'' سے متعلق سند دریافت کی تو آپ نے جواب دیا۔

''حضرت مجدد الشیخ احمد السرہندی عن ابیہ الشیخ عبدالاحد عن الشیخ رکن الدین گنگوہی اور اس طرح حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی تک پوری سند بیان کردی اور آخر میں لکھا کہ ''پس محتمل است کہ ایشاں را از اجداد خود اجازت ایں طریقہ رسیدہ باشد بلکہ موروث خاندان ایشاں ہمیں طریقہ باشد و طریقہ چشتیہ وقادریہ ونقشبندیہ از مکتسبات ایشاں ووالد ایشاں باشد''

یہ احتمال ہے کہ شیخ مجدد سرہندی کو اپنے اجداد سے یہ طریقہ پہنچا ہو اور سلسلۂ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ شیخ سرہندی اور ان کے والد کے اکتساب سے ہو۔

''ذکر بالجہر'' کے ضمن میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ''وبناء طریقۂ چشتیہ واویسیہ وقادریہ کہ ہمہ پیران ما اند بر ذکر جہر ست'' (فتاویٰ عزیزی، ج: ۱، ص: ۱۷۰)

یعنی سلسلہ چشتیہ، اویسیہ اور قادریہ ان تمام سلاسل کی بنیاد ذکر بالجہر پر ہے اور ان سلاسل کے جملہ مشائخ ہمارے پیر ہیں۔

مروجہ سلاسل طریقت اور ان کے تمام مشائخ کو ''اپنا پیر ومرشد'' وہی کہہ سکتا ہے جو فکری وعملی لحاظ سے تصوف کا قائل ہی نہیں بلکہ اس کا داعی بھی ہو۔

سلسلۂ چشتیہ، نقشبندیہ اور قادریہ کے پاکیزہ مقاصد اور روحانی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں، ''چشتیوں کا مقصد قوت عشق کا ظاہر کرنا ہے جو انسان کے اندر مخفی ہوتی ہے، اس لیے ابتدا میں جو چیزیں قوت عشقیہ کو نمایاں کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہیں مثلاً ذکر بالجہر وغیرہ ان کو اختیار کرتے ہیں اور نقشبندیوں کا مقصد دلدار کی صورت کا ذہن میں حاضر رکھنا (یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا) اور تصور کرنا ہوتا ہے، جس کو ''تصحیح خیال'' کہتے ہیں اور قادریوں کا اصل مقصد ''تصقیل'' یعنی قلب کو گناہوں کی آلائش اور میل کچیل سے صاف کرنا ہے اور جب وہ آئینہ کی طرح صاف ہو گیا تو ظاہر ہے کہ جو کچھ اس کے مقابل میں ہوگا وہ بھی صاف جلوہ گر ہونے لگے گا''

(شاہ عبدالعزیز کے علمی و فقہی ملفوظات، ص:۶۷، افادات اشرفیہ، باندہ)

بزرگان دین سے گہری عقیدت اور مشائخ و صوفیہ سے سچی محبت شاہ صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ آپ کے اقوال و ارشادات میں صوفیۂ کرام کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔ جب کسی مسئلے میں صوفیہ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تو کسی ایک کے قول کو بالکلیہ رد نہیں کرتے بلکہ صوفیہ کے مختلف آرا کے مابین تطبیق کی راہ ڈھونڈتے۔ تفصیل نیچے آرہی ہے۔

شریعت اور طریقت

صوفیہ کے نزدیک تصوف کے چار رکن ہیں:

(۱) شریعت (۲) طریقت (۳) حقیقت (۴) معرفت

جب سالک میدان سلوک و احسان میں قدم رکھ کر شریعت کی پاس داری کرتا ہے تو طریقت کی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ طریقت کا راستہ عبور کر لینے کے بعد حقیقت کے بلند مقام پر فائز ہو جاتا ہے اور حقیقت کا مقام طے کرنے کے بعد معرفت کی منزل نصیب ہوتی ہے، جہاں سالک کو معرفت الٰہی کی لازوال دولت ہاتھ آتی ہے، شریعت کے بغیر طریقت، حقیقت اور معرفت کی کوئی حیثیت نہیں، شریعت اور احکام شریعت کا کامل اتباع ہی سب سے بڑی منزل ہے۔ تصوف کی ساری عمارت شریعت کی اساس پر کھڑی ہے، یہی وجہ ہے کہ علامہ عبدالوہاب شعرانی نے تصوف کی تعریف ''اتباع شریعت'' سے کی ہے۔ اسی طرح ہزاروں صفحات پر پھیلے تصوف کے لٹریچر کو کھنگالنے کے بعد ماحصل کے طور پر یہی کہنا پڑے گا کہ ''تصوف اتباع شریعت اور اخلاص فی العمل کا نام ہے''۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں ''جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے وہ صوفی نہیں بلکہ فرقۂ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے'' (روح تصوف: ص: ۵۵، امام احمد رضا اکیڈمی، بریلی)

سید شاہ محمد ذوقی فرماتے ہیں ''حقیقت مغز ہے جس کا پوست شریعت ہے، مغز و پوست کے درمیان ایک برزخ ہے، یہ طریقت ہے، مغز حقیقت، بے پوست شریعت و طریقت کے پختہ

نہیں بلکہ خطرہ میں رہتا ہے۔" (اصطلاحات تصوف، ص: ۲۳۲)

یہی وجہ ہے کہ شیخ ابوسعید خراز نے دوٹوک الفاظ میں یہ فیصلہ سنادیا کہ "ہروہ باطن (طریقت) جوظاہر (شریعت) کے خلاف ہووہ باطل ہے"

(رسالہ قشیریہ، ص: ۶۲، تحقیقات اسلامی، پاکستان)

صوفیۂ کرام نے شریعت اور طریقت کی حقیقت وماہیت پر بڑا عمدہ کلام کیا ہے، جو تصوف کی کتابوں میں مرقوم ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں:

"لفظ شریعت دو معنی دارد، عام وخاص، معنی اول: ماجاء عن رسول اللہ ﷺ فی امور الدین من اعتقاد وعمل وخلق وحال ونیۃ ورخصۃ وعزیمۃ وامر ونھی۔ ومعنی دوم آں چہ تعلق بعمل جوارح دارد از عبادات مالی وبدنی وبیان آں عہدہ فقہ است وور کتب فقہ مذکور می شود، ہمیں رامقابل طریقت واخوات آں می کنند۔ پس آں چہ تعلق باخلاق ونیات وآداب عبادات بروجہ عزیمت دارد طریقت است"

(فتاویٰ عزیزی، ج: ۱، ص: ۱۵۵، رحمٰن گل پبلشر، پشاور، پاکستان)

ترجمہ: شریعت کے دو معنی ہیں: ایک عام، دوسرا خاص، پہلا معنی (عام) ہے کہ وہ تمام دینی امور جنہیں من جانب اللہ حضور ﷺ لے کر تشریف لائے، خواہ ان کا تعلق عقیدہ سے ہو، عمل سے، یا پھر حال، نیت، رخصت، عزیمت اور امر ونہی وغیرہ سے۔ دوسرا معنی (خاص) شریعت کا یہ ہے کہ وہ جانی ومالی عبادت جس کا تعلق عمل جوارح سے ہو۔ ان کا بیان کرنا علم فقہ کا کام ہے اور یہ احکام ومسائل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہوتے ہیں۔ فقہائے کرام انہیں احکام ومسائل کو شریعت کہتے ہیں اور شریعت کے مقابل طریقت کا لفظ بولتے ہیں۔ وہ روحانی اوصاف جو حسن اخلاق، حسن نیت (اخلاص) اور عبادت کے آداب سے بطور عزیمت تعلق رکھتے ہیں، وہ طریقت ہیں۔

یعنی شریعت ظاہری اعمال وافعال کا نام ہے اور ان اعمال وافعال کو اخلاص اور حسن نیت کے ساتھ ادا کرنے کا نام طریقت ہے۔ یہیں سے یہ مطلع بھی صاف ہوگیا کہ شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیز نہیں، شریعت اور طریقت کا راستہ الگ نہیں، بلکہ شریعت وطریقت میں اتحاد وارتباط اور مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے، جو شخص شریعت وطریقت میں فرق کرے، اسے اپنی فکر کا قبلہ ازسرنو درست کرلینا چاہیے۔

حقیقت ومعرفت

شریعت وطریقت کا مرحلہ طے کرلینے کے بعد سالک حقیقت اور معرفت کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ حقیقت ومعرفت کیا ہیں؟ حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں: "طریقت وحقیقت

خادمان شریعت اند'' یعنی طریقت اور حقیقت یہ دونوں شریعت کے خادم ہیں۔
شیخ عبدالسلام محمد علی باقوی ''حقیقت'' کی تشریح یوں کرتے ہیں، ''الحقیقة فی عرف اھل اللہ: مشاھدة آثار الربوبیة و مکاشفة اسرار الاسماء و الافعال الالٰھیة''
(المسلک السدید الیٰ حقیقۃ التوحید، ص:۱۵۹)

اہل اللہ (صوفیہ کرام) کے نزدیک ''حقیقت نام ہے آثار ربوبیت کے مشاہدے اور اسما وافعال الٰہی کے اسرار کے مکاشفے کا''
''حقیقت'' کی منزل طے کر لینے کے بعد سالک کو معرفت الٰہی حاصل ہوا کرتی ہے اور وہ سر کی آنکھوں سے آثار ربوبیت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ استغراق اور کشف ومشاہدہ ہی ''حقیقت'' کی اصل ہے۔ سراج الہند شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں:
''وآں چہ تعلق باخلاص وعین الیقین وتحصیل مشاہدہ واستغراق دراں دارد حقیقت است''
(فتاویٰ عزیزی، جلد:۱،ص:۱۵۵)
یعنی جو روحانی امور اخلاص، عین یقین، تحصیل مشاہدہ واستغراق سے متعلق ہوں انہیں ''حقیقت'' کہتے ہیں۔
صوفیہ کی مخصوص اصطلاح ''معرفت'' کے بارے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ ''وآں چہ تعلق بمکاشفہ اسرار اعتقادات دارد از کیفیت توحید ومعیت وقربت واسرار محبت وولا ومراتب ولایت واولیا ومانند آں، آں را ''معرفت'' گویند'' (فتاوی عزیزی، ج:۱،ص:۱۵۶)
ترجمہ: اور وہ چیز جس کا تعلق اعتقاد کے اسرار، توحید ومعیت وقربت اور محبت ووفا کے اسرار اور ولایت واولیا کے مراتب یا اس طرح کے مکاشفات سے ہو تو اس کو معرفت کہتے ہیں۔

مسئلۂ وحدۃ الوجود:

ہر چہ آید در نظر غیر تو نیست
یا توئی یا بوئے تو یا خوئے تو

(امیر خسرو)

صوفیۂ کرام کے یہاں ''مسئلۂ وحدۃ الوجود'' ایک معرکہ آرا بحث کے طور پر متعارف ہے۔ صوفیہ حضرات جب ''وجود'' کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے ''واجب تعالیٰ کی ذات'' مراد لیتے ہیں۔ اب ''وحدت الوجود'' کا مطلب یہ ہوا کہ حقیقت میں وجود صرف ایک اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہی ہے، اس کے علاوہ جو بھی موجودات ہیں وہ سب کے سب اسی ذات حقیقی اور وجود حقیقی کے ظل اور پرتو ہیں۔
امام احمد رضا ''وحدت الوجود'' کی حقیقت یوں اجاگر کرتے ہیں ''وجود ہستی بالذات

واجب تعالیٰ کے لیے، اس کے سوا جو بھی موجودات ہیں سب اسی کی ظل اور پرتو ہیں تو حقیقۃً وجود ایک ہی ٹھہرا'' (معارف تصوف اور امام احمد رضا، ص:۱۰۶)

وحدۃ الوجود کا نظریہ سب سے پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے پیش کیا اور اس طرح اس نظریہ کے بانی اور موجد ٹھہرے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ارشاد فرماتے ہیں: ''مسئلۂ وحدت الوجود حق وصحیح است، دریں مسئلہ شک وشبہ نیست'' مسئلہ وحدت الوجود حق اور صحیح ہے، اس میں کوئی کلام نہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

''اول کسے کہ دریں مسئلہ (وحدت الوجود) خوض فرمود شیخ محی الدین ابن عربی است۔ قدس اللہ سرہ۔ اجتہاد اودریں مسئلہ واثبات آں ببراہین واضحہ برگردن جمیع موحداں تا قیام قیامت منت نہاد'' (رسالہ وحدت الوجود، ص:۴۱)

یعنی مسئلہ وحدت الوجود میں سب سے پہلے غور وخوض شیخ محی الدین ابن عربی نے فرمایا۔ آپ نے اس مسئلے میں اجتہاد کیا اور روشن دلائل سے وحدۃ الوجود کو ثابت کر کے قیامت تک کے لیے تمام اہل اسلام پر احسان عظیم فرمایا۔

متقدمین ومتاخرین صوفیہ میں سے ہر ایک نے وحدت الوجود پر مثبت یا منفی انداز میں کلام کیا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندی وحدۃ الوجود کے بالمقابل ''وحدۃ الشہود'' کے قائل تھے اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی پرزور تردید کرتے تھے۔ **کل یعمل علی شاکلتہ۔**

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ہر دو نظریے میں توافق اور اعتدال کا راستہ ڈھونڈھنے کی سعی فرماتے تاکہ دونوں نظریے میں کسی ایک کا بالکلیہ ابطال یا اثبات کا موقف سامنے نہ آسکے۔ ایک اعتدال پسند محقق کا منصب بھی یہی ہے کہ وہ مختلف فیہ مسائل میں مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نظر رکھے اور بیچ کی راہ اختیار کرے۔

''مسئلہ وحدۃ الوجود ووحدۃ الشہود'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں'' توحید وجودی (وحدۃ الوجود) مجمع علیہ صوفیہ است، الّا حضرت شیخ علاء الدین سمنانی از متقدمین وحضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی از متاخرین بتوحید شہودی (وحدت الشہود) رفتہ اند۔ وتحقیق آں است کہ وحدت وجود در مرتبہ ذات وصرافت اطلاق حق متعین است وتوحید شہودی کہ خبر از غیریت می دہد در مراتب تعینات واجب القبول والتسلیم ست پس ہر دو امر در واقع تحقق دارند۔
(فتاویٰ عزیزی، ج:۱، ص:۱۲۵، مطبوعہ پشاور، پاکستان)

ترجمہ: توحید وجودی یعنی مسئلہ وحدۃ الوجود پر صوفیہ کرام کا اجماع واتفاق ہے، البتہ متقدمین میں سے شیخ علاء الدین سمنانی اور متاخرین میں سے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی توحید

شہودی یعنی وحدۃ الشہود کے قائل ہیں۔ اس مختلف فیہ مسئلے کی تحقیق یہ ہے کہ وحدۃ الوجود مرتبہ ذات میں حق اور صحیح ہے اور وحدۃ الشہود کہ اس سے غیریت ظاہر ہوتی ہے، یہ مراتب تعینات میں صحیح اور واجب التسلیم ہے۔ فی الواقع دونوں نظریات اپنی جگہ درست اور صحیح ہیں۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا معنیٰ

شاہ صاحب ''وحدۃ الوجود'' کی محققانہ اور عارفانہ تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''وحدۃ الوجود آں ست کہ وجود حقیقی بمعنیٰ ما بہ الموجود یہ نہ بمعنیٰ مصدری اعتباری یک چیز ست کہ در واجب واجب، ودر ممکن ممکن، ودر جوہر جوہر ودر عرض عرض، وایں اختلاف موجب اختلافات در ذات نمی شوند، مثل آفتاب کہ ہر پاک وناپاک می افتد وفی ذاتہ پاک است، ناپاک نمی شود وایں مسئلہ فی نفسہ حق است وہیچ گونہ مخالف شرع نیست'' (فتاویٰ عزیزی، ج:۱، ص:۱۲۴)

ترجمہ: وحدۃ الوجود بمعنی ماھوالموجودیۃ نہ کہ بمعنی مصدری ایک اعتباری چیز ہے، وہی ایک چیز واجب میں واجب ہے، ممکن میں ممکن ہے، جوہر میں جوہر ہے اور عرض میں عرض ہے اور یہ اعتباری اختلاف ذات میں اختلاف کا سبب نہیں۔ اس کی ایک محسوس مثال سورج ہے کہ سورج کی شعاع پاک چیز پر بھی پڑتی ہے اور ناپاک پر بھی، شعاع کی ذات یعنی اصل شعاع پاک ہے تو سورج کی شعاع اس وجہ سے کہ ناپاک چیز پر پڑتی ہے ناپاک نہیں ہوجاتی۔ یہ مسئلہ (وحدۃ الوجود) فی نفسہ حق ہے، کسی بھی جہت سے خلاف شرع نہیں۔

شاہ صاحب وحدت الوجود کے نظریے کی قرآنی دلیل سے متعلق لکھتے ہیں'' ودر قرآن مجید چند جا اشارہ بایں مسئلہ واقع شدہ بہ صریح ترین آیات برایں معنیٰ ایں آیت است: سنریھم آیاتنافی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم الحق۔ ونیز آیت: ھوالاول والآخر والظاھر والباطن۔ (فتاویٰ عزیزی، ج:۱، ص:۱۲۴)

''مسئلہ وحدۃ الشہود'' کے بارے میں حضرت رقم طراز ہیں:

''اما معنی وحدۃ الشہود پس حقیقتش ایں است کہ سالک را در وسط سلوک بسبب غلبۂ نور حق وانحصار توجہ بہ سمت آں نور، ہمہ موجودات در نظر او غائب می شوند، غیر از وجود حق او را بہ نظر نمی آید وبسبب استغراق دریں مشاہدہ از حفظ مراتب نیز گاہے غافل می شود ومی گوید ''سبحانی ما اعظم شانی وانا الحق'' وامثال ذالک لیکن چوں بدرجہ انتہامی رسد ہر چیز را در مقام خود می بیند ومی گوید ماللتراب ورب الارباب، تمثیلش آں کہ در روز بسبب غلبۂ شعاع آفتاب ہیچ ستارہ بنظر نمی آید وبینندہ حکم می کند کہ غیر از آفتاب ہیچ ستارہ موجود نیست وایں حالت حالت وسط سلوک است''

ترجمہ: وحدۃ الشہود کی حقیقت یہ ہے کہ سالک کو مرحلۂ سلوک کی وسط مدت میں غلبۂ نور حق

اور نور حق میں توجہ کامل کے باعث اس کی نظروں سے تمام موجودات اوجھل ہو جاتے ہیں، وجود حق کے سوا اسے کچھ اور نظر نہیں آتا، مشاہدۂ حق میں انہماک اور استغراق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ حفظ مراتب سے بھی غافل ہو جاتا ہے اور غلبۂ حال میں سبحانی ما اعظم شانی اور انا الحق'' کا نعرہ بلند کرنے لگتا ہے یہ لیکن جب انتہائی مقام پر پہنچتا ہے تو ہر چیز کو اس کے مقام میں دیکھتا ہے اور پھر وہ یہ کہتا ہے کہاں خاک اور کہاں وہ سب کا پالنہار۔ اس کی مثال ستارہ ہے کہ دن میں شعاع آفتاب میں شدت کے سبب نظر نہیں آتا، دیکھنے والا گمان کرتا ہے کہ ستارہ کا وجود ہے ہی نہیں، صرف آفتاب کا وجود ہے۔ یہ حالت سالک کو درمیان سلوک در پیش آتی ہے۔

توجہ کے اقسام

صوفیۂ کرام ہمہ دم ذکر و فکر، مراقبہ اور توجہ الی اللہ میں مصروف رہا کرتے ہیں تا کہ معرفت الٰہی حاصل ہو۔ قرآن نے اہل ایمان کو تدبر و تفکر کا حکم دیا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں:

''توجہ چار قسم کی ہوتی ہے: (۱) توجہ انعکاسی (۲) توجہ القائی (۳) توجہ جذبی (۴) چوتھی قسم یہ ہے کہ توجہ دینے والے کے تمام اوصاف طالب میں سرایت کر جائیں، یہاں تک کہ صورت ظاہری بھی ایک ہو جائے'' (ملفوظات شاہ عبدالعزیز بحوالہ دلی کے بائیس خواجہ، ص: ۲۵۶)

اولیا اور بزرگان دین کی قسمیں

شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں:

''اولیا چار قسم کے ہوتے ہیں: بعض مستغرق ہوتے ہیں، بعض اہل حدیث ہوتے ہیں جیسے قطب اور غوث وغیرہ، بعض اہل تجرید اور اہل تفرید کہلاتے ہیں'' (مصدر سابق، ص: ۲۵۶)

خلائق و علائق سے بے تعلقی کا نام ''تجرید'' ہے اور خودی سے بے تعلق ہونے کو ''تفرید'' کہتے ہیں۔ نیز فرماتے ہیں: ''اول سالک مجذوب کہ ابتدائے زمانہ میں تو خود کوشش کی اور آخر میں کشش ہوئی، یہ سب سے بہترین ہیں۔ دوسرے مجذوب سالک کہ اولاً جذب سے سرفراز ہوئے پھر سلوک اختیار فرمایا جیسے موسیٰ علیہ السلام آگ لینے تشریف لے گئے، تجلی ربانی نصیب ہوئی، تیسرے سالک محض مشرف بجذب نہیں ہوتے ہیں، چوتھے مجذوب محض کہ تجلی ربانی کی وجہ سے ان کی عقل سلب ہو گئی ہے'' (ملفوظات شاہ عبدالعزیز، ص: ۲۰)

ذکر بالجہر

تصوف کی بنیاد ہی ذکر و فکر پر قائم ہے۔ اکثر سلاسل طریقت میں ''ذکر بالجہر'' کا وظیفہ عام ہے، بعض مخالفین تصوف کہتے ہیں کہ ذکر بالجہر یہ ناجائز و بدعت ہے۔ ایسے لوگوں کو شاہ

صاحب یوں جواب دیتے ہیں:

''ذکر جہر وحق آں است کہ انکار آں سفاہت واضح است، در تلاوت قرآن جہر صریح است بناء طریقۂ چشتیہ، واویسیہ وقادریہ کہ ہمہ پیران ما اند بر ذکر جہر است''

ترجمہ: جہری ذکر کا انکار کرنا حماقت ہے، قرآن کریم کی تلاوت کا حکم جہری ہے نیز سلسلۂ چشتیہ، اویسیہ اور قادریہ جن کے مشائخ ہمارے پیرومرشد ہیں، ان تمام سلاسل کی بنیاد ''ذکر بالجہر'' پر ہے۔

''فتاویٰ عزیزی'' جلد اول میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی قدس سرہ کے پانچ رسائل کا مجموعہ بھی شامل ہے، ان میں سے ایک ''رسالہ فیض عام'' ہے۔ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب صوفیانہ اوراد ووظائف اور بزرگان دین کے روحانی عملیات پر نہ صرف عمل پیرا تھے بلکہ دوسروں کو بھی ان روحانی اعمال سے فائدہ پہنچانا اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ رسالہ فیض عام یقیناً مفید خاص وعام ہے۔ آپ یہاں سرتاپا صوفی صافی بزرگ نظر آتے ہیں۔

بیعت یا پیری مریدی

بیعت یا پیری مریدی جدید وقدیم خانقاہی نظام کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ زمانہ رسالت میں بیعت عقبہ اور بیعت رضوان وغیرہ موجودہ بیعت کی اصل ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''مرید شدن از آں کس درست کہ در آں پنج شرط متحقق باشد۔ شرط اول: علم کتاب وسنت رسول داشتہ باشد، خواہ خواندہ باشد، خواہ از عالم یادداشتہ باشد۔ شرط دوم: آں کہ موصوف بہ عدالت وتقویٰ باشد، اجتناب از کبائر وعدم اصرار بر صغائر نماید۔ شرط سوم: آں کہ بے رغبت از دنیا وراغب در آخرت باشد۔ شرط چہارم: آں کہ امر معروف ونہی از منکر کردہ باشد۔ شرط پنجم: آں کہ از مشائخ ایں امر گرفتہ شد وصحبت معتد بہا ایشاں نمودہ باشد پس گاہ ایں شروط در شخصے متحقق شوند مرید شدن از اں درست است'' (فتاویٰ عزیزی، ج: ۲، ص: ۱۰۳، رحمن گل پبلشر، پاکستان)

یعنی پیر کے اندر پانچ باتوں کا پایا جانا شرط اور ضروری ہے۔ اور وہ یہ ہیں (۱) پیر قرآن وحدیث کا عالم خواہ مطالعہ کر کے یا عالم سے سیکھ کر۔ (۲) صفت عدالت وتقویٰ سے متصف ہو، گناہ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو اور صغائر پر اصرار نہ کرتا ہو۔ (۳) دنیا سے کنارہ کش ہو اور فکر آخرت میں ہمہ تن مصروف رہتا ہو۔ (۴) امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کا وظیفۂ حیات ہو۔ (۵) یہ خصلت مشائخ طریقت سے پیر نے حاصل کیا ہو اور بزرگوں کی صحبت میں ایک مدت تک رہا ہو۔ پس جس کے اندر یہ پانچوں شرطیں پائی جائیں اس سے مرید ہونا جائز ہے۔

اس آئینے میں موجودہ پیران طریقت کا صحیح خدوخال بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

ایصال ثواب:

صوفیہ کرام کے قدیم معمولات اور خانقاہی نظام میں ''ایصال ثواب'' کا دستور بھی شامل ہے۔تمام خانقاہوں میں ''مجلس ایصال ثواب'' منعقد ہوتی ہے۔مشائخ سلسلہ اور دیگر بزرگان دین کی روح پرفتوح کو ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔شیرینی، پانی لنگر، کھچڑا اور مالیدہ وغیرہ بھی پکایا جاتا ہے۔ذیل کی عبارت غور سے ملاحظہ فرمائیں:

''واگر مالیدہ وشیر برنج بنابرفاتحہ بزرگے بقصد ایصال ثواب بروح ایشاں پختہ بخوراند مضائقہ نیست'' (فتاویٰ عزیزی، ج:۱،ص:۳۹، رحمن گل پبلشر، پشاور، پاکستان)

فاتحہ یعنی بزرگان دین کے ایصال ثواب کی نیت سے مالیدہ اور دودھ چاول ملا کر کوئی میٹھی چیز پکانے اور دوسرے کو کھلانے میں کوئی حرج نہیں۔

شجرہ پڑھنا اور بعد وفات اسے قبر میں رکھنا:

ایک مرید نے شاہ صاحب سے شجرہ طلب کیا اور کہا کہ اس پر حضرت اپنا دستخط بھی فرما دیں۔آپ نے اس مرید کو ''شجرۂ قادریہ'' پڑھنے اور پاس رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

(فتاویٰ عزیزی، ج:۱،ص:۱۷۴)

قبر میں شجرہ رکھنے سے متعلق فرمایا:''شجرہ درقبر نہادن معمول بزرگان است'' (فتاویٰ عزیزی، ۱/۱۷۴) مرنے کے بعد مرید کی قبر میں شجرہ رکھنا یہ بزرگان دین کے معمولات سے ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مذکورہ تعلیمات وارشادات سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ آپ نفس تصوف ودیگر معمولات تصوف کو استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے۔معرفت الٰہی اور تقرب الی اللہ کے لیے تصوف کو ایک امر لازم قرار دیتے تھے، مسلکی حصار بندیوں سے اوپر اٹھ کر آج ضرورت اس بات کی ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے پیغام کی اہمیت کو سمجھا جائے اور انہیں اپنی عملی زندگی کا نمونہ بنایا جائے۔اللہ تعالیٰ ہمیں حق بات قبول کرنے کی توفیق دے اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے علمی وروحانی فیضان سے مالا مال فرمائے۔

○○○

ذیشان احمد مصباحی

مسئلۂ اجتہاد وتقلید امام شعرانی کی نظر میں

المیزان الکبری الشعرانیة کے حوالے سے

عارب باللہ قطب ربانی امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہ العزیز (۸۹۸۔ ۹۷۳ھ) کا شماردسویں صدی ہجری کے اکابر علماے شریعت اور ارباب طریقت میں ہوتا ہے۔آپ کی زندگی ایک ایسے عالم شریعت کی حیثیت سے شروع ہوتی ہے، جسے ہمہ وقت علم وفکر،لوح وقلم اور قیل و قال سے واسطہ رہتا ہے۔پھر قسمت یاوری کرتی ہے، امام طریقت عارف کامل شیخ علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ سے شرف نیاز حاصل ہوتا ہے اور ازخود آپ کا قبلہ قال سے حال کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ایک لمبا عرصہ مجاہدہ وریاضت میں بسر کرتے ہیں اور پھر شریعت وطریقت کا امام بن کر سامنے آتے ہیں اور زبان قلم سے وہ گہر ہائے آبدار اور گلہائے رنگارنگ یادگار چھوڑ جاتے ہیں، جو ارباب علم ودانش اور اصحاب ذوق وشوق کے لیے آج بھی گنجہائے گراں مایہ اور لالہ ہائے سدا بہار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایمان کی گہرائی، علم کا رسوخ، فکر کی بلندی، ذوق کی پاکیزگی اور اس پر طرفہ قلم کی آبداری امام شعرانی کو تاریخ اسلام کے ان چند ممتاز معماروں کی صف میں شامل کرتی ہے جن کے یہاں شریعت وطریقت، قال وحال، علم وعمل، فکر وروحانیت اور ظاہر و باطن کا حسن امتزاج نظر آتا ہے۔حجۃ الاسلام امام محمد بن محمد الغزالی قدس سرہ العزیز کے بعد امام شعرانی غالبا وہ پہلے عالم ہیں جنھوں نے اپنی گراں قدر علمی وفکری تصنیفات کے ذریعے شریعت کے تحفظ کے ساتھ اخلاق واحسان کی اہمیت کو علمی بنیادوں پر استوار کیا۔بے ذوق علما کی طوطا چشمی اور بے علم صوفیہ کی سیاہ باطنی نے دین کے معاملے میں جو افراط وتفریط کی فضا پیدا کی تھی اس کے بیچ سے امام غزالی کے بعد جس دوسرے شخص نے خالص علمی، فکری اور منطقی طریقے سے اعتدال واقتصاد کی راہ نکالی وہ امام شعرانی ہیں۔دسویں صدی ہجری میں امام شعرانی کی غیر معمولی

علمی خدمات یقیناً تجدیدی نوعیت کی ہیں۔ آپ کا شمار کثیر التصانیف صوفی علما میں ہوتا ہے۔ آپ کی تصنیفات کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رخشِ خامہ بالعموم احسان و تزکیہ کی پر نور وادیوں میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ موصوف کی جو کتابیں براہ راست احسان و سلوک سے تعلق نہیں رکھتیں وہ بھی ذوقِ تصوف اور لذتِ عرفان سے مالا مال ہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ آپ کے عہد میں ذوق و حال کے بجائے قیل و قال کا دور دورا ہو گیا تھا اور اس مرض ایماں سوز کا مداوا آپ کی نظر میں تزکیہ و احسان کے علاوہ کہیں اور موجود نہیں تھا۔ شیخ علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے:

''ماوراء النہر کے بعض شافعی اور حنفی علما رمضان کے دنوں میں صرف اس وجہ سے روزہ نہیں رکھتے تھے تا کہ وہ پوری قوت سے ایک دوسرے سے مناظرہ کر سکیں اور فریق مخالف کے دلائل کو پادر ہوا ثابت کر سکیں''

شیخ علی الخواص امام شعرانی کے شیخ ارادت اور مرشد طریقت ہیں اور یہ اقتباس خود امام شعرانی نے اپنی مشہور کتاب المیزان الکبریٰ الشعرانیہ میں نقل کیا ہے، جسے میزان الشریعۃ الکبریٰ سے بھی علما یاد کرتے ہیں۔ شیخ مذکور کا مذکورہ بالا بیان امام شعرانی کے عہد میں اندھی اور متعصّبانہ تقلید کے طوفان کی حکایت کرتا ہے۔ امام موصوف کی یہ کتاب دراصل اسی طوفان کی زد میں چراغ جلانے کی ایک مسعود کوشش ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو امام موصوف کی یہ تصنیف ان کی تجدیدی بصیرت اور اصلاحی و تاریخی خدمات کا روشن ثبوت ہے۔ اندھی مقلدیت، جاہلانہ عصبیت، ائمہ مجتہدین سے سوئے ظن، جہالت کے عروج اور کور باطنی اور بے ذوقی کے شباب نے جو سوالات جنم دیے تھے امام موصوف نے اپنی اس کتاب میں نہایت علمیت، بصیرت، فکری جولانیت اور قلبی طمانیت و روحانیت سے لبریز عبارت و اسلوب میں ان کے جوابات دیے، جو بیک وقت قلب و نظر کو اپیل کرتے ہیں اور متعصّبانہ تقلید اور جاہلانہ اجتہاد کے بلاؤں سے محفوظ کرتے ہیں۔ تقلید و اجتہاد کے مسئلے میں افراط و تفریط کا بازار آج بھی گرم ہے۔ ایک طرف تقلید در تقلید کی زنجیر اتنی مضبوط ہے کہ جیسے علم و فکر کو سزائے عمر قید سنا دی گئی ہو اور دوسری طرف جوش اجتہاد کا یہ عالم کہ بقول شخصے ابھی بچے کی ناف کا زخم بھی خشک نہیں ہوتا کہ وہ باپ کا قد ناپتا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی اجتہاد بے بصیرت کے بارے میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے یہ ریمارک دیا ہے:

زاجتہاد عالمان کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

اس اعتبار سے دیکھیے تو امام شعرانی کی یہ مایۂ ناز تصنیف دسویں صدی کی نہیں آج کی معلوم ہوتی ہے۔اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقریباً پانچ سو سال کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میزان الشریعۃ الکبریٰ کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے بلکہ بڑھ گئی ہے۔اپنی اس زندہ جاوید تصنیف میں امام موصوف نے جن حقائق کو طشت از بام کیا ہے ان کی چند جھلکیاں آنے والی سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔میرے سامنے میزان الکبریٰ الشعرانیہ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ ، بیروت، ۱۹۹۸ء والا نسخہ ہے جس کی تصحیح و تحقیق شیخ عبدالوارث محمد علی نے کی ہے۔مقالے کے جملہ حوالے اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

شریعت عزیمت ور خصت پر مبنی ہے

''برادرم !شریعت: امر و نہی ہر دو جہت سے دو مرتبے تخفیف و تشدید پر وارد ہے۔ شریعت میں صرف ایک پہلو ہی نہیں ہے،اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں تمام مکلفین ایمانی اور جسمانی اعتبار سے دو ہی طرح کے ہو سکتے ہیں :قوی یا ضعیف۔ان میں جو قوی ہے وہ تشدید سے مخاطب ہے اور اسے عزیمت پر عمل کرنے کا حکم ہے اور جو ضعیف ہے وہ تخفیف سے مخاطب ہے اور اسے رخصت پر عمل کرنے کا حکم ہے۔ایسے میں ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے رب کی طرف سے شریعت اور برہان پر قائم ہیں،لہٰذا قوی کو رخصت کے لیے نیچے آنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا اور نہ ضعیف کو عزیمت کے لیے اوپر جانے کا مکلف کیا جا سکتا ہے۔(ص:٦)

حضرت امام شعرانی نے تمام احکام شریعت میں مجتہدین کے اختلافات کو دور کرنے کا یہ نادر اصول پیش کیا ہے۔اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد علما کے اختلافات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ یہ اختلافات صحت و خطا یا راجح اور مرجوح پر مبنی نہیں رہتے ، بلکہ دو الگ الگ حالات کے لیے دو الگ الگ حکم کے طور پر نظر آتے ہیں۔ جو لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں انہیں یہ جائز نہیں کہ وہ عزیمت پر عمل کی قدرت رکھتے ہوئے اپنے امام کی تقلید کی وجہ سے رخصت پر عمل کرنے لگیں ، یا عزیمت پر قدرت نہ ہونے کے باوجود اپنے امام کی تقلید کو بنیاد بنا کر رخصت پر عمل نہ کریں۔یعنی وہ یہ نہ دیکھیں کہ ان کی حالت اصحاب عزیمت کی ہے یا اصحاب رخصت کی اور بہر صورت اپنے امام کے فتوے پر عمل کریں اور دوسرے امام کے ارشاد کو بہر کیف اپنے لیے شجر ممنوعہ سمجھیں۔ ایسا کرنا روا نہیں۔ایسا کرنا دوسرے امام کی صداقت کو خاموشی کے ساتھ چیلنج کرنے کے مترادف ہے۔المیزان الکبریٰ کے ذریعے امام شعرانی نے رفع اختلاف کا یہی وہ پیمانہ دیا ہے جس کے بارے میں خود ان کا اپنا دعویٰ ہے کہ ان سے پیشتر کسی نے یہ بات نہیں کہی۔وہ میزان شریعت کے اس پیمانۂ عظیم کی دریافت پر اللہ کا بار بار شکر ادا کرتے ہیں اور اسے خاص فیضان الٰہی تصور کرتے ہیں۔فرماتے ہیں:

''شریعت امر و نہی ہر دو اعتبار سے دو مرتبے تخفیف و تشدید پر وارد ہے۔قوی تشدید سے مخاطب ہے اور اسے عزیمت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ضعیف تخفیف سے مخاطب ہے اور اسے رخصت پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''(ص:٦) آگے فرماتے ہیں:

''یہ گراں قدر پیمانہ ہے۔ میں نے اس کے ذریعے بظاہر متضاد دلائل میں موافقت پیدا کرنے اور ابتدا سے قیامت تک ہونے والے مجتہدین و مقلدین کے اقوال میں تطبیق کی راہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرے علم کی حد تک اس معاملے میں ماضی میں کسی نے مجھ پر سبقت نہیں کی ہے۔ بحمد اللہ میں اتفاق چاہتا ہوں اور اختلاف کو ناپسند کرتا ہوں۔(ص:٧)

اس پیمانے (میزان) کے مطابق جو حضرت امام شعرانی کی دریافت ہے، شریعت کے ہر حکم میں دو پہلو ہیں تشدید اور تخفیف، اور دونوں پہلو دو الگ الگ افراد کے لیے ہیں، قوی کے لیے تشدیدی پہلو ہے جب کہ ضعیف کے لیے تخفیفی پہلو۔ ایسا نہیں کہ دونوں پہلو سب کے لیے اختیاری ہوں، بلکہ ہر شخص کے حق میں الگ الگ طور پر خواہ تشدیدی حکم واجب ہوگا خواہ تخفیفی حکم، اگر وہ عزیمت کی حالت میں ہے تو اس کے لیے حکم شدید پر عمل واجب ہے اور اگر وہ رخصت کی حالت میں ہے تو اس کے لیے حکم خفیف پر عمل واجب ہے۔ امام شعرانی اس معاملے میں اتنا دوٹوک ہیں کہ ان کے بقول عزیمت میں رہنے والے کو عزیمت پر ہی عمل واجب ہے، اگرچہ اسے اپنے امام کے خلاف جانا پڑے اور رخصت کی حالت میں رہنے والے کے لیے رخصت پر ہی عمل واجب ہے، اگرچہ اسے اپنے امام کے خلاف جانا پڑے۔ فرماتے ہیں:

''بل اقول ان من الواجب علی کل مقلدمن طریق الانصاف ان لایعمل برخصة قال بهاامام مذهبه الاان کان من اهلها، وانه یجب علیه العمل بالعزیمة التی قال بهاغیر امامه حیث قدر علیها۔''(ص:٥١)

اپنے امام کے فتوے سے قطع نظر، انفرادی طور پر عزیمت یا رخصت میں سے کسی ایک کے واجب ہونے کے نظریے پر فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عزیمت و رخصت تو مکلف کے لیے اختیاری ہوتے ہیں، پھر ان میں ایک کو واجب کرنے کے کیا معنی ہیں؟ اس کے جواب میں امام شعرانی نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے عزیمت و رخصت کی اس اصطلاح کے ذریعے جو اصول پیش کیا ہے وہ شریعت کے عام بظاہر متضاد احکام کے درمیان تطبیق کے لیے ہے اور رہے شریعت کے وہ احکام جن میں بظاہر تضاد نہیں ہے بلکہ شریعت نے واضح انداز میں دو آپشن رکھ دیے ہیں ایک عزیمت کا آپشن اور دوسرا رخصت کا، تو ایسے مسائل ہمارے عام اصول سے مستثنیٰ ہیں۔ ان مسائل میں عزیمت و رخصت میں سے کوئی ایک بھی کسی کے حق میں

واجب نہیں ہوگا بلکہ دونوں اختیاری ہوں گے۔ان کے لفظوں میں: ''شریعت کے وہ احکام جن میں شریعت نے دو آپشن دیے ہیں، ان کا اس عام اصول سے استثنا ضروری ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں قوی کے لیے جائز ہے کہ وہ حکم شدید پر عمل کی طاقت رکھتے ہوئے بھی رخصت اور تخفیف کے مرتبے پر آ کر عمل کرے۔ یہ دونوں مرتبے وجوب کے لیے نہیں ہوں گے اختیار کے لیے ہوں گے۔اور اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے خف پہنے شخص جب وضو کر رہا ہو تو اسے اختیار ہے کہ وہ خف اتار دے اور پیروں کو دھلے اور یہ بھی اختیار ہے کہ خف نہ اتارے اور مسح کر لے۔ باوجود اس کے کہ ان میں سے ایک اعلیٰ مرتبہ ہے اور دوسرا ادنیٰ۔'' (ص:۱۸،۱۹)

امام شعرانی نے رخصت وعزیمت میں سے کسی ایک کے واجب ہونے کا جو عام اصول پیش کیا ہے اس سے ایک دوسری صورت کو بھی مستثنیٰ کرتے ہیں۔فرماتے ہیں: ''اس طرح میزان کے دونوں مرتبے میں سے ایک کے حکم وجوبی سے اس صورت کا استثنا بھی کیا جانا چاہیے جس میں شارع سے دو وقتوں میں دو امر کا ثبوت ہو اور ان میں سے کسی ایک کے لیے نسخ کا ثبوت نہ ہو، جیسے کسی وقت میں پورے سر کے مسح کا ثبوت ہے اور دوسرے وقت میں بعض سر کے مسح کا ثبوت، اور جیسے کسی وقت وضو میں موالات (پے در پے دھونے) کا ثبوت ہے اور کسی وقت عدم موالات کا ثبوت ہے۔'' دو سطروں کے بعد فرماتے ہیں: ''رہا سیدنا و مولانا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ ارشاد کہ رسول کریم ﷺ کے افعال میں آخری فعل ناسخ محکم ہے، تو یہ اکثری حکم ہے، کلی نہیں۔'' (ص:۱۹)

آگے چل کر اپنی بات واضح کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں: ''عزیمت ورخصت سے ہماری مراد مطلق تشدید وتخفیف ہے۔ وہ عزیمت ورخصت مراد نہیں جن کی تعریف علماے اصول نے اپنی کتابوں میں لکھی ہے۔'' (ص:۱۹)

تمام ائمہ برحق ہیں

خطبۃ الکتاب کے اندر حضرت امام شعرانی رقم طراز ہیں:

''اللہ نے جنھیں شریعت کے چشمۂ اول پر مطلع فرمایا وہ تمام مجتہدین اور مقلدین کے تمام اقوال کو درست سمجھتے ہیں، کیوں کہ وہ از راہ کشف ومشاہدہ یہ دیکھتے ہیں کہ سارے اقوال شریعت کے چشمے سے ہی پھوٹ رہے ہیں۔''

امام شعرانی نے وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارا مقصد یہی ہے کہ لوگ فقہی معاملے میں مسلکی افتراق وانتشار سے بچیں۔ علمی اختلاف کو دینی افتراق کی شکل نہ دیں اور زبانی طور پر جو تمام ائمہ کے برحق ہونے کے قائل ہیں اور یہ بات ان کے گلے سے نیچے نہیں اترتی، وہ

اتر جائے اور نفاق خفی کے عذاب سے بچ جائیں۔ ان کے الفاظ ہیں:

''اس کتاب کی تالیف کے اہم محرکات میں یہ بات بھی تھی کہ میں اپنے بھائیوں کے لیے اس آیت کریمہ کے مقتضا پر عمل کی راہ ہموار کرسکوں: ''تمہارے لیے ہم نے وہ دین مشرو کیا ہے جس کا حکم ہم نے نوح کو دیا تھا، جس کی وحی تمہاری طرف نازل کی اور جس کا حکم ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین قائم کرو اور اس میں اختلاف پیدا نہ کرو۔'' (الشوریٰ: ۱۳)

اس تصنیف کے پیچھے یہ مقصد بھی تھا کہ مقلدین کا قول کہ تمام ائمہ برحق ہیں ان کے د اعتقاد کے موافق ہو جائے، تاکہ وہ اپنے ائمہ کے حق ادب کا پاس رکھیں اور آخرت میں اس مرتب ہونے والے ثواب سے لطف انداز ہوں اور جو شخص زبانی طور پر تو یہ کہتا ہے کہ مسلمانو کے تمام ائمہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور اپنے دل میں اس کا اعتقاد نہیں رکھتا، و نفاق اصغر سے محفوظ ہو جائے، جس کی مذمت اللہ کے رسول ﷺ نے فرمائی ہے۔'' (ص: ۷)

تمام ائمہ کے برحق ہونے کے اعتقاد کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ تمام ائمہ مصیب ہوں۔ اس لیے کہ اگر سب مصیب نہ ہوں تو بعض خاطی ہوں گے پھر یہ بات پورے طور پر درست نہ ہوگی کہ تمام ائمہ برحق ہیں۔ چنانچہ امامؒ شعرانی نے پوری کتاب میں اس بات پر زور دیا ہے ک تمام ائمہ مصیب ہیں نہ کہ بعض۔ امامؒ شعرانی کے مطابق ''جو لوگ صرف ایک امام کو برحق کہتے ہی وہ ابھی ناقص ہیں، ان کا سلوک مکمل نہیں ہوا ہے۔'' (ص: ۲۹)

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف شدید کے باوجود یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر قول مصیب ہو؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ''چوں کہ ائمہ کے تمام اقوال چشمۂ نبوت سے نکلے ہیں، اس لیے کسی کے خطا ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں ہے۔'' اس کا ایک جواب یہ بھی دیتے ہیں: ''مسائل شرع میں ہر مجتہد کے حق میں اللہ کا حکم وہی ہے جو اس پر واضح ہوا۔ جو بات اس پر ظاہر نہیں ہو اس کا مطالبہ اس سے نہیں ہوگا۔'' (ص: ۳۴)

داؤد ظاہری اور دوسرے ائمۂ مجتہدین کی صداقت

امام شعرانی نے ائمۂ اربعہ کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ آپ نے بارہا یہ لکھا ہے کہ با رہنے والے انہی کے مذاہب ہیں، مگر اس کے باوجود وہ دیگر ائمہ مذاہب کا بھی احترام کر ہیں، ان کا نام عزت سے لیتے ہیں، سب کو امام ہدیٰ مانتے ہیں اور مذاہب موجودہ اور مذاہ معدومہ سب کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں بعض افراد امام داؤد ظاہر کا ذکر کرتے ہوئے صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیتے ہیں جب کہ امام شعرانی ان کا بھی بڑے ادب ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے مجھے بطریق الہام امام داؤد ظاہری رضی اللہ عنہ کے ایک قول کی دلیل پر مطلع فرمایا۔ ان کا قول ہے کہ چھوٹی بچی جو لائق شہوت نہ ہو اس کو چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصۂ فرعون میں چھوٹی بچیوں پر بھی ''نساء'' کے لفظ کا اطلاق کیا ہے۔ ''یذبح ابناء ھم ویستحی نساء ھم (القصص: ۴) چوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ فرعون ولادت کے بعد ہی بچیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا۔ تو جس طرح اس آیت میں بچیوں پر ''نساء'' کا اطلاق ہوا ہے اسی طرح ''او لا مستم النساء۔'' (النساء: ۴۳) میں بھی اسی پر قیاس کرتے ہوئے بچیوں پر بھی حکم ہوگا۔ یہ عمدہ استنباط ہے۔ اسے اپنے سوا کسی اور کے یہاں میں نے نہیں دیکھا۔'' (ص: ۱۵)

امام شعرانی نے مختلف نقشوں کے ذریعے محسوس طریقے پر یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تمام ائمہ مجتہدین اور تمام مسالک فقہ برحق ہیں۔ ایک گول نقشہ اس طور پر بنایا ہے کہ اس کے بیچ میں ایک گول دائرے کے اندر ''عین شریعت مطہرہ'' لکھا ہے اور اس گول دائرے سے مختلف سمتوں میں اٹھارہ جدول نکالے ہیں، ہر جدول میں ایک امام کا نام ہے۔ اس طرح اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ ۱۸ ائمہ میں سے ہر ایک کی بنیاد وہی ''عین شریعت مطہرہ'' ہے؛ کیوں کہ اس سے سب کا رشتہ براہ راست جڑا ہوا ہے۔ اس مثال میں عین شریعت مطہرہ سے جو اٹھارہ جدول نکلے ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) مذہب عائشہ (۲) مذہب عبداللہ بن عمر (۳) مذہب عبداللہ بن مسعود (۴) مذہب عطا (۵) مذہب مجاہد (۶) مذہب امام ابواللیث (۷) مذہب داؤد (۸) مذہب امام ابوحنیفہ (۹) مذہب امام مالک (۱۰) مذہب امام شافعی (۱۱) مذہب امام احمد (۱۲) مذہب سفیان ثوری (۱۳) مذہب سفیان بن عیینہ (۱۴) مذہب محمد بن جریر (۱۵) مذہب عمر بن عبدالعزیز (۱۶) مذہب اعمش (۱۷) مذہب شعبی (۱۸) مذہب اسحاق۔

ایک دوسرا نقشہ بنایا ہے جس میں جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور ان دروازں پر یہ نام ہیں: (۱) امام ابوحنیفہ (۲) امام مالک (۳) امام شافعی (۴) امام احمد (۵) امام داؤد (۶) امام ابواللیث (۷) امام اسحق (۸) امام اوزاعی۔

یہ نقشے اپنے آپ میں بہت سے سوالات جنم دیتے ہیں اور بہت سے سوالوں کا خود ہی جواب بھی فراہم کرتے ہیں۔

خاص بندے عین شریعت پر ہوتے ہیں

میزان الشریعۃ ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے:

''حمد اللہ کے لیے ہے جس نے شریعت مطہرہ کو ایسا سمندر بنایا ہے کہ علوم نافع کی تمام ندیاں اور وادیاں اسی سے نکلتی ہیں۔ پھر اس سے دلوں کی زمین پر نالے نکالے اور ان سے قریب اور براہ تقلید دور کے علما کو سیراب کیا، اپنے خاص بندوں میں سے جسے چاہا اسے چشمۂ شریعت پر مطلع فرمادیا، مختلف بلاد وامصار میں پھیلے احادیث وآثار سے آگاہ کیا اور کشف کے توسط سے شریعت کے چشمۂ اول سے آشنا کیا جس سے مختلف ادوار واحوال میں ہر طرح کے اقوال متفرع ہوتے ہیں۔ یہ خاص بندے شریعت عظمی کے چشمۂ اول سے براہ راست سیرابی کے معاملے میں مجتہدین امت کے شریک ہوتے ہیں، اگر چہ ان کی نظر ان مجتہدین کے بہ نسبت محدود ہوتی ہے اور زمانی اعتبار سے یہ موخر ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''شیخ محی الدین ابن عربی نے فتوحات مکیہ اور دوسری کتابوں میں اہل کشف سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب بندہ کسی ایک مسلک فقہ سے وابستہ رہتے ہوئے اصفیا کے مقامات سے گزرتا ہے تو لازمی طور پر وہ مسلک اسے اس چشمے تک لے جاتا ہے جس سے اس کے امام نے اپنے اقوال اخذ کیے تھے۔ اس مقام پر وہ دیکھتا ہے کہ تمام ائمہ کے اقوال ایک ہی سمندر سے سیراب ہو رہے ہیں۔ اب یقینی طور پر اس سے اس کے مسلک کی زنجیر ٹوٹ جاتی ہے اور پھر برخلاف اس اعتقاد کے جس پر وہ اب تک جما ہوا تھا، تمام مسالک کی صحت ومساوات کا قائل ہو جاتا ہے۔''

عین شریعت پر پہنچ کر تقلید ساقط ہو جاتی ہے

امام شعرانی رقم طراز ہیں:

سوال: اگر کوئی کہے کہ جو مقلد ذوق وشوق کے ذریعے آپ کے اس پیمانے تک نہیں پہنچا ہے آپ کے نزدیک اس پر اپنے مذہب کے دو اقوال یا دو صورتوں میں سے راجح پر عمل کرنا واجب ہے یا نہیں؟

جواب: ہاں! جب تک وہ اس میزان کے مقام ذوق تک نہیں پہنچا ہے اس پر واجب ہے، جیسا کہ ہر زمانے میں اسی پر لوگوں کا عمل ہے۔ برخلاف اس کے کہ جب وہ اس پیمانے کے ذوق کو پالے اور اسے علما کے تمام اقوال اور ان کے علوم کے تمام سمندر، شریعت کے اولین چشمے سے پھوٹتے ہوئے، اسی سے نکلتے ہوئے اور اسی کی طرف عود کرتے ہوئے نظر آئیں، جیسا کہ محسوس مثالوں کے بیان میں اس کا ذکر آئے گا؛ کیوں کہ اس مقام پر پہنچ کر علما کے تمام اقوال عین شریعت کبریٰ سے متصل نظر آتے ہیں۔ از راہ کشف جو شخص بھی اس پر مطلع ہوگا، وہ دیکھے گا کہ تمام

مسالک اور علما کے تمام اقوال چشمۂ شریعت سے متصل ہیں اور اس سے ایسے ہی جڑے ہیں جیسے سایہ آدمی کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو کسی ایک مذہب معین کی پیروی کا حکم نہیں دیا جائے گا؛ کیوں کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ چشمۂ شریعت سے اخذ کرنے کے معاملے میں تمام مسالک مساوی ہیں اور کوئی مسلک فقہ دوسرے سے شرعی لحاظ سے اولیٰ نہیں ہے؛ کیوں کہ اس کے نزدیک ہر مسلک عین شریعت سے متفرع ہے، جیسا کہ شکاری کے جال کا ہر خانہ، ہر سطح پر، خانۂ اول سے متفرع ہوتا ہے۔ اگر ایسے شخص کو کوئی تقلید شخصی پر مجبور کرتا ہے تو وہ مجبور نہیں ہوگا، جیسا کہ اس کی وضاحت آئندہ ابواب میں ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ اس کشف کا حامل یقین کے معاملے میں مجتہدین کے برابر ہوتا ہے اور بسا اوقات بعض پر فوقیت بھی رکھتا ہے؛ کیوں کہ وہ اپنا علم براہ راست عین شریعت سے اخذ کرتا ہے۔ ایسا شخص اجتہاد کے ان ذرائع کے حصول کا محتاج بھی نہیں ہوتا جنھیں علما نے مجتہد کے حق میں مشروط کیا ہے۔ اس کا معاملہ اس شخص جیسا ہے جو سمندر کی راہ سے ناواقف ہو، کسی واقف شخص کے ساتھ سمندر چلا جائے اور پھر اپنے برتن کو اس کے پانی سے بھر لے تو اب ان دونوں کے پانی میں کوئی فرق نہیں رہا۔'' (ص:۱۶)

امام شعرانی نے اس مقام پر کشف کے دلیل و برہان ہونے کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کشف میں ایک گونہ احتمال ہے کہ اس میں ابلیس کی تلبیس شامل ہوگئی ہو، اس لیے علما نے واجب کیا ہے کہ صاحب کشف، اپنے کشف کو کتاب وسنت پر پیش کرے، اگر شریعت اس کی موافقت کرے تو عمل کرے ورنہ اسے چھوڑ دے؛ کیوں کہ کشف صحیح ہمیشہ شریعت کے موافق ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (ص:۱۷)

اولیا حنفی یا شافعی نہیں ہوتے

امام شعرانی نے جگہ جگہ لکھا ہے کہ تقلید اس وقت تک رہتی ہے جب تک انسان کی عین شریعت کبریٰ تک رسائی نہ ہو جائے۔ جب بندہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سارے مسالک فقہ چشمۂ نبوت سے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور سارے ائمہ مصیب و برحق نظر آتے ہیں تو پھر بندہ تقلید کی زنجیر سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ حالت عزیمت میں ہے یا رخصت میں، اور پھر اپنے موافق حال فتوے پر عمل کرتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ وہ فتویٰ کس امام کا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اس کشف و یقین کے بعد کہ تمام ائمہ برحق ہیں اور سب کی باتیں چشمۂ نبوت سے ماخوذ ہیں تقلید کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی تو پھر کیا وجہ ہے کہ حضرت غوث اعظم جیلانی اور حضرت سید احمد رفاعی جیسے بزرگ بھی کسی نہ کسی مسلک فقہ سے

منسوب ہوتے ہیں۔ کیاان اکابر اولیا کو بھی مشاہدۂ عین شریعت حاصل نہیں تھا؟ اس کے جواب میں حضرت شعرانی فرماتے ہیں:

''جس کو بھی ولایت محمدی کا کوئی درجہ ملتا ہے وہ احکام شریعت کو وہاں سے لینا شروع کردیتا ہے جہاں سے مجتہدین نے لیا ہے اور اس سے تقلید کی گرہ کھل جاتی ہے۔ وہ صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقلد رہ جاتا ہے اور بعض اولیا کے بارے میں جو یہ منقول ہے کہ وہ مثلاً شافعی یا حنفی تھے تو ایسا مقام کمال تک پہنچنے سے پہلے تھا۔'' (ص: ۲۸،۲۹)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''میں نے سیدی علی الخواص رضی اللہ عنہ سے ایک بار دریافت کیا کہ شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا امام احمد بن حنبل کی تقلید کرنا یا شیخ محمد شاذلی حنفی قدس سرہ کا امام ابوحنیفہ کی تقلید کرنا کیسے درست ہوگا جب کہ یہ دونوں بزرگ قطبیت کبریٰ کے حوالے سے مشہور ہیں اور اس مقام کا حامل سوائے شارع علیہ السلام کے کسی اور کا مقلد نہیں ہوتا؟ حضرت سیدی علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ممکن ہے کہ یہ بزرگ مقام کمال تک پہنچنے سے پہلے مقلد رہے ہوں، بعد میں جب وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہوں تو اس کے بعد بھی لوگ حنبلی اور حنفی کہتے رہے ہوں جب کہ وہ حقیقت میں تقلید سے باہر آچکے تھے۔'' (ص: ۳۱)

عالم کے لیے تمام مذاہب ایک مذہب کی طرح ہیں

امام شعرانی کی کتاب کا مرکزی نقطہ اسی حقیقت کو واشگاف کرنا ہے کہ تمام مذاہب برحق ہیں۔ سب بالآخر ایک چشمۂ صافی سے سیراب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ اس کے ساتھ امام موصوف نے یہ بھی بتایا ہے کہ ائمہ کے یہاں جو اختلافات نظر آتے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شریعت میں ہر معاملے میں عزیمت و رخصت دو پہلو ہیں۔ مختلف ائمہ نے اپنے اعتبار سے کسی ایک پہلو کو ترجیح دی ہے، اس لیے حقیقت کے اعتبار سے ان کا اختلاف ایسا ہی ہے جیسے کوئی اختلاف ہی نہ ہو۔ سب کا قول درحقیقت چشمۂ شریعت سے مستفاد ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام اختلافات عزیمت و رخصت کے ہیں تب تو ہر شخص کے لیے یہ گنجائش نکل آئی کہ چاہے وہ جس قول پر عمل کرے، چاہے تو عزیمت پر عمل کرے اور چاہے تو رخصت پر، اور اس طرح تمام مقلدین آزاد ہوجائیں۔

المیزان الکبری الشعرانیہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ ایسا نہیں ہے، جو لوگ دلائل سے واقف نہیں ہیں انھیں بہر حال کسی امام کی پیروی کرنی چاہیے۔ بصیرت اور علم کے بغیر

اس پیروی سے آزادی ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اس آزادی کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک عام شخص ائمہ کی تقلید کرنے کے بجائے اپنی خواہشات کا پجاری بن جائے اور واتبع ھواہ (الکھف: ۲۸) کا مصداق ٹھہر جائے۔ البتہ وہ عالم، جو ائمہ کے دلائل سے واقف ہے، اس کے لیے تمام مذاہب ایک مذہب جیسے ہیں، کسی بھی مسئلے میں وہ یہ دیکھے کہ وہ ارباب عزیمت میں سے ہے یا اصحاب رخصت میں سے، اگر وہ عزیمت پر عمل کرنے کی اہلیت وصلاحیت کا حامل ہے تو اسے عزیمت پر ہی عمل کرنا چاہیے، اگرچہ وہ قول اس کے امام کے بجائے دوسرے امام کا ہو، اسی طرح اگر وہ اصحاب رخصت سے ہے کہ اسے عزیمت پر عمل کرنا مشکل ہے تو وہ پھر رخصت پر عمل کرے، اگرچہ وہ قول اس کے امام کے بجائے دوسرے امام کا ہو۔ فرماتے ہیں:

''میں یہ نہیں کہتا کہ عزیمت پر عمل کرنے کی قدرت ہوتے ہوئے بھی مکلف کو رخصت و عزیمت میں سے کسی پر بھی عمل کرنے کا اختیار ہے، کیوں کہ اس صورت میں اس کے لیے عزیمت پر عمل کرنا ہی متعین ہے۔ معاذ اللہ! میں یہ کیسے کہہ سکتا، یہ تو دین کو بازیچۂ اطفال بنانا ہوا، جیسا کہ اس کا ذکر ماسبق میں شرح میزان کے ذیل میں ہو چکا۔ رخصت اس شخص کے لیے ہے جو عزیمت پر عمل کرنے سے قطعا عاجز ہے، کیوں کہ ایسی صورت میں یہی رخصت اس کے حق میں عزیمت ہے، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ از راہ انصاف ہر مقلد پر واجب ہے کہ وہ اپنے امام کے بتائے ہوئے رخصت پر عمل نہ کرے الا یہ کہ وہ اصحاب رخصت سے ہو، اور یہ کہ اس پر دوسرے امام کے بتائے ہوئے عزیمت پر عمل کرنا واجب ہے، اگر وہ عزیمت پر قدرت رکھتا ہے؛ کیوں کہ بنیادی اصل کے لحاظ سے حکم شارع کی طرف منسوب ہے کسی اور کی طرف نہیں، بطور خاص اس صورت میں جب کہ دوسرے امام کی دلیل زیادہ قوی ہو۔'' (ص: ۱۵)

امام شعرانی کی یہ بات اور بطور خاص اس کے بعد جو بات کہی ہے وہ ہم میں سے بہتوں کے گلے میں لذیذ مچھلی کے باریک کانٹے کی طرح الجھ جائے گی، فرماتے ہیں:

''برخلاف اس کے جس پر آج بعض مقلدین قائم ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے مجھ سے یہاں تک کہا کہ اگر میں بخاری و مسلم میں بھی کوئی حدیث پالوں جس کو میرے امام نے نہ لیا ہو تو میں اس پر عمل نہیں کروں گا۔ یہ اس شخص کی شریعت سے جہالت ہے۔ سب سے پہلے خود اس کے امام اس سے اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔ اس پر واجب یہ ہے کہ وہ اسے اس طور پر لے کہ اس کے امام کو وہ حدیث نہ ملی ہوگی یا اس حدیث کی صحت اس کے امام کے نزدیک ثابت نہیں ہوئی ہوگی ...... کیوں کہ مجھے کوئی ایسی حدیث نہیں ملی جس پر امام بخاری و مسلم نے اتفاق کیا ہو اور قابل اعتبار ناقدین میں سے کسی نے اس کی تضعیف کی ہو۔ علما نے کہا ہے کہ کسی کو بھی قول

مرجوح پر عمل نہیں کرنا چاہیے الا یہ کہ دینی اعتبار سے اس میں زیادہ احتیاط ہو۔'' (ص: ۱۵)

حضرت امام شعرانی کی مختلف دوٹوک عبارتوں سے صاف اشارہ ملتا ہے کہ حضرت موصوف عوام کے لیے تقلید کو واجب قرار دینے کے باوجود وہ یہ چاہتے ہیں کہ خواص علم و تحقیق کے ذریعے اور بطور خاص سلوک و تربیت اور کشف و شہود کے ذریعے عین شریعت تک پہنچیں اور اس چشمۂ شیریں سے براہ راست سیراب ہوں جس سے ائمۂ مجتہدین سیراب ہوئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے: ''کثرت تقلید بے بصیرتی ہے'' گویا حضرت امام علما کو اس بات پر آمادہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنے دین کے احکام عین شریعت سے اخذ کریں، کسی مجتہد کے حجاب کے پیچھے رہ کر تقلید پر قناعت نہ کرلیں۔'' (ص: ۳۸)

بے ضرورت دوسرے مسلک پر عمل نہ کرنے

امام شعرانی کا میزان کبریٰ اور پیمانۂ عظیم یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام میں شدت اور تخفیف دونوں پہلو ہیں۔ جو جس کا اہل ہو وہ اس پر عمل کرے۔ سوال یہ ہے کہ ایک شخص شافعی مسلک فقہ سے تعلق رکھتا ہے جن کا فتویٰ ہے کہ شرم گاہ کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس نے اگر شرم گاہ کو مس کرلیا تو کیا اسے جائز ہے کہ اس مسئلے میں امام اعظم کے فتوے پر عمل کرلے، جو حکم تخفیف یا رخصت پر مبنی ہے، کیوں کہ ان کے فتویٰ کے مطابق شرم گاہ چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ امام شعرانی فرماتے ہیں کہ شخص مذکور اگر دوبارہ وضو کرنے پر قادر ہے تو امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہوئے بے تجدید وضو نماز پڑھنا اس کے لیے روا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شافعی المسلک فاتحہ کی تلاوت پر قادر ہے تو اسے جائز نہیں کے بغیر تلاوت فاتحہ کے نماز پڑھ لے، یا تلاوت قرآن پر قدرت ہوتے ہوئے ذکر الٰہی کرتے ہوئے نماز پڑھے، یہ بھی اس کے لیے جائز نہیں۔ (ص: ۲۳)

امام شعرانی نے یہ بات لکھ کر اندھی غیر مقلدیت کی رگ کاٹ دی ہے، کیوں کہ امام شعرانی کی تحقیق کے مطابق جس طرح تقلید بے بصارت جائز نہیں، اسی طرح اجتہاد بے بصیرت بھی ممنوع و حرام ہے۔

ائمہ کے فتاویٰ شخصی تھے نہ کہ عمومی

امام شعرانی نے اس حقیقت کو سمجھانے پر پورا زور صرف کیا ہے کہ تمام ائمہ برحق ہیں۔ ان کے تمام اقوال و افعال برحق ہیں۔ جو شخص ان کے دلائل کو سمجھ لے اور یہ دیکھ لے کہ کون سا حکم عزیمت اور شدت کا ہے اور کون سا حکم رخصت اور خفت کا ہے اور وہ پھر اپنی حالت کا جائزہ لے لے کہ وہ عزیمت پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے یا نہیں، اس کے حق میں حضرت امام فرماتے

ہیں کہ اگر عزیمت پر عمل کی قدرت رکھتا ہے تو وہ عزیمت پر ہی عمل کرے، اگر چہ اپنے امام کے خلاف جانا پڑے اور رخصت پر عمل کرنا اس کی مجبوری ہو تو رخصت پر ہی عمل کرے اگر چہ اپنے امام کے خلاف جانا پڑے اور بہر طور وہ حق و ہدایت پر ہے نہ کہ فسق و ضلالت پر۔

یا اخی ان کل من فعل الرخصة بشرطها او المفضول بشرطه فهو علی هدی من ربه فی ذالک، و لو لم یقل به امامه۔ (ص:۲۰)

''اے بھائی! جو شخص رخصت کی شرط کو ملحوظ رکھتے ہوئے رخصت پر عمل کرے یا مفضول کی شرط کی رعایت کرتے ہوئے مفضول پر عمل کرے تو وہ اپنے رب کی طرف سے اس معاملے میں ہدایت پر ہے، اگر چہ وہ اس کے امام کا قول نہ ہو۔''

ایک دوسرے مقام پر تو یہاں تک کہہ دیا:

''ہر مقلد پر یہ اعتقاد رکھنا واجب ہے کہ اگر اس کے امام کے سامنے اس کی حالت رکھی جاتی جو عزیمت پر عمل کرنے سے قاصر ہے تو اگر چہ ان کا فتویٰ عزیمت کا ہے اب وہ رخصت کا فتویٰ دیتے جو دوسرے امام کا قول ہے۔ اور ایسا وہ دوسرے امام کی تقلید کی بنیاد پر نہیں کرتے بلکہ اس عاجز کے حق میں اپنے اجتہاد کی بنیاد پر کرتے۔'' (ص:۳۳)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''ائمہ کے بارے میں ایک واجب الاعتقاد امر یہ ہے کہ وہ حضرات عبادات و معاملات تمام ابواب فقہ میں ہر شخص کو اس کے مناسب حال تخفیف یا تشدید کا فتوی دیتے تھے۔ جس کو بھی اس معاملے میں ہم سے اختلاف ہو اس پر لازم ہے کہ ائمہ سے اس سلسلے میں کوئی صحیح روایت پیش کرے جس سے معلوم ہو کہ وہ لوگوں کو جو فتویٰ دیا کرتے تھے اسے ہر قوی و ضعیف کے حق میں حکم عام سمجھتے تھے۔'' (ص:۳۴)

یعنی کسی امام کا فتویٰ اگر عزیمت پر مبنی ہے تو اسے صرف اہل عزیمت کے حق میں سمجھا جائے اور اگر رخصت پر مبنی ہے تو اہل رخصت کے حق میں، ائمہ کے فتاویٰ کو حکم کلی کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے فتاویٰ سائل کی شخصی حالت کے حالت کے لیے ہیں نہ کہ عمومی حالات کے لیے۔

فتویٰ بر مذاہب اربعہ

''برادرم! یقین جانو کہ شریعت کا مطلوب ممکنہ حد تک اتفاق اور رفع اختلاف ہے، جیسا کہ صاحبان زہد و تقویٰ ائمہ مثلاً امام ابومحمد جوینی اور ان جیسے علما کا اسی پر عمل رہا ہے۔ امام ابومحمد جوینی نے المحیط لکھی اور اس میں کسی خاص مسلک فقہ کی پیروی کا التزام نہیں کیا۔'' (ص:۲۱)

''ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ شیخ امام، عظیم فقیہ، محدث، مفسر، اصولی شیخ عبدالعزیز دیرینی،

شیخ الاسلام عزالدین بن جماعہ مقدسی، علامہ شہاب الدین برلسی المعروف بہ ابن اقیطع رحمہم اللہ تعالیٰ اور شیخ علی بنتیتی مذاہب اربعہ پر فتویٰ دیتے تھے۔ شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے ایسے علما کی ایک بڑی جماعت کا ذکر کیا ہے جو لوگوں کو مذاہب اربعہ پر فتویٰ دیا کرتے تھے، خصوصاً عوام کے حق میں جو نہ کسی مسلک فقہ سے بندھے ہوتے ہیں، نہ اس کے قواعد ونصوص سے آشنا ہوتے ہیں۔ وہ علما فرماتے کہ عوام کا عمل کسی بھی عالم کے قول کے مطابق ہو جائے تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ان علما کے لیے یہ کیوں کر صحیح ہوا کہ انھوں نے لوگوں کو ہر مسلک فقہ کے مطابق فتوی دیا جب کہ وہ مقلد تھے اور مقلد کی شان یہ ہے کہ اپنے امام کے قول سے باہر نہ نکلے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اجتہاد مطلق منتسب کے مقام پر فائز ہوں، جو اپنے امام کے اصول سے باہر نہیں جاتا، جیسے امام ابو یوسف، محمد بن حسن، ابن القاسم، اشہب، مزنی، ابن المنذر اور ابن سریج۔ ان تمام علمانے اگرچہ لوگوں کو ایسے فتوے دیے جن کی صراحت ان کے امام نے نہیں کی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ اپنے امام کے اصول سے نہیں نکلے۔ امام جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ اجتہاد مطلق کی دو قسمیں ہیں: مطلق غیر منتسب، جس پر ائمہ اربعہ فائز ہیں اور مطلق منتسب، جس پر ان کے اکثر اصحاب فائز ہیں، جن کا ہم نے ذکر کیا۔''

''یہ بھی ممکن ہے کہ جو علما مذاہب اربعہ پر فتویٰ دیا کرتے تھے، اللہ نے انھیں شریعت کے اولین سرچشمے پر مطلع کر دیا ہو اور انھوں نے یہ مشاہدہ کیا ہو کہ ائمہ مجتہدین کے جملہ اقوال اسی سرچشمے سے متصل ہیں اور وہ بطور حکم عام کے فتوی نہ دیتے ہوں بلکہ ''میزان'' کے دونوں مرتبوں کا لحاظ کرتے ہوئے لوگوں کے مناسب حال فتویٰ دیتے ہوں۔ چنانچہ نہ وہ قوی کو رخصت کا حکم دیتے ہوں اور نہ ضعیف کو عزیمت کا حکم۔'' (ص: ۲۱/۲۲)

تمام اقوال ائمہ پر عمل ہونا چاہیے

''ہمارے بیان کردہ پیمانے پر جو عمل نہ کرے اور تمام مرجوح اقوال پر عمل کرنا ترک کر دے وہ لازمی طور پر بہت سارے ثواب سے محروم ہوگا اور ان علما کے ساتھ سوئے ادب کا مرتکب ٹھہرے گا جن کے وہ اقوال ہیں، برخلاف اس کے جو اس پیمانے پر عمل کرے گا؛ کیوں کہ وہ قول مرجوح جسے یہ شخص ترک کر رہا ہے ممکن ہے دینی لحاظ سے زیادہ احتیاط پر مبنی ہو۔ ایسے میں اسے متروک کرنا مناسب نہیں، یا زیادہ احتیاط پر مبنی تو نہ ہو البتہ وہ رخصت ہو اور اللہ کو پسند ہے کہ اس کی رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے، جب کہ اس کی شرائط ملحوظ رہیں، جیسا کہ اس بات کی صراحت حدیث پاک میں بھی موجود ہے۔

میرے ایمانی بھائیوں کو یہ بھی معلوم رہے کہ ہر وہ عمل جس کی ایجاد مجتہدین نے فرمائی

اس کے لیے جنت کا کوئی درجہ اور ہر وہ بدعت جسے مجتہدین نے حرام ٹھہرایا اس کے لیے جہنم کا کوئی گڈھا ہے، اگرچہ ان مجتہدین کا مقام ومرتبہ حضرت شارع علیہ السلام سے مختلف اور کم تر ہے اوران کی پسند وناپسند شارع علیہ السلام کی پسند وناپسند سے کم درجہ رکھتی ہے، جیسا کہ اس کی صراحت اصحاب کشف نے فرمائی ہے۔اس بات کو سمجھواور تمہارے لیے مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے ان پر عمل کرواوران تمام باتوں سے احتراز کروجنھیں انھوں نے ناپسند فرمایا ہے اور مجتہدین سے اس سلسلے میں دلیل کا مطالبہ نہ کرو؛ کیوں کہ تم ان کے دائرے کے اندر محبوس ہو جب تک تم ان کے مقام کو نہ پہنچ جاؤ، تمہارے لیے ممکن نہیں کہ تم ان سے آگے بڑھ کر کتاب وسنت تک پہنچواور جہاں سے انھوں نے احکام لیے ہیں وہاں سے تم بھی احکام لو۔

میں نے حضرت علی الخواص رحمہ اللہ کوفرماتے سنا ہے کہ ائمہ کے ان تمام اقوال پر عمل کرو جو بظاہر ایک دوسرے کے مخالف ہیں بشرطے کہ ان پر عمل کے شرائط تم میں موجود ہوں، تا کہ تم پورا ثواب اٹھاسکو۔وہ شخص جو پوری شریعت پر عمل کرتا ہے اس کے مقام سے اسے کیا نسبت جو شریعت کی اکثر باتوں کوترک کر دیتا ہے اوراس پر عمل نہیں کرتا؛ کیوں کہ ایک مسلک فقہ کبھی بھی تمام دلائل کومحیط نہیں ہوسکتا، اگرچہ صاحب مذہب نے فی الجملہ یہ بات کہی ہے کہ صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے اذا صح الحدیث فھو مذھبی بلکہ بسااوقات ایک امام کے مقلدین ان کثیر احادیث کوترک کر دیتے ہیں جن کی صحت ان کے امام کے بعد ثابت ہوئی اور یہ بات ان کے امام کی مراد کے خلاف ہے۔اس بات کو سمجھو۔'' (ص:۲۵،۲۶)

کوئی حدیث یا اجتہاد قابل رد نہیں

''ہر مومن کو چاہیے کہ شرط عمل ملحوظ رکھتے ہوئے تمام احادیث اور مستنبط اقوال پر عمل کرے؛ کیوں کہ کوئی حدیث یا اجتہاد کبھی بھی میزان کے ان دونوں مراتب (تخفیف وتشدید) سے باہر نہیں ہوسکتا۔میں نے سیدی علی الخواص رحمہ اللہ کوفرماتے سنا ہے کہ شارع کے کلام میں یا ائمہ کے کلام میں بظاہر جو کچھ تضاد تمھیں نظر آتا ہے وہ دراصل مختلف احوال پر محمول ہے؛ کیوں کہ شارع کا کلام اس سے بلند ہے کہ اس میں کوئی تضاد ہو۔اسی طرح جو شخص جہالت وتعصب کے بجائے علم وانصاف کی نگاہ سے دیکھے گا اسے ائمہ کا کلام بھی تضاد سے پاک نظر آئے گا۔'' (ص:۲۶)

جو کسی ایک امام کو مصیب سمجھے!

اس سوال کے جواب میں کہ جو شریعت کے اولین سرچشمے سے محجوب ہو گیا، کیا اس پر تقلید شخصی واجب ہے؟ حضرت امام شعرانی رقم طراز ہیں:

جی ہاں! اس پر مسلک معین کی تقلید واجب ہے تا کہ نہ وہ خود گمراہ ہو اور نہ دوسروں کو گمراہ کرے۔ اس لیے اے برادر! جب تمہارا حجاب اٹھ جائے تو ان مقلدین کو معذور سمجھو جو ابھی محجوب ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہر مختلف فیہ مسئلے میں مصیب ایک ہی ہے اور شاید وہ میرا امام ہو۔ باقی خطا پر ہیں جو نفس الامر کے اعتبار سے درست ہونے کا احتمال رکھتے ہیں۔

اے برادر! جو یہ کہتا ہے کہ: ''ہر مجتہد مصیب ہے۔'' اس کے قول کو اس پر محمول کرو کہ اس کا سلوک مکمل ہو چکا ہے، وہ تقلید سے باہر آ چکا ہے اور وہ تمام علما کو عین شریعت سے سیراب ہونے کا مشاہدہ کر رہا ہے اور ہر وہ شخص جو یہ کہتا ہو کہ: ''مصیب غیر متعین طور پر فقط ایک ہے اور باقی خطا پر ہیں، اگرچہ صواب کا احتمال رکھتے ہیں۔'' اس کے قول کو اس طور پر لو کہ ابھی اس کا سلوک مکمل نہیں ہوا ہے۔'' (ص:۲۹)

وسعت نہ کہ اختلاف

امام شعرانی نے تشدید و تخفیف کا جو تاریخی اعتبار سے پہلا اور نادر اصول پیش کیا ہے، اس کے دلائل پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میزان کے دلائل میں سے یہ دلیل بھی ہے کہ شارع کو ہم سے اختلاف کے بجائے اتفاق مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللہ نے دین میں ان باتوں کو مشروع قرار دیا ہے جن کا حکم نوح کو دیا، جس کی وحی ہم نے تم پر نازل کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا، وہ یہ کہ دین قائم کرو اور اس میں اختلاف نہ کرو۔'' (الشوریٰ: ۱۳)

یعنی ایسی آرا پیش نہ کرو جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہوں۔ رہے وہ اقوال جن کی تائید کتاب و سنت سے حاصل ہے وہ نفس دین سے ہیں تفرقہ نہیں۔

اس میزان پر ایک دلیل اللہ کے یہ ارشادات بھی ہیں:

''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔'' (البقرۃ:۱۸۵) ''تمہارے اوپر دین کے معاملے میں اللہ نے تنگی نہیں رکھی ہے۔'' (الحج:۷۸) ''اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔'' (التغابن:۱۶) ''اللہ کسی جان کو اس کی برداشت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتا۔'' (البقرۃ: ۲۸۶) ''اللہ لوگوں کے ساتھ بے حد مہربان اور کریم ہے۔'' (الحج:۶۵)

رہیں اس باب میں احادیث تو وہ بہت سی ہیں۔ مثلاً: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: ''دین آسان ہے اور جو کوئی اس دین سے مقابلہ کرتا ہے وہ مغلوب ہو جاتا ہے۔'' آپ نے سمع و طاعت پر بیعت لیتے ہوئے فرمایا تھا: ''آسانی اور مشکل میں ساتھ دینا جہاں تک تم سے

ہو سکے۔'' اور آپ کا یہ فرمان کہ: ''جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اسے بجالاؤ۔'' اور آپ کا یہ ارشاد بھی کہ ''میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔''

یعنی شریعت کے فروعی احکام میں مختلف حالات میں ائمہ اور ان کے متبعین کے لیے وسعت ہے۔ اختلاف سے مراد یہاں عقیدہ توحید وغیرہ کے اصولی اختلاف نہیں ہیں۔ بعض علما نے یہ کہا ہے کہ یہاں اختلاف سے مراد امور معاش کا اختلاف ہے۔ اس کا بیان آئندہ آئے گا کہ اسلاف لفظ اختلاف کے استعمال کو ناپسند فرماتے تھے، اسے وہ ''وسعت'' کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے تا کہ کہیں عوام غلط فہمی کا شکار نہ ہو جائیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرمایا کرتے تھے: ''یہ نہ کہو کہ علما نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے بلکہ یہ کہو کہ علما نے امت کے لیے اس مسئلے میں وسعت پیدا کی ہے۔'' (ص: ۳۳)

تبدیلی مسلک جائز ہے

امام شعرانی نے لکھا ہے کہ تبدیلی مسلک کی روایت ماضی میں ہمیشہ قائم رہی ہے اور اس کے باوجود علما نے اس پر کسی طرح کی ناگواری کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ اسے تسلیم کیا ہے۔ امام شعرانی اس امر کو اپنے میزان تخفیف وتشدید کی تائید میں پیش کرتے ہیں، کیونکہ علما کے مذکورہ رویے سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ تمام مذاہب کو برحق اور تمام اقوال کو صحیح تسلیم کرتے تھے۔

امام شعرانی نے تبدیلی مسلک کے جواز پر بحث کرتے ہوئے امام زناتی مالکی کے حوالے سے تبدیلی مذہب کی درج ذیل تین شرائط لکھی ہیں:

۱۔ دو مسالک کے بیچ ایسی راہ نہ نکالے کہ اجماع کی خلاف ورزی لازم آئے، مثلاً: کوئی شخص بغیر مہر، بغیر ولی اور بغیر گواہ کے نکاح کرے؛ کیوں کہ یہ صورت کسی امام کے نزدیک درست نہیں۔

۲۔ جس کی تقلید کرے اس کی فضیلت کا اعتقاد رکھے۔

۳۔ اندھی تقلید نہ کرے، مثلاً: اپنے امام کی تقلید کر کے رخصت پر عمل کرے جب کہ اس کے اندر رخصت پر عمل کرنے کی شرائط ہی نہ ہوں۔

اس کے بعد امام جلال الدین سیوطی کے حوالے سے تبدیلی مسلک کرنے والے علما کی فہرست پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شیخ عبدالعزیز بن عمران الخزاعی جو فقہ مالکی کے اکابر علما میں تھے، جب امام شافعی بغداد تشریف لائے تو ان کا اتباع کرنے لگے، ان کی درس گاہ میں پڑھا اور ان کے علم کی اشاعت کی۔ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم بھی امام مالک کے مسلک پر تھے، جب امام شافعی مصر تشریف

لائے تو ان کے مسلک سے وابستہ ہو گئے اور دوسروں کو بھی امام شافعی کے اتباع پر ابھارنے لگے۔ کہتے، بھائیو! یہ مسلک نہیں ہے مکمل شریعت ہے، جب کہ امام شافعی فرماتے کہ تم عنقریب اپنے باپ کے مسلک کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ چنانچہ جب امام شافعی کی وفات ہو گئی تو وہ حضرت امام کے فرمان کے مطابق ان کے مسلک سے پھر گئے۔ دراصل ان کا خیال یہ تھا کہ امام شافعی اپنے بعد انہیں اپنے حلقۂ درس کا جانشین بنائیں گے لیکن انھوں نے امام بویطی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تو ابن عبدالحکم مسلک امام شافعی سے پھر گئے اور اس طرح امام شافعی کی فراست مومنانہ صادق آ گئی۔" (ص:۴۹،۵۰)

اس ضمن میں جن دوسرے علما کا ذکر کیا ہے ان میں ابراہیم بن خالد بغدادی، ابوثور، ابوجعفر بن نصر ترمذی، ابوجعفر طحاوی، خطیب بغدادی، ابن فارس، سیف آمدی صولی، شیخ نجم الدین بن خلف مقدسی، شیخ محمد بن دہان نحوی، شیخ تقی الدین بن دقیق العید، شیخ الاسلام کمال الدین بن یوسف دمشقی اور امام ابوحیان کے نام شامل ہیں۔

حضرت امام شعرانی نے علامہ جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ کے حوالے سے تبدیلی مسلک کی چھ صورتیں لکھی ہیں۔ ان میں بعض جائز ہیں، بعض مذموم، بعض حرام اور بعض ایسی بھی ہیں جو واجب ہیں۔ یہ چھ صورتیں یہ ہیں:

۱۔ تبدیلی کا محرک دنیوی راحت و آسائش ہو، یہ مذموم ہے۔

۲۔ تبدیلی کا محرک دنیوی راحت و آسائش ہی ہو، لیکن تبدیلی کرنے والا ایک عام آدمی ہو جو فقہ سے آشنا نہیں ہوتا، برائے نام مقلد ہوتا ہے، جیسے عوام الناس، ارکان حکومت، سلطنت کے ملازمین اور مدارس کے خدام۔ ان کا حکم خفیف ہے۔ اس لیے ان کے اس عمل پر حرمت کا فتوی نہیں دیا جائے گا۔

۳۔ تبدیلی کا محرک اسی طرح دنیوی آسائش ہو۔ لیکن متعلق شخص کسی مسلک فقہ کا فقیہ عالم ہو۔ وہ صرف دنیوی اغراض و مناصب کے لیے تبدیلی مسلک کر رہا ہو۔ یہ عمل حرام ہے کیوں کہ اس میں دنیوی غرض کے لیے شریعت سے کھلواڑ کرنا لازم آ رہا ہے، نیز اس سے یہ بھی لازم آ رہا ہے کہ مذکورہ شخص امام سابق کے محاسن کا قائل نہیں ہے۔

۴۔ تبدیلی کا محرک دینی غرض ہو۔ متعلق شخص فقیہ مسلک ہو۔ لیکن اس پر دوسرے کی ترجیح واضح ہو گئی ہو۔ یہ تبدیلی جائز ہے بلکہ واجب ہے۔

۵۔ تبدیلی کا محرک دینی غرض ہو، لیکن متعلق شخص فقہ سے عاری ہو، اس نے کسی ایک مسلک کے اعتبار سے تحصیل فقہ کی کوشش کی ہو لیکن کامیاب نہ ہوا ہو اور اسے ایسا لگتا ہو کہ دوسرے

مسلک کے اعتبار سے بہ آسانی تحصیل فقہ کرسکتا ہے اور اس لیے اسے تبدیلی مسلک کرنی ہو۔ ایسے شخص کے لیے قطعی طور پر تبدیلی مسلک کرنا واجب ہے تاکہ کسی بھی ایک امام کے سایے میں آکر عالم ہوجائے اور جہالت کی تاریکی سے بچ جائے۔ امام طحاوی کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ اپنے ماموں امام مزنی کی درس گاہ میں تھے۔ ایک دن کوئی بات سمجھ نہیں پار ہے تھے۔ شیخ نے جھنجھلا کر حلفیہ یہ کہہ دیا کہ تم کچھ نہیں سیکھ پاؤ گے۔ اس کے بعد امام طحاوی حنفی فقہ سیکھنے لگے اور امام وقت بنے۔ آپ فرماتے تھے کہ اگر ہمارے ماموں زندہ ہوتے تو انھیں اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا۔

٦۔ تبدیلی کا محرک کچھ بھی نہ ہو، نہ کوئی غرض دنیا اور نہ کوئی فکر دین۔ ایسا کرنا ایک عامی کے لیے جائز ہے اور فقیہ کے لیے مکروہ یا ناجائز۔ (ملخصاً ص: ۵۳-۵۲)

تبدیلی مسلک کے حوالے سے اس عہد میں ایک غلط فہمی یہ رائج تھی کہ دوسرے مسلک کو ترک کر کے کوئی حنفی تو بن سکتا ہے لیکن کوئی حنفی دوسرا مسلک اختیار نہیں کرسکتا۔ یہ سوال جب امام سیوطی کے پاس پیش ہوا تو آپ نے فرمایا:

''قائل کا یہ تحکمانہ فرمان ہے۔ کتاب وسنت سے اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ کسی حدیث صحیح یا ضعیف میں تعین کے ساتھ کسی امام کی فضیلت وارد نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے تقدم زمانی سے ان کی افضلیت پر اگر کوئی استدلال کرے اور اس استدلال کو درست مانا جائے تو لازم آئے گا کہ جو بھی اجتہاد کی اہلیت نہیں رکھتا وہ امام ابوحنیفہ کی تقلید کرے اور یہ خلاف اجماع ہے۔ (ص: ۵۱)

اذا صح الحدیث فھو مذھبی کا مفہوم

اجتہاد وتقلید کے باب میں ائمہ مجتہدین کے اس قسم کے ارشادات: اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔ ''جب حدیث کی صحت ثابت ہوجائے تو وہی میرا مذہب ہے۔'' اہل علم کے درمیان کافی زیر بحث رہے ہیں۔ بعض علما نے اس کے معنی یہ لکھے ہیں کہ جن علما کا یہ ارشاد ہے ان کے اقوال احادیث صحیحہ پر ہی مبنی ہیں۔ ان کا کوئی قول حدیث صحیح کے خلاف نہیں ہے۔ بعض نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ قائل کی مراد یہ ہے کہ جب بھی کوئی صحیح حدیث مل جائے میں اپنے قول سے اس صحیح حدیث کی طرف رجوع کر لیتا ہوں۔ بعض علما نے اس ارشاد کے یہ معنی لیے ہیں کہ ائمہ نے یہ بات اپنے متبعین کے حق میں کہی ہے کہ اگر میرے بعد کوئی حدیث صحیح مل جائے تو اس پر عمل کرنا، میرے قول کو ترک کر دینا؛ کیوں کہ حدیث صحیح کے بالمقابل میرے قول کی کوئی حیثیت نہیں۔

پھر اسی قول سے متعلق ایک دوسرا مسئلہ اہل علم کے یہاں موضوع بحث رہا ہے کہ ائمہ مجتہدین تک تمام حدیثیں پہنچ گئی تھیں یا نہیں؟ اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں یہ من جملہ تمام احادیث ہیں یا ان میں سے بعض مفقود بھی ہوگئی ہیں۔ اسی سلسلۂ بحث کی ایک کڑی یہ

بھی ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ بعض احادیث ائمۂ مجتہدین تک صحت کے ساتھ پہنچی تھیں اور وہ بعد میں آکر ضعیف ہوگئیں۔ بہرکیف! ائمہ مجتہدین کا یہ ارشاد: **اذا صح الحدیث فھو مذھبی** کی تفہیم میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی اجتہاد و تقلید کے حوالے سے بڑی اہمیت ہے۔ امام شعرانی نے بھی اس پر کلام فرمایا ہے۔ ان کے چند اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

''میں نے سیدی علی الخواص رحمہ اللہ کو فرماتے سنا کہ جو شخص ایک مسلک کا مقلد ہو وہ کبھی بھی پوری شریعت پر عمل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ اس کے امام نے یہ بات کہی ہے کہ: **اذا صح الحدیث فھو مذھبی** ''حدیث صحیح ہی میرا مسلک ہے'' اس کے باوجود وہ مقلد ان بہت ساری احادیث کو ترک کر دیتا ہے جن کی صحت دوسرے ائمہ کے نزدیک ثابت رہی ہے۔ اس میزان کے تناظر میں یہ رویہ اس مقلد کی بے بصیرتی ہے اور اپنے امام کے فرمان کو غلط طور پر سمجھنا ہے۔ گویا اس کے امام نے اپنی طرف سے شریعت گڑھ دی ہو۔ اس کے امام جو یہ فرماتے ہیں: **اذا صح الحدیث ای بعدی فھو مذھبی** ''یعنی جب میرے بعد صحیح حدیث ملے تو وہی میرا مسلک ہے'' وہ دوسرے کے بالمقابل پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام کے ارشادات کی اہمیت کو زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ واللہ اعلم

یہ بڑا نفیس کلام ہے، کیوں کہ احکام شریعت کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب احادیث و مسالک کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر اس طرح کر دیا جائے جیسے کہ دو مرتبے (تشدید و تخفیف) کا حامل ایک مسلک بن جائے۔'' (ص: ۳۵)

اس کے بعد خود ہی یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ اگر تم کہو کہ وہ حدیث جن کی صحت میرے امام کی وفات کے بعد ثابت ہوئی، میرے امام نے ان سے استفادہ نہیں کیا، ان کا کیا کروں؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں:

''بہتر یہی ہے کہ ان احادیث پر عمل کرو؛ کیوں کہ اگر تمہارے امام کو وہ حدیثیں مل جاتیں اور ان کی صحت ان پر واضح ہو جاتی تو عین ممکن ہے کہ وہ تمہیں اس کا حکم دیتے؛ کیوں کہ تمام ائمہ شریعت کے اسیر ہیں....... جو ایسا عمل کرتا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے خیر لوٹتا ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ میں صرف اسی حدیث پر عمل کروں گا جس کو میرے امام نے لیا ہے وہ بھی خیر کثیر کا حامل ہے۔ جیسا کہ اسی موقف پر کثیر مقلدین قائم ہیں۔ جب کہ ان کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ ہر اس حدیث پر عمل کریں جس کی صحت ان کے امام کے بعد ثابت ہوئی تاکہ ائمہ کی وصیتوں کا نفاذ ہو سکے؛ کیوں کہ ہمارا اعتقاد یہی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور انہیں وہ حدیثیں مل جاتیں جن کی صحت ان کے بعد ثابت ہوئی تو وہ ضرور ان سے استفادہ کرتے، ان پر عمل کرتے اور ان کے بالمقابل اپنے قیاس کو ترک فرما دیتے۔'' (ص: ۳۶)

اذا اخطأ المجتهد کے معنی

امام شعرانی پورے شدومد سے اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ تمام ائمہ برحق اور مصیب ہیں، ان میں کوئی خاطی نہیں، جب کہ حدیث میں واضح طور پر یہ بات آئی ہے کہ مجتہد سے خطا ہوتی ہے، ارشاد ہے: اذا اجتهد الحاکم وأخطأ فله اجر وان اصاب فله اجران۔ اگر حاکم اجتہاد کرے اور خطا کر جائے تو اسے ایک اجر ملے گا اور اگر وہ صواب پر پہنچ جائے تو دو اجر۔ اس حدیث سے امام شعرانی کے نظریے پر جو اعتراض ہوتا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہاں خطا سے مراد مجتہد کا اس مسئلہ میں دلیل نہ پانا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ اس کی وجہ سے شریعت سے باہر چلا جائے گا، کیوں کہ مجتہد اگر شریعت سے خارج ہو تو اسے کوئی اجر نہیں ملتا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''کل امر لیس علیه امرنا فهو رد'' ہر وہ بات جو میرے دین سے باہر کی ہو وہ مردود ہے۔ چوں کہ شارع نے خطا کے بعد بھی مجتہد کے لیے اجر ثابت رکھا ہے، اس لیے لامحالہ حدیث کے معنی یہی ہوں گے کہ جب مجتہد اجتہاد کرے اور شارع سے منقول اس بات کی دلیل کو پالے تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔ ایک تلاش کرنے کا اجر اور دوسرا پالینے کا۔ اور اگر وہ دلیل نہ پاسکے صرف حکم پائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے اور وہ تلاش کرنے کا اجر ہے۔ اس لیے مذکورہ حدیث میں خطا سے مراد اضافی خطا ہے خطائے مطلق نہیں۔'' (ص: ۲۶)

تقلید شخصی کے معنی

تقلید شخصی کا مفہوم جو عام ذہنوں میں موجود ہے، وہ یہ ہے کہ کسی بھی حال میں اپنے امام کے قول سے انحراف جائز نہیں، جب کہ امام شعرانی کے پیمانے کے مطابق ائمہ کے تمام اختلافات عزیمت اور رخصت یا تشدید اور تخفیف پر مبنی ہیں۔ ایسے میں ہر شخص کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عزیمت کی حالت میں ہے یا رخصت کی حالت میں، اگر عزیمت کی حالت میں ہے تو عزیمت پر عمل کرے، خواہ وہ دوسرے امام کا قول ہو، اسی طرح اگر وہ رخصت کی حالت میں ہو تو رخصت پر عمل کرے خواہ وہ دوسرے امام کا قول ہی کیوں نہ ہو...... امام شعرانی کے اس اصول سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف ہیں جو تقلید شخصی کو واجب سمجھتے ہیں، کیوں کہ ان کے یہاں تو مقلدین پر تنگی پائی جاتی ہے کہ کسی کو امام سے انحراف روا نہیں ہوتا جب کہ امام شعرانی اس قسم کی سختی کے قائل نہیں۔

امام شعرانی نے اس شبہے کا جو جواب دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شبہ پیدا ہونے کی وجہ یہ نہیں کہ امام موصوف تقلید شخصی کے خلاف ہیں۔ شبہے کی وجہ یہ ہے کہ تقلید شخصی کا یہ مفہوم غلط ہے کہ مقلد ہر حالت میں ایک امام سے چمٹا رہے اور ضرورت و حاجت کے وقت بھی اپنے امام کے مذہب

سے عدول نہ کرے۔ وہ عزیمت پر عمل کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو جب بھی قول امام ہونے کی وجہ سے مجبوراً عزیمت پر عمل کرے اور دوسرے امام کے قول رخصت پر عمل نہ کرے۔ فرماتے ہیں:

''کسی خاص مسلک فقہ کے اتباع میں درحقیقت کوئی مشقت ہے ہی نہیں، کیوں کہ اس مسلک کے بانی نے ضعیف کے لیے عزیمت کو واجب نہیں کیا ہے بلکہ اس کے لیے یہ جواز رکھا ہے کہ وہ اپنے مسلک سے خروج کرتے ہوئے دوسرے امام کے قول رخصت پر عمل کرے۔ اس طرح اس امام کا مسلک بھی شریعت کے دونوں مرتبوں (تشدید وتخفیف) پر مبنی ہوا۔ اس لیے جو مسلک معین کے التزام کو واجب سمجھتے ہیں ان کے یہاں بھی درحقیقت کوئی تنگی یا مشقت نہیں ہے۔ اگر اس انداز میں شریعت کو نہیں سمجھا گیا تو گویا شریعت کو سمجھا ہی نہیں گیا اور اس طور پر مجتہدین کے مسلک کو پیش نہیں کیا گیا تو گویا درحقیقت پیش ہی نہیں کیا گیا اور نہ مقلد کا یہ اعتقاد درست ہوا کہ مسلمانوں کے تمام ائمہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں بلکہ اس کا قلب، اس کی زبان کے خلاف ہے اور یہ نفاق کی ایک صفت ہے۔ (ص: ۴۲)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''ہر وہ مقلد جو مشکل حالات میں بھی دوسرے امام کے قول پر عمل کرنے سے گریزاں ہے اس کا گریز، ہٹ دھرمی ہے نہ کہ تقویٰ۔'' (ص: ۴۶)

ترجیح مسلک پر تنقید

علمائے فقہ کی عام روش یہ ہے کہ وہ فقہی معاملات میں کسی مسلک فقہ سے وابستہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دلائل وشواہد سے اپنے مسلک کی ترجیح کو واضح کریں۔ حضرت امام شعرانی کو یہ روش سخت ناگوار ہے۔ انہوں نے جابجا لکھا ہے کہ جب سارے مسالک عین شریعت کبریٰ سے پھوٹ کر نکلے ہیں تو پھر ان میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے کیا معنیٰ؟ انہوں نے کئی مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ جو لوگ ترجیح مسلک کا کام کرتے ہیں وہ دراصل عین شریعت سے محجوب ہیں۔ ان کا یہ اعتقاد کمزور ہے کہ سارے ائمہ برحق ہیں۔ انہوں نے مختلف مقامات پر بہت صاف گوئی کے ساتھ کہا ہے کہ جو واصل عین شریعت ہوگا وہ اس طرح کی باتیں ہرگز نہیں کرسکتا۔ اس ضمن میں انہوں نے امام بیہقی اور امام زیلعی جیسے محدثین پر بھی نقد کیا ہے جنہوں نے ترجیح مسلک کا کام اپنے طور پر پورے طمطراق سے کیا ہے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''امام بیہقی اور حافظ زیلعی نے اپنی کتابوں میں اپنے مسلک کے دلائل جمع کیے ہیں، اپنے مسلک کا دفاع کیا ہے اور اپنے دلائل کو راویوں کی کثرت یا سند کی صحت کی بنیاد پر ترجیح دی ہے، وہ بسا اوقات یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ دلیل اگرچہ صحیح ہے لیکن ہمارے مسلک کی احادیث سند کے لحاظ سے

زیادہ صحیح ہیں اور اس کے راوی بھی زیادہ ہیں۔ یہ حضرات اس طرح کی باتیں اس وقت کرتے ہیں جب مخالف کی دلیل کی بالکلیہ تضعیف وتردید سے عاجز ہوتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرنے والے امام بیہقی اور دوسرے علما اگر اس حقیقت سے آشنا ہوجاتے جس سے ہم آشنا ہوئے کہ شریعت تشدید وتخفیف دو درجوں پر نازل ہوئی ہے تو انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ ہماری حدیث زیادہ صحیح ہے یا اس کے راوی زیادہ ہیں بلکہ ہر حدیث کو اور اپنے مخالف ہر قول کو شریعت کے دو مرتبوں میں سے کسی ایک مرتبے میں تسلیم کرتے۔ یہی بات ائمہ کے ان مقلدین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو ترجیح مسلک کا کام کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ قول اصح ہے اور یہ صحیح ہے۔ اس طرح کی باتیں انہوں نے صرف اس لیے کہی کہ وہ میزان کے ان دونوں مرتبوں سے واقف نہیں تھے۔ اگر وہ اس پر مطلع ہوتے تو اپنے مسلک کے اقوال میں اصح اور صحیح اور اظہر اور ظاہر نہیں کہتے، بلکہ تمام اقوال کی صحت کا قول کرتے اور انہیں تخفیف وتشدید میں سے کسی ایک مرتبے میں رکھتے اور سائل کو اس کے مناسب حال فتویٰ دیتے، قوی کو عزیمت کا حکم دیتے اور ضعیف کو رخصت کا حکم دیتے اور اس طرح چاروں مسالک فقہ پر فتویٰ دیتے۔'' (ص:۴۵)

علما اپنے عہد کے نمائندے ہوتے ہیں

علما مختلف احوال میں مختلف فتاویٰ صادر کرتے ہیں۔ ایک عہد میں ایک قول راجح قرار دیتے ہوئے اس پر فتوی دیتے ہیں جب کہ دوسرے عہد میں بعض دوسرے علما اسے مرجوح قرار دیتے ہیں اور اپنے عہد کے لحاظ سے فتوی دیتے ہیں۔ تقلید محضیت میں ڈوبے ہوئے اذہان وافکار پر یہ روش بہت گراں گزرتی ہے اور بسا اوقات لوگ طنز وتعریض بلکہ صریح دشنام طرازی پر اتر جاتے ہیں۔ امام شعرانی نے المیزان الکبریٰ کے اندر ایک مقام پر ایسے افراد کی تفہیم کی بڑی اچھی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی جب یہ مشیت ہوتی ہے کہ اس کے بندے جن احکام پر پہلے کاربند تھے ان کے بجائے مخصوص انداز سے اب دوسرے احکام پر عمل کریں تو ان کے علما کے سامنے ان اقوال کے برخلاف جن کی ترجیح کے وہ اب تک قائل تھے دوسرے اقوال کی ترجیح کو واضح فرما دیتا ہے۔ وہ علما فوراً ان جدید اقوال پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کا راجح ہونا اب ان پر واضح ہوا ہے اور ان کے مقلدین بھی پورے شرح صدر کے ساتھ ان جدید اقوال کی ترجیح کرنے لگتے ہیں۔ یہ معاملہ یوں ہی چلتا رہے گا حتی کہ یہ مسالک ختم ہوجائیں گے۔ اس کی تائید حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے:

''اللہ تعالیٰ احوال زمانہ کے اعتبار سے مسائل پیدا فرماتا ہے۔''

حضرت عطا، مجاہد اور امام مالک کا طرز فکر بھی یہی تھا۔ چنانچہ ان حضرات سے جب مسائل پوچھے جاتے تو ان میں سے صرف درپیش مسائل کے ہی جواب عنایت فرماتے اور غیر واقع مسائل کے بارے میں وہ یہ کہتے کہ جب یہ مسائل پیدا ہوں گے تو ان کے بارے میں اس عہد کے علما فتویٰ دیں گے۔

ممکن ہے اس کے پس پردہ بھی امت مسلمہ پر اللہ کو رحم فرمانا مقصود ہو۔ کیوں کہ ایسا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ حکم سابق پر عمل کرنے میں اس عہد کے لوگوں کے اندر تکلف وملول پا کر ان کے لیے ایسے علما پیدا فرما دیتا ہو جو حکم سابق پر عمل کو باطل قرار دیتے ہوں اور ایسے ہی علما اپنے زمانے کے مقتدا ہوں؛ کیوں کہ وحی کا سلسلہ بند ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ان پر اس طور پر رحم فرمانا چاہتا ہو کہ ہر زمانے میں ان کے لیے شریعت کے ایسے احکام مشروع فرما دیتا ہو جن کی طرف وہ قلبی میلان پاتے ہیں، انہیں قبول کرتے ہیں اور ان پر عمل کرنے میں فی الجملہ کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے۔

یہ بات بھی کہی جاتی ہے، واللہ اعلم، کہ ایسا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لیے ہوتا ہے تا کہ اس امت کے علما کو بھی وہ مقام حاصل ہو جائے جو ان انبیا کو حاصل تھا جن کے یہ وارث ہیں، اس طور پر کہ گو یا ہر زمانے میں ایک طرح سے نئی شریعت لے کر آتے ہیں جو شریعت سابقہ کے لیے ناسخ نظر آتی ہے۔ واضح رہے کہ یہاں نسخ اپنے حقیقی معنی میں نہیں ہے۔'' (ص: ۴۳-۴۲)

اجمال کی تفصیل جاری رہے گی

اس میں کسی کو کوئی بحث نہیں کہ قیامت تک علما پیدا ہوتے رہیں گے۔ بحث اس میں ہے کہ علما کا رول کیا ہے؟ امام شعرانی کے نقطۂ نظر سے ہر دور کے علما کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ ماضی کے علوم وفنون اور اقوال وفتاویٰ کو نقل کرتے رہیں بلکہ ہر عہد کے علما کو اپنے عہد میں بعض فیصلے خود لینے پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دن نئے حالات اور نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ماضی کے علما کے فتاویٰ پورے طور پر ان کا احاطہ نہیں کر پاتے۔ ایسے میں ہر عہد میں موجود علما کا رول یہ ہے کہ پیش رو علما کے اقوال وفتاویٰ میں جو اجمال رہ گیا ہے اس کی تفصیل کریں تو حال کے مسائل بہ آسانی حل ہو جائیں گے۔

امام شعرانی کا خیال ہے کہ اجمال ہر دور میں جاری وساری ہے۔ اس لیے ہر دور کے علما اپنے طور پر ماضی کے اجمال کی تفصیل کرتے ہیں۔ پھر ان کی تفصیل کے بعد بعض دوسرے پہلوؤں سے جو اجمال رہ جاتا ہے اس کی تفصیل ان کے بعد والے علما کرتے ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ فرماتے ہیں: ''باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے حق میں فرمایا ہے کہ: ''ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کو ترک نہیں کیا ہے۔: مافرطنا فی الکتاب من شیء۔ (الانعام: ۳۸)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے طہارت، نماز اور حج وغیرہ کے طریقے بیان نہیں فرمائے ہوتے تو امت کا کوئی شخص ان امور کو قرآن سے نہیں نکال پاتا۔ نہ ہم فرائض ونوافل کی رکعتوں کی تعداد اور ان دوسرے امور سے واقف ہو پاتے جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔ تو جس طرح شارع علیہ السلام نے اپنی سنتوں کے ذریعے قرآن کے مجمل احکام کو واضح فرمایا اسی طرح ائمۂ مجتہدین نے احادیث کریمہ میں موجود اجمال کی ہمارے لیے تفصیل فرمائی۔ اگر ائمہ مجتہدین نے ہمارے لیے اجمال شریعت کی تفصیل نہیں فرمائی ہوتی تو شریعت مجمل ہی رہ جاتی۔ یہی بات قیامت تک پچھلے دور کے بالمقابل ہر دور کے حق میں کہی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ علمائے امت کے کلام میں قیامت تک اجمال کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ کتابوں کی شروحات لکھی جاتیں اور نہ ہی شروحات پر حواشی لکھے جاتے۔'' (ص:۵۸)

عین شریعت تک رسائی کا راستہ اور امام شعرانی کا تجربہ

''عین شریعت تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ کسی شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر سلوک طے کیا جائے۔ ایسا شیخ جو ہر حرکت وسکون کے پیمانے سے واقف ہو، یہ بیعت اس طور پر ہو کہ مرید کلی طور پر اپنے کو شیخ کے حوالے کر دے، شیخ جیسے چاہے اس کی ذات اور اس کے مال وعیال میں تصرف کرے اور اس پر مرید کو مکمل انشراح صدر رہے۔ وہ مرید جس کا شیخ یہ حکم دے کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو یا اپنے حق مال سے دست بردار ہو جاؤ یا ملازمت چھوڑ دو اور اس پر مرید توقف کرے تو ایسا مرید عین شریعت کبریٰ تک رسائی کی راہ کی بو بھی نہیں پا سکتا، اگر چہ وہ ہزار سال تک مسلسل عبادت کرتا رہے۔ اکثری حکم یہی ہے۔''

''اس کی شرائط میں یہ بھی ہے کہ رات اور دن میں لمحہ بھر بے وضو نہ رہے۔ دوران سلوک سوائے ضرورت کے کبھی بے روزہ نہ رہے اور نہ کوئی ایسی چیز کھائے جو اصلا ذی روح ہو۔ اضطرار کے آثار ظاہر ہونے کے بعد ہی کھائے۔ کسی ایسے شخص کا کھانا نہ کھائے جو حصول معاش میں زہد وورع کا حامل نہ ہو، جیسے ایسا شخص جو اپنا زہد وورع دکھانے کے لیے دوسروں کو کھلاتا ہے یا جیسے وہ شخص جو غیر متقی زمین داروں اور حکومتی افراد سے خرید وفروخت کرتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے اللہ کی یاد سے غافل نہ رہے۔ شب وروز مراقبے میں مصروف رہے۔''

''میں نے یہ دولت سب سے پہلے حضرت خضر علیہ السلام سے بطور علم وایمان اور تسلیم ورضا حاصل کی۔ پھر سیدی علی الخواص کے ہاتھ پر سلوک کے منازل طے کیے یہاں تک کہ بطور ذوق وکشف اور یقین واذعان، عین شریعت پر مطلع ہو گیا۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا۔ میں نے مختلف مجاہدے کیے۔ میں خلوت کدے کی چھت سے رسی باندھ دیتا اور اسے اپنی گردن میں باندھ

لیتا تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آرام کے لیے لیٹ جاؤں۔ میں نے زہد وتقویٰ میں بڑی شدت برتی، یہاں تک کہ جب مجھے کھانے کے قابل کوئی چیز نہیں ملتی تو مٹی چاٹ لیا کرتا اور مٹی سے گوشت، گھی یا دودھ کی چکناہٹ پاتا۔ اس معاملے میں مجھ پر حضرت ابراہیم بن ادہم سبقت لے گئے کہ جب ان کے مقام کے لائق حلال رزق میسر نہیں ہوا تو انہوں نے بیس دنوں تک مٹی چاٹ کر گزارا کیا۔ اسی طرح کبھی کسی حکمراں کے سائے سے نہیں گزرتا۔ بغیر تحقیق وتفتیش کے کچھ بھی نہ کھاتا۔ شریعت کی رخصتوں پر عمل نہیں کرتا اور بحمد اللہ میں ابھی بھی اسی پر قائم ہوں۔ البتہ قوت بینائی میں فرق پڑا ہے۔ اس سے پہلے میں کسی سامان کے مالک کا ہاتھ دیکھتا اور اب اس سامان کے رنگ، بو اور ذائقے کو دیکھتا ہوں۔ حلال سامان میں خوش بو پاتا ہوں اور حرام میں بدبو........ جب میرا سلوک اس مقام تک پہنچا تو میں دل کی نگاہوں سے عین شریعت کا نظارہ کرنے لگا، جس سے ہر عالم کا قول مستفاد ومتفرع ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ہر عالم کا نالہ اسی چشمے سے پھوٹ کر نکل رہا ہے اور میں نے ان تمام نالوں کو محض شریعت پایا۔ اور اس بات کا ظن نہیں از راہ کشف مکمل علم یقینی حاصل ہو گیا کہ ہر مجتہد مصیب ہے اور یہ کہ کوئی مسلک فقہ کسی دوسرے کے بالمقابل شریعت سے زیادہ قریب نہیں ہے۔ میں نے دیکھا کہ ان مجتہدین کے نالے خشک ہو کر پتھر بن چکے ہیں جن کے مسالک ختم ہو چکے ہیں۔ میں نے جو نالے جاری دیکھے وہ فقط ائمہ اربعہ کے چاروں نالے تھے۔ میں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ یہ چاروں مسالک قیامت کے قریبی آثار کے ظہور تک قائم رہیں گے۔ میں نے اپنے پچھلے اعتقاد سے رجوع کر لیا جو یہ سمجھا کرتا تھا کہ میرا مسلک فقہ دوسروں کے فقہی مسلک پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ کہ ائمہ میں غیر متعین طور پر کوئی ایک ہی مصیب ہوتا ہے۔

چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:

مقامات عالیہ تک رسائی دو میں سے کسی ایک ہی طریقے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یا تو اللہ جذب کے ذریعے کسی کو اس راہ تک پہنچا دے یا شیخ صادق کے ہاتھ پر سلوک مکمل کر کے اس مقام تک پہنچ جائے؛ کیوں کہ بندوں کے اپنے اعمال میں بہت سی خامیاں باقی رہتی ہیں، بلکہ اگر وہ ان خامیوں کے ازالے پر قادر بھی ہو، جب بھی اسے عین شریعت تک رسائی کی راہ نہیں مل سکتی، کیوں کہ وہ اپنے امام کی تقلید کے دائرے میں محبوس ہے۔ اس کا امام جو عین شریعت کا مشاہدہ کرنے والا ہے، اس کے اور اس چشمے کے بیچ حجاب بنتا ہے۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے امام سے آگے بڑھ کر اس چشمے کا نظارہ کرے الا یہ کہ کسی ایسے شیخ عارف وکامل کے ہاتھ پر منازل سلوک طے کرے جو مقام ومرتبے میں اس سے بلند ہو۔ اس لیے کہ مقلد کے لیے محال ہے کہ وہ یہ اعتبار کرنے لگے کہ ہر مجتہد مصیب ہے مگر صرف اسی سلوک کے توسط سے، حتی کہ وہ مقام شہود تک رسائی پانے میں اپنے شیخ کے مساوی ہو جاتا ہے۔

علم متقدمین اور علم متأخرین

امام شعرانی نے المیزان الکبریٰ میں جو اصول پیش کیا کہ کشف کے ذریعے عارف عین شریعت پر پہنچ جاتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر تقلید کی زنجیر سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس مقام بلند کا دعوی خود اپنے لیے بھی کیا ہے، تاریخی اعتبار سے یہ بات بالکل نئی تھی۔ امام شعرانی نے تاریخ میں پہلی بار المیزان الکبریٰ کے ذریعے یہ نظریات پیش کیے۔ اس پر کئی طرح کے اعتراضات وارد ہوتے ہیں، مثلاً: یہ کہ جو بات متقدمین نے نہیں کہی اسے کسی متأخر کو کہنے کا کیا حق ہے؟ کیا بعد والے کا علم پیش رو علما کے علم سے زیادہ ہو گیا ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ائمہ اربعہ کے دلائل کا احاطہ کرلے، وغیرہ۔ ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے امام شعرانی لکھتے ہیں:

''تمہاری اس طرح کی باتیں جہالت اور دین میں جرأت و جسارت پر مبنی ہیں۔ تم المیزان الکبریٰ کے مصنف سے ملاقات کرلو اور اس سے بحث کرلو۔ اگر وہ تم کو دلیل سے قائل کردے تو تم پر واجب ہے کہ تم اس نظریے کی طرف رجوع کرلو۔ اگر چہ اس سے پہلے یہ بات کسی اور نے نہیں کہی۔ اور یہ کہہ کر کہ میزان کا مصنف شریعت سے جاہل ہے، دروغ و بہتان کے مرتکب نہ بنو۔ اگر ایسے شخص کو جاہل کہا جائے جو تمام مسالک کے تمام اقوال کے احکام کی توجیہ کرسکتا ہے، تو پھر تو روئے زمین پر اس وقت کوئی عالم ہے ہی نہیں۔ امام محمد بن مالک کا ارشاد ہے:

''جب علوم، ربانی عطیات اور لدنی خصوصیات ہیں تو اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ بعض متأخرین کو اس ذخیرۂ علم سے نواز دے جس پر متقدمین میں کوئی بھی مطلع نہیں ہو سکا۔''

برادرم! تمہیں خدا کا واسطہ! حق کی طرف رجوع کرو اور اعتقاد لسانی اور اعتقاد قلبی میں یکسانیت لاؤ۔ اس بات سے تمہیں یہ خیال نہ روکے کہ علمائے سابقین میں سے کسی نے بھی ایسا میزان مدون نہیں کیا، کیوں کہ فیض ربانی ہر زمانے میں علما کے قلوب پر برستا رہتا ہے۔ اگر چہ تمہاری طبیعت حقیقی کشفی علوم سے مانوس نہیں ہے تاہم اپنے سائنسی اور عقلی علوم سے نکل کر اس طرف آؤ تو سہی۔'' (ص: ۱۸)

حرف اختتام

اہل سنت و جماعت اور بطور خاص صاحبان ذوق تصوف کے درمیان حضرت امام عبدالوہاب شعرانی کی شخصیت مسلم اور ہر قیل وقال سے بالاتر ہے۔ گذشتہ صدی کے ممتاز فقیہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری بریلوی نے اپنے فتاویٰ میں سیکڑوں مقامات پر انھیں کوٹ (Quote) کیا ہے۔ اور عارف باللہ اور قطب ربانی جیسے القابات سے یاد کیا ہے۔ ان کی کتاب المیزان الکبریٰ اپنی نوعیت کی بالکل منفرد کتاب ہے۔ آیات و احادیث اور اقوال و آثار میں جو

بظاہر تضاد نظر آتا ہے، جن کی بنیاد پر مجتہدین امت کے مختلف نقطۂ نظر اور اختلافات سامنے آئے، ان اختلافات کی مختلف علما نے اپنے اپنے طور پر توجیہ وتشریح کی ہے۔امام شعرانی کی اس کتاب کا موضوع بھی یہی ہے۔لیکن انہوں نے ان اختلافات کی پہلی بار سب سے جداگانہ اور منفرد توجیہ کی ہے۔اس توجیہ کے مطابق علما کے اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ شریعت میں ایک ہی مسئلے میں ایک سخت حکم آیا ہے اور دوسرا نرم حکم آیا ہے۔سخت حکم جسمانی وروحانی اعتبار سے قوی لوگوں کے لیے اور نرم حکم ضعیف اور کمزور لوگوں کے لیے ہے۔اس لیے جو قوی ہوں سخت حکم (عزیمت) پر عمل کریں اور جو ضعیف ہوں وہ نرم حکم (رخصت) پر عمل کریں۔اس طرح شریعت کے احکام میں کوئی اختلاف وتضاد نہیں رہ جائے گا۔

اس توجیہ کے بعد دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تقلید شخصی کے کیا معنی ہیں جس کے مطابق ایک شخص کو لازمی طور پر اپنے امام کے قول کا اتباع کرنا پڑتا ہے۔اس سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا ہے کہ دراصل تقلید کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ ضرورت وحاجت ہر حالت میں اپنے امام کے قول پر جمار ہا جائے، نہ ائمہ مجتہدین کا یہ مقصد رہا ہے۔ائمہ مجتہدین نے لوگوں کے حالات دیکھ کر احکام صادر فرمائے۔مثال کے طور پر جس امام کا قول عزیمت پر مبنی ہے اگر خود اس امام سے کوئی ضعیف اپنے لیے حکم دریافت کرتا تو اس کے لیے وہ رخصت کا حکم دیتے نہ کہ عزیمت کا۔

اب تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ تقلید امام کسی پر واجب ہی نہیں؟اس کا جواب امام موصوف نے یہ دیا ہے کہ جو عین شریعت پر پہنچ چکے ہیں اور احکام کی بنیادوں سے واقف ہیں ان پر تقلید واجب نہیں۔وہ اپنی حالت دیکھیں اگر ان کی حالت عزیمت کی ہے تو عزیمت پر عمل کریں اور رخصت کی ہے تو رخصت پر عمل کریں۔البتہ جو لوگ اس مقام پر نہیں پہنچے ہیں ان پر تقلید امام واجب ہے۔اس کے علاوہ تمام مسالک فقہ کی صداقت، تمام ائمہ مجتہدین کے درمیان مساوات اور عدم تفضیل، تبدیلی مسلک کا جواز، وقت ضرورت وحاجت دوسرے مسلک پر فتویٰ، اہل علم کے لیے سائل کی حالت دیکھتے ہوئے مسالک اربعہ پر فتوے کا جواز، حدیث صحیح ملنے کے بعد قول امام کے بجائے حدیث صحیح پر عمل کا حکم اور اس طرح کے جو دوسرے نظریات پیش کیے ہیں وہ ہم سب کے لیے قابل غور اور باعث احتساب ہیں۔بھی عین ممکن ہے کہ ان حقائق کی نقاب کشائی سے بہت سے لوگ الجھن اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جائیں، جب کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم رضائے مولیٰ کو اپنا مقصد بناتے ہوئے دین خالص پر عمل کرنے کی کوشش کریں اور یہ یقین کریں کہ یہ عہد نہ بے بصارت تقلید کا ہے اور نہ بے بصیرت اجتہاد کا۔خیر الامور اوساطھا۔اللھم اھدنا الصراط المستقیم، صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔ ○○○

مکتوبات

مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی (پورنیہ، بہار)

جہاں تک خیال آتا ہے''الاحسان'' کا کوئی شمارہ مجھے موصول نہیں ہوا ہے۔ عرصہ ہوا کسی صاحب کے پاس اس کا ایک شمارہ دیکھا تھا اور چند منٹ کے لئے لے کر فہرست پر ایک نظر ڈالی تھی، ساتھ ہی کسی صاحب کا مضمون بھی پڑھا تھا، جو ماشاء اللہ بہت خوب تھا۔

فقیر زادہ عزیزی مولانا احمر سلمہ جو ابھی پٹنہ کالج سے ایم، اے کر رہے ہیں، گھر آئے تو کسی عزیز احمد خان بی اے، ایل ایل بی، ڈی جے، ڈی پی اے، ایڈوکیٹ، حیدرآباد کی تالیف'' اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریۂ علم وسائنس'' ساتھ لے آئے۔ کتاب کا عنوان دیکھ کر روزوں کے علاوہ بیماری کی شدید تکلیف کے باوجود مطالعہ شروع کیا۔ اسی دوران مضمون کے تعلق سے آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، اس لیے اسی مطالعے کے ایک تاثر کو مضمون کی شکل دے کر ارسال کر رہا ہوں۔ آپ چاہیں تو عنوان بدل دیں اور وصولیابی سے مطلع فرمائیں۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہوں۔

پروفیسر یسین مظہر صدیقی (ڈائریکٹر: شاہ ولی اللہ ریسرچ سیل، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ)

امید ہے کہ آپ سب بہمہ وجوہ بخیر ہوں گے، میں بفضلہ بعافیت ہوں اور بہت مصروف۔ اگلے شمارہ الاحسان کے لیے، آپ کی فرمائش کے مطابق مقالہ ارسال خدمت ہے۔ پسند آئے تو چھاپ دیں۔

دوسرا مقالہ امام شعرانی پر لکھنے کی کوشش ضرور کروں گا، وعدہ نہیں کر سکتا کہ بہت کام ہے، اسی طرح سردست سابق تازہ شمارہ پر اپنے خیالات بھی نہیں لکھ پا رہا ہوں جیسے ہی موقعہ ملے گا لکھ دوں گا، ایک سفر لکھنؤ سے واپسی پر بیماری نے بھی آدبوچا ہے۔ ذہن حاضر نہیں رہتا۔ دعا کریں۔

مولانا شاہ ہلال احمد قادری (خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار)

مضمون حوالۂ ڈاک ہو رہا ہے۔ چند صفحات کی کمپوزنگ نہیں ہو سکی۔ امید ہے کہ آپ اس کو پڑھ لیں گے عنوان یہ ہوگا: ''تصوف وصوفیہ پر اعتراض کا علمی جائزہ''

اس عنوان کے تحت ادارے کی طرف سے ایک نوٹ ہونا چاہئے کہ یہ مضمون کس پس منظر میں لکھا گیا ہے، اس کے بعد'' استدراک'' ہو، نوٹ میں یہ وضاحت بھی ہونی چاہئے کہ استدراک کو ناکافی سمجھ کر مضمون نگار نے تفصیلی جواب لکھا ہے۔ میرے ذہن میں یہی ترتیب ہے ویسے آپ لوگ جیسا مناسب سمجھیں، مضمون آپکے حوالے ہے، سپردم بتو مایۂ خویش را۔ اشاعت سے قبل حضرت سجادہ صاحب ملاحظہ فرمالیں کیوں کہ مضامین اس میں تصوف سے متعلق ہیں، اصلاح ودرستگی کی ضرورت محسوس ہو تو ان کو اختیار ہے، عجلت میں بعض آیات کا حوالہ اور ترجمہ رہ گیا ہے اس کمی کو پورا کیا جائے جو آیات یا آیات کے جملے درمیان میں آگئے ہیں ان کا ترجمہ ضروری

نہیں ہے، بطور استدلال جو آیتیں پیش کی گئی ہیں انہی کا ترجمہ ہونا چاہئے۔ مضمون مل جائے تو مطلع کریں۔ مجھ سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہو تو ۲۴؍دسمبر تک رابطہ ممکن ہے، پھر اپنے وطن تک واپسی ۲۰؍جنوری کو ہوگی، ان شاء اللہ۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں سلام وتحیات۔

پروفیسر محمد صلاح الدین عمری (پروفیسر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ حسب حکم ایک متواضع اور معمولی سی کوشش، جو میری زیر ترتیب کتاب کا حصہ ہے، روانہ خدمت ہے۔ گر قبول افتدز ہے عزّ و شرف۔

اس پُر آشوب دور میں 'الاحسان' کی شکل میں آپ نے ایک عظیم خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے جس کی زمانہ کو شدید ضرورت تھی۔ آپ حضرات کی قابل قدر کوششوں کو اللہ تبارک وتعالی قبول فرمائے۔ (آمین)

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی (شعبۂ عربی مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)

الحمدللہ! مجلہ الاحسان کا نقش ثالث پیش نظر ہے جو ہر دو معنوی اور صوری طور پر نقش ثانی سے بہتر اور .....ع

نقاش نقش ثالث بہتر کشد ز ثانی

کا مصداق ہے اور اس علمی، تحقیقی و دعوتی مجلّے کے مرتبین ومعاونین کی غیر معمولی جد و جہد اور مسلسل جاں فشانی اور عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ یہ ٹیم پتھروں سے چشمے جاری کرنے کا اور بے آب وگیاہ سرزمین کو گل زار بنانے کا کام کر رہی ہے، مولیٰ تعالیٰ ان حضرات کے جذبوں کو فزوں تر فرمائے اور ''الی التصوف من جدید'' کی اس مہم کو ساحل مراد سے ہم کنار فرمائے۔ اس علمی و عملی کارواں کے محرک اور راہبر داعی اسلام شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی لائق صد تبریک ہیں جن کی روحانی قیادت میں یہ کارواں تصوف رواں دواں ہے۔ متع اللہ الامة بطول بقائه وافاض علی الجمیع من سحائب فضله وعطائه۔

بادہ وساغر اسم با مسمی ہے۔ اس کا کوئی بھی قاری کیف ومستی سے سرشار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آج کی اردو غزل میں گہرائی وگیرائی کے فقدان کا شکوہ اور کمی کا نوحہ کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کا سبب جاننے کی کوشش کرنے والے بہت کم ہیں۔ ہمارے جامعات وکلیات میں علاج تو کیا مرض کی تشخیص کرنے والے بھی خال خال رہ گئے ہیں۔ اردو شاعری کی روح غزل تھی اور آج یہ روح خود ''بے روح'' ہوگئی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بھی کہیں کہیں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اردو زبان کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے اور اس کا حقیقی سبب مکتب ومعاشرے سے تصوف کا غیاب اور صوفی فکر وعمل کا فقدان ہے۔ اردو غزل کی ساری تہ داری اور معنی آفرینی تصوف کے افکار و

مضامین کی دین تھی، جو ''بادہ وساغر'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، یہاں تک کہ اردو شاعری، بالخصوص اردو غزل میں ''مسائل تصوف'' کے بغیر غیر صوفی کا بھی کام نہیں چلتا تھا۔ تصوف محبت کا نقیب اور امن وسلامتی کا داعی ہے۔ صوفی کا قلب خلق خدا کی محبت سے لبریز ہوتا ہے اور ایسے قلب سے جو بھی صادر ہوتا ہے وہ خیر ہی ہوتا ہے اور ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

ابتدائیہ میں مقالات کا خوب صورت اور متوازن تعارف کرایا گیا ہے۔ ابتدائیہ کا یہ جملہ ''الاحسان تصوف اور اہل تصوف کا علمی اور دعوتی ترجمان ہے'' بے حد معنی خیز ہے۔ بلا تحقیق اسے کوئی فری لانس پلیٹ فارم نہ سمجھا جائے۔ امید ہے کہ مرتبین مجلہ کا ہمیشہ یہی شعار ودثار رہے گا۔ اس مجلّے کو دعوت تصوف کا ایک ایسا منبر ہونا چاہیے جس کا وسیلہ صرف حکمت وموعظت ہو، مناظرہ بازی سے اسے حتی الامکان بچایا جانا چاہیے بلکہ مناظرانہ زبان اور جذباتی اسلوب بیان، ترکیبات، تشبیہات اور استعارات سے بھی اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے، اور جدل ومناظرہ سے پرہیز کی یہ دعوت بھی غیر مناظرانہ ہونا چاہیے۔

لفظ واردات کو سن کر تصور عموماً قلب کی طرف متوجہ ہوتا ہے، لیکن اس بار کا کالم ''واردات'' اقرب الی العقل منه الی القلب کا شاہکار ہے، جس میں واردات بلکہ مستوردات عقل ودماغ کو بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ واردات کے ابتدائی فقروں کی معروضیت (بصحت تعبیر) اور فکری واسلوبی غیر جانب داری اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ بظاہر یہ فقرات، جو اصالۃً اداریے ہی کا حصہ ہیں اور ان کی حیثیت مجلّے کے رسمی بیان کی سی ہے، وہ ابتدائیہ کے اس جملے سے ناآہنگ بلکہ متصادم لگتے ہیں کہ ''الاحسان تصوف اور اہل تصوف کا علمی، فکری اور دعوتی ترجمان ہے''

واردات کے ایک فقرے میں تصوف کے رد وقبول کو لے کر لوگوں کے مختلف درجات بتائے گئے ہیں اور پھر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ''ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص کو تصوف کا حامی یا مخالف کہنا ایک مبہم بات ہے'' اس جملے کے لسانی اور تعبیری اشکالات سے قطع نظر مذکورہ مقدمات سے ہرگز یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے اور نہ ہی یہ واقع کے مطابق ہے۔ ایسے افتراضی درجات ہر اسلامی علم وفن کے بارے میں ذکر کیے جاسکتے ہیں بلکہ خود اسلام کو لے کر لوگوں کے مختلف درجے گنائے جاسکتے ہیں، بلکہ جو خطرناک نتیجہ۔ خاکم بدہن۔ ان سے برآمد ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ خود تصوف ہی ایک مبہم شئے ہے۔ جن کے نزدیک تصوف بطور علم وعمل واضح اور معین ہے ان کے نزدیک تصوف کے حامیین اور مخالفین میں یا انھیں سمجھنے میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ رہبانیت کو تصوف قرار دینا یا تصوف کی شکل قرار دینا یا ایسا کرنے والے ناسمجھوں کا اثبات یا اقرار کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ اور جن دکانوں کا حوالہ دیا گیا ہے وہ بھی عبث اور غیر ضروری ہے۔ کم از کم

ان دونوں فرضی درجات کے بطلان پر کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ یہ سب کے سب غیر تصوف کے درجات ہیں۔

یہاں میں بے حد تواضع کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وسعت فکری، موضوعیت اور حقیقت پسندی وغیرہ علمی تحقیق کے مطلوبہ اوصاف ہیں لیکن ان امور کے اظہار میں اس قدر آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ تحقیق تشکیک کے مرحلے میں داخل ہو جائے یا ہدایت و گمراہی کے درمیان تمیز اٹھ جائے۔

واردات کا اگلا فقرہ غالباً تبصرہ پر تبصرہ ہے۔ اس پر سوائے ایک وضاحت کچھ نہیں کہنا ہے اور جو کچھ کہا جا چکا ہے وہ گزشتہ اور پیوستہ سب کے لئے کافی وشافی ہے۔ البتہ بطور وضاحت صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ مقالہ ''شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف: ایک مطالعہ'' پر جو کچھ عرض کیا گیا، اس کا بنیادی محرک مقالے کا وہ جملہ تھا جس میں شیخ ابن تیمیہ کو مخالف تصوف سمجھنے کو غیر واقعی اور ''مخدوش فکر'' قرار دیا گیا ہے۔ اس جملے کی ضرب کی عمومیت اور دوررسی کو شاید ابھی تک نہیں سمجھا گیا ہے۔ یہ الزام کی نہیں اقرار کی صورت ہے جو کم از کم اہل تصوف کو کسی درجے میں قابل قبول نہیں ہے۔ مذکورہ مقالے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ سب کچھ ہندوستان میں ایک طبقہ عرصے سے دہرا رہا ہے چنانچہ رجال الفکر والدعوۃ، تصوف کیا ہے، اور تصوف شیخین (شیخ ابن تیمیہ اور شیخ ابن قیم) وغیرہ متعدد کتابوں اور مقالوں میں اس کی تکرار کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اور اس قسم کی تحریریں ہی تبصرے کا اصل ہدف تھیں۔ میں پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ تصوف کے بعض فروعی یا مشترک مسائل سے اتفاق، تصوف سے کلی یا جزئی اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا ہے، نہ ہی کسی کا تصوف کے کسی فروعی مسئلے سے اختلاف تصوف سے جزئی اختلاف ٹھہرایا جا سکتا ہے۔

شیخ ابن تیمیہ نے تصوف کے ان عناصر کا ذکر خیر کیا ہے جنھیں وہ اسلامی سمجھتے ہیں ان کے ماننے والوں کی تعبیر میں ''انھوں نے تصوف میں اسلام کا اثبات کیا ہے اسلام میں تصوف کا اثبات نہیں کیا ہے۔'' علم کلام سے شیخ ابن تیمیہ کی مخالفت جگ ظاہر ہے لیکن بایں ہمہ اس علم کے متعدد اصول و فروع کا انھوں نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔ کیا اس کی بنیاد پر کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ علم کلام کے جزئی حامی ہیں یا کلی مخالف نہیں ہیں، یہ مسئلہ مقلدین کی تحدیث اور غیر مقلد حضرات کے تفقہ کی طرح ہے۔

واردات کے اگلے فقرے میں مشہور اخوانی عالم شیخ یوسف قرضاوی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''ندعو الی تصویف السلفیة وتسلیف الصوفیة'' جس کا ماحصل یہ ہے کہ سلفی حضرات تصوف کو قبول کرلیں اور اہل تصوف سلفی فکر کو اپنا لیں۔ صاحب واردات نے اپنی نیک

نیتی اور حسن ظن کی بنیاد پر اس جملے کی جو تاویل کی ہے وہ حسن تاویل کا بہترین نمونہ ہے اور صحت تاویل کی شرط پر اس سے کوئی اختلاف نہیں کیا جا سکتا، البتہ ان کا یہ اطلاق کہ صوفیہ ''روایات اور نصوص کے بجائے ملفوظات پر ارتکاز کیے ہوئے ہیں جب کہ سلفی حضرات ظواہر نصوص کو تھامے ہوئے ہیں'' درست نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ برصغیر کے مقامی منظر نامے کے زیر اثر ہو، ورنہ محدث شام شیخ عبداللہ ہرری، محدث مغرب شیخ احمد صدیق غماری اور محدث حرمین شیخ محمد علوی مالکی وغیرہ ماضی قریب کے ایسے صوفیہ تھے جن کی قرآن فہمی اور حدیث دانی کا ایک عالم معترف ہے۔ ان میں سے ثانی الذکر کے علم اسناد و روایت کا اعتراف شیخ ناصر الدین البانی کو بھی تھا۔ معاصرین میں بھی ہزاروں ہزار ایسے صوفیہ ہیں جن کی روایات و نصوص پر گہری نظر ہے۔ شیخ علی جمعہ، شیخ احمد طیب، شیخ حبیب جفری، شیخ جمیل حلیم حسینی سے ہم سب واقف ہیں، یہ سب اساطین کتاب وسنت ہیں۔ دوسری طرف سلفی حضرات میں بھی اپنے شیوخ بالخصوص شیخ ابن تیمیہ کے اقوال و فرمودات پر آنکھ بند کر کے اعتماد کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ شیخ البانی کی تخریجات اور تعدیلات و تجریحات پر یہ حضرت ایسا انحصار کرتے ہیں کہ اہل تصوف بھی ششدر رہ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شیخ قرضاوی کی یہ دعوت بے حد گمراہ کن اور پر فریب ہے جو اخوانی فکر اور جماعت الاخوان المسلمون کے سیاسی ایجنڈے کے عین مطابق ہے۔ دین میں فیصلے تجارت و سیاست کی طرح لین دین کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ حق و باطل کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ غزالی و رازی و عسقلانی و ہیثمی و سیوطی و مناوی و متقی اور حقی وغیرہ بے شمار علمائے کتاب وسنت صوفی تھے۔ لہٰذا سلفیت کے ساتھ علوم کتاب وسنت کی تخصیص کرنا مناسب نہیں ہے۔ البتہ اس امر سے کسی کو بھی مجال انکار نہیں ہو سکتا کہ فی زمانہ بنام تصوف بہت ساری شخصیات اور مراکز، علم کے فقدان اور عمل کے نقصان کا شکار ہیں اور یہ صورت حال بدلنی چاہیے، لیکن اس کے لیے حقیقی صوفی بننا کافی ہے سلفیت کی قلم لگانے یا سلفی بننے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

واردات کا ایک عجیب و غریب دعویٰ یہ بھی ہے کہ صوفیۂ کرام نے ارکان دین کی ترتیب پلٹ دی اور احسان و تصوف جو کہ ایمان و اسلام کے بعد ہے اسے پہلے کر دیا۔ یہ دعویٰ خلاف واقعہ بھی ہے اور خلاف منطق بھی۔ صاحب واردات لکھتے ہیں کہ صوفیہ نے ایمان و اسلام کی دعوت دینے کے بجائے ''لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا کیا اور نیتوں میں اخلاص کے جوت جگائے'' بھلا کوئی بتائے کہ اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان کے بغیر اس کا خوف اور اس کے لیے اخلاص کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے؛ کیوں کہ خوف الٰہی معرفت الٰہی کی فرع ہے۔ من عرف اللہ خافہ بالضرورۃ ومن لم یخفہ لم یعرفہ مسلمات تصوف میں سے ہے، اور رہا یہ کہ صوفیہ ''ایمان

واسلام کی تفصیلات اور کلام وفقہ کے دقائق ومغلقات کو پیش کرنے کے بجائے سب سے پہلے نیت کی اصلاح اور دلوں کے تزکیے کی طرف متوجہ ہوئے" تو یہ معنی کے اعتبار سے بلاشبہ درست ہے، لیکن اس میں خدانخواستہ ترتیب الٹنے جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان تفصیلات کے بغیر تزکیہ ممکن ہے لیکن خود ایمان واسلام کے بغیر تزکیے کا امکان تو کجا اس کا تصور تک محال ہے۔

واردات کے آخری فقرے میں تصوف کے اہداف ووسائل اور ان کی معرفت ومراعات کے فوائد کا ذکر بڑے دل نشین انداز میں کیا گیا ہے۔ صاحب واردات کا یہ فرمودہ کہ "ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حقیقت تصوف، فلسفۂ تصوف اور رسوم تصوف کے فرق کو سمجھیں اور اس فرق کے جو تقاضے ہیں انھیں ملحوظ رکھیں" حرز جان اور متاع فکر ونظر بنانے کے قابل ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے دعوت تصوف کا آغاز ہونا چاہیے۔

راقم السطور صاحب واردات کے قلم وبیان کا دیرینہ مداح ومعترف رہا ہے، ان کلمات کے ذریعے ایک بار پھر اپنے اعتراف کی تجدید کر رہا ہوں۔

بادۂ کہنہ میں بے حد خوب صورت اور پر از تاثیر انتخابات کو شریک کیا گیا ہے، البتہ پہلے انتخاب میں عنوان، معنون سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتا۔ کتاب اللمع سے ماخوذ ومترجم اقتباس کے لیے جو عنوان ذکر کیا گیا ہے وہ ہے "صوفیہ کی نظر میں فقہ اور فقہا"، اس کے بجائے اگر اس کا عنوان علم تصوف کی وسعت وہمہ گیری، یا تصوف کی وسعت وعظمت وغیرہ ہوتا تو اقتباس میں مذکور مضامین سے زیادہ قریب ہوتا۔ دوسرا اور تیسرا انتخاب بھی تصوف کی بڑی اہم کتابوں سے ہے اور ان تینوں انتخاب میں قدر مشترک یہ ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ سب ایک ہی فلک میں دائر ہیں اور یہ انتخاب کی بڑی خوبی ہے۔

باب تذکیر "فذکر فان الذکری تنفع المومنین" کا مصداق ہے۔ شیخ ابوسعید احسان اللہ صفوی زید مجدہ وزادت فیوضہ کے افادات بے حد دل پذیر اور پر تاثیر ہیں جنھیں عزیز القدر مجیب الرحمن علیمی نے حسب سابق بے حد عمدگی سے مرتب کیا ہے۔ مولانا عبدالمبین صاحب کثر اللہ امثالہ و وفقنا السیر علی منوالہ نے نفس کی چند بے حد مہلک بیماریوں کو اپنا ہدف بنایا ہے اور بڑے موثر انداز میں ان موذی بیماریوں کے آثار Symptom، ان کے مضرات اور ان کے علاج کی تفصیلات کو رقم کیا ہے۔ اس مضمون کو بار بار پڑھنے سے بھی ان امراض سے شفا پائی جاسکتی ہے۔ "کفر سے ایمان تک" اور "ایک ایمانی سفر" نہ صرف ایمان افروز ہیں بلکہ اس امر کی پختہ دلیل بھی ہیں کہ خانقاہی نظام کی معنویت اس عہد ادبار میں بھی باقی ہے اور بعض خانقاہوں سے دعوت وہدایت کا عمل ہنوز جاری وساری ہے۔

تحقیق وتنقید کے عنوان کے تحت شامل سبھی مضامین عمدہ اور معلومات افزا ہیں۔ مولانا کوثر امام قادری صاحب نے پختہ دلائل کے ساتھ بیعت و اجازت کو ثابت کیا ہے جو لائق ثنا و ستائش ہے۔ اس موضوع پر کتب احادیث میں اور بھی مواد موجود ہے جس میں بیعت کی مشروعیت، اس کی اہمیت، اس کے انواع واقسام اور اس کے نتائج وثمرات کا ذکر ملتا ہے۔ اس موضوع پر شیخ عیسیٰ عبد القادر حلبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حقائق عن التصوف میں ایک مستقل باب باندھا ہے جو لائق استفادہ ہے۔

پروفیسر صابری صاحب نے سید الطائفہ کا ذکر چھیڑا ہے اور ان کا ذکر اہل تصوف کے لیے بقول مہیار دیلمی:

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ
هو المسک ماکررته یتضوع

کا مصداق ہے۔ پروفیسر موصوف نے مقتدائے اہل تصوف کے علم وعمل کو بڑے حسن ترتیب کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ حضرت جنید کی بات چلی تو یہاں اس بات کا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ اس سوال کا جواب بے حد ضروری ہے کہ وہ اصول اور بنیادیں کیا ہیں جن پر اعتماد کرتے ہوئے صوفی اور غیر صوفی میں امتیاز قائم کیا جاسکتا ہے؟ بلفظ دیگر صوفی کے مقومات کیا ہیں؟ کیا زمانے کے اختلاف کے ساتھ جس طرح اہل سنت کی تعریف میں تبدیلی ہوتی رہی تصوف میں بھی ایسا ہے؟ کیا بعض جزئی اتفاق کی بنیاد پر کسی کو صوفی کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے؟ کیا محض علم تصوف کی معرفت یا کثرت عبادت وریاضت یا مابعد الطبیعات کے مسائل پر عبور اور یا محض زہد اور ترک دنیا کی بنیاد پر کسی شخص پر صوفی کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ اگر محض علم تصوف سے واقفیت کسی کو صوفی بناتی تو پروفیسر نکولسن اور لوئی ماسینیوں گزشتہ صدی کے سب سے بڑے صوفی ہوتے اور اگر کسی کو عبادت و ریاضت، شب زندہ داری اور سحر خیزی کی بنیاد پر صوفی قرار دیا جاسکتا ہے تو خوارج سب کے سب صوفی ہوتے اور اگر کوئی مابعد الطبیعاتی مسائل میں مہارت کے سبب صوفی ہوتا تو تمام یا اکثر مسلم و غیر مسلم فلسفی، صوفی ہوتے اور اگر تصوف محض ترک دنیا اور زہد کا نام ہوتا تو تمام عیسائی رہبان اور ہندو جوگی صوفی ہوتے، جب کہ مذکورہ بالا تمام کے تمام کا غیر صوفی ہونا اجماعی اور متفق علیہ مسئلہ ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح اہل سنت کی قدیم تعریفات آج کے زمانے میں اہل سنت کی تعیین اور تشخیص کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں ائمہ نے مختلف قیود کے اضافے کیے ہیں تاکہ یہ فرقہ ناجیہ ہر زمانے کی مقتضیات کے مطابق غیروں سے ممتاز اور مشخص رہے، اسی طرح سواء بسواءٍ ہم تصوف کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ آج کے پس منظر میں اور اسلامی ثقافتی ارتقا کے اس

مرحلے میں صوفی وہ ہے جو:

''جنیدی المشرب ہو، حنفی، مالکی، شافعی یا حنبلی المذہب ہواور اشعری یا ماتریدی العقیدہ ہو۔''

یہی سواد اعظم کی شناخت ہے اور صوفی سواد اعظم ہی کا حصہ ہے، بلکہ اکثر علمائے عرب دونوں میں تساوی کی نسبت مانتے ہیں۔ اگر اس تعریف کو پیش نظر رکھا جائے تو صوفی اور غیر صوفی کی تمیز میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ اس تعریف کے باہر جو بھی ہے وہ عالم بالتصوف ہوسکتا ہے، عابد وزاہد ہوسکتا ہے، فلسفی اور راہب ہوسکتا ہے، مگر صوفی اور اہل تصوف میں سے نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر ساحل شہسرامی صاحب نے اپنے مقالے میں تصوف کی ایک اہم لیکن نسبتاً کم معروف شخصیت کا تفصیلی تعارف کرایا ہے، لیکن مقالہ مصادر ومراجع اور حواشی وہوامش سے معریٰ ہے اور باب تحقیق وتنقید سے مناسبت نہیں رکھتا ورنہ مقالہ نگار بذات خود اعلیٰ پائے کے محقق وناقد ہیں اور مقالہ بھی فی حد ذاتہا مفید اور معلوماتی ہے، مضون میں مالدیپ کے ساتھ ایک لکادیپ کا تذکرکیا گیا ہے جو خدا معلوم کہاں ہے کم از کم موجودہ جغرافیائی نقشوں میں اس کا سراغ لگانا ممکن نہیں ہے۔ ایک قیاس ہے کہ شاید اس سے مراد لکچھدیپ ہو جو کیرالا کے ساحل کے متوازی بحر عرب میں جزائر کا ایک مجموعہ ہے اور ہندوستان کی مرکزی حکومت کے زیر اہتمام ہے۔

ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی معروف محقق مصنف ہیں بڑی خوش آئند بات ہے کہ وہ تصوف کے حوالے سے مستقل لکھ رہے ہیں، جنید بغدادی رضی اللہ عنہ پر ان کی تحقیقی تصنیف نے علمی حلقوں سے کافی خراج حاصل کیا ہے، اس بار انھوں نے صوفی خواتین کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے، ہم ان کے اس آخری جملے کی پرزور تائید کرتے ہیں کہ ''یہ موضوع اپنی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے مستقل تحقیقی کام کا متقاضی ہے''

محمد ساجد رضا مصباحی کا مضمون ''الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ'' علمی ریویو کی ایک شاندار مثال ہے اور انھوں نے بڑے سلیقے کے ساتھ شیخ یوسف قرضاوی صاحب کی اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے، البتہ ان کے تعارف میں مصنف یعنی شیخ قرضاوی کے سب سے نمایاں وصف کا ذکر نہیں کیا گیا کہ وہ اخوان مسلمون کے بڑے قائدین میں سے ایک ہیں اور اخوان کے تعارف میں لکھی جانے والی سب سے اہم کتاب کے مصنف ہیں جس کا نام ہے ''الاخوان المسلمون: سبعون عاما فی الدعوۃ والتربیۃ والجھاد'' اخوانی فکر کی موجودہ تشکیل میں سید قطب کے بعد سب سے نمایاں کردار شیخ یوسف قرضاوی کا ہی ہے۔

مولانا وارث مظہری صاحب کا مقالہ ''امام غزالی اور مسئلہ تکفیر'' ایک فکر انگیز مضمون ہے جسے علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بلاشک وشبہ امام غزالی علیہ الرحمہ کے افکار میں ہمارے بہت سے

مسائل کا حل موجود ہے جن میں سرفہرست تکفیر کی گرم بازاری اور تضلیل و تفسیق کی ارزانی ہے۔ یہ مقالہ علمی تحقیقی معاییر کے مطابق ہے لیکن شروع مقالے میں اشاعرہ کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ احسان کے مختلف شماروں میں کئی بار اشاعرہ کا ذکر بڑی بے اعتنائی اور سہل انگاری کے ساتھ کیا گیا ہے، بلکہ اردو کے کئی رسالوں اور جرائد میں اس ظاہرے کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، جو قابل ردو نکیر ہے۔ ان سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اشاعرہ کا شمار بھی معاذ اللہ گم راہ فرقوں میں ہو۔ دراصل یہ عدوی (بیماری) ہم لوگوں میں اردو کے ان مصنفین اور محققین کی کتابوں سے در آئی ہے جو گذشتہ سو سال سے اردو زبان میں اسلامی موضوعات پر تحقیق و بحث کے اجارہ دار ہیں اور چوں کہ ان میں اکثر سلفی فکر کے زیر اثر اشعریت کو بھی اعتزال اور دوسرے کلامی گم راہ فرقوں کے برابر رکھتے ہیں، لہٰذا ہم میں سے بھی کئی لاشعوری طور پر اس نہج پر سوچنے لگے ہیں۔

بہت ممکن بلکہ یقین ہے کہ اس مقالے میں اشاعرہ کا اس طرح ذکر کیا جانا ان کی تخفیف شان اور تقلیل قدر کے لیے نہیں ہے لیکن اس مسئلے پر تنبیہ اور اس کی وضاحت ضروری ہے۔ عہد غزالی میں اسلامی فرقوں کے درمیان جدل و مناظرہ بازی کی شدت کا ذکر کرتے ہوئے مقالہ نگار فرماتے ہیں کہ ''خصوصیت کے ساتھ معتزلہ اور اشاعرہ نے علم (عالم) اسلام کے قلب کو فکری معرکہ آرائیوں کا میدان کارزار بنا دیا تھا'' اس جملے کا اسلوب، متنبی کا یہ شعر یاد دلا رہا ہے کہ

وما انتفاع اخی الدنیا بناظره
اذا استوت عنده الانوار والظلم

حضرات اشاعرہ و ماتریدیہ رضی اللہ عنہم وارضاہم ہی اہل سنت و جماعت ہیں۔ امام سید مرتضی زبیدی بلگرامی ''اتحاف السادة اليقين بشرح احياء علوم الدين'' میں فرماتے ہیں: ''اذا اطلق اهل السنة والجماعة فالمراد بهم الاشاعرة والماتريدية'' یہی بات ابن حجر ہیثمی اور ابن عساکر نے علی الترتیب الزواجر اور تبیین كذب المفتری میں کہی ہے۔

اس مقالے میں صفحہ ۱۸۱ پر ہے کہ ''اہم بات یہ ہے کہ غزالی اشعری تھے، البتہ ابوالحسن اشعری کے مقلد نہ تھے'' بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی حنفی ہو اور ابو حنیفہ کا مقلد نہ ہو؟ واضح رہے کہ امام ابو حامد صرف اشعری ہی نہیں بلکہ ان ائمہ اشاعرہ میں تھے جنہوں نے اشعریت کی تدعیم و ترسیخ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شیخ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین و موالین کی طرف سے امام غزالی کی تنقید و تخفیف اور سب و شتم کی اکثر وجہ ان کی صوفیت نہیں بلکہ ان کی اشعریت ہوتی ہے۔

بحث و نظر کے کالم میں بحث و نظر دونوں کی قلت ہے۔ کسی نے بھی مطروحہ مضمون کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہیں کیا یعنی تصوف کا احیا اور نشاۃ ثانیہ کیسے ہو، اس کا ذکر نہ ہونے کے برابر

ہے۔ زیادہ تر موجودہ صورت حال کا رونا رویا گیا ہے جب کہ اس کالم کے تمام شرکا اہل نظر اور اعلی درجے کے باحثین اور محققین ہیں۔ مدرسہ اور خانقاہ مل کر پوری دنیا کا ایک دو فیصد نہیں ہوتے، ہم ان سے باہر ہی نہیں نکل پاتے، باقی ۹۸ر فیصد ہمارے فکری اور اصلاحی ایجنڈے کا حصہ ہی نہیں ہیں۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے لفظ احیا پر ہی سوال اٹھادیا جو ایک دل چسپ موضوع ہے۔ غالباً احیا سے مراد نشر واشاعت اور تعمیل و تطبیق ہے، ورنہ بلا شک وشبہ تصوف بمعنی احسان کے لیے احیا کا حقیقی معنی میں استعمال ممکن ہی نہیں ہے۔ اہل تصوف ہی حدیث پاک ''لا تزال طائفة من امتی ظاھرین علی الحق حتی تقوم الساعة'' کا مصداق ہیں۔ اس گروہ کے افکار و اعمال کی نشر واشاعت کی حاجت ہے اور احیائے تصوف کا یہی مجازی معنی یہاں مراد و مقصود ہے۔ اور ''مرغ بادنما'' میں جو لطیف اشارے ہیں ان سے پروفیسر موصوف کا کوئی صحبت یافتہ اور ان کا ہم نشیں ہی حظ اٹھا سکتا ہے۔ ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی نے بھی کچھ مشورے دیے ہیں، وہ بھی لائق توجہ ہیں، دراصل یہ موضوع ایک بڑے سیمنار کا موضوع ہے، ایک دو صفحے میں اس کا حق ادا کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔

شناسائی میں سلسلۂ رشیدیہ کے موجودہ مسند نشیں کا انٹرویو خوب ہے اور مجیب الرحمن علیمی صاحب کے ذریعے کیا جانے والا اس خانقاہ کا تعارف خوب تر ہے۔ البتہ ''ھذہ الحروف الخمسة تنصب المضارع'' میں منشا خلجان سمجھ میں نہیں آیا اور غالباً یہاں خمسہ کے بجائے الستة ہونا چاہیے؛ کیوں کہ اسم کو نصب دینے والے حروف (حروف مشبہ بالفعل) چھ ہیں پانچ نہیں۔ چوں کہ خمسہ حروف کی صفت ہے لہذا وہ موصوف یعنی حروف کے بعد ہی ہوگی، اس لیے کہ صفت موصوف کے تابع ہوتی ہے اور اس کا تتمہ ہوتی ہے اور ابن جنی وغیرہ نحویوں کے یہاں صفت کی تقدیم کو قبیح قرار دیا گیا ہے اور کلام عرب میں جو کچھ اس سلسلے میں وارد ہے اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔ شرح مأۃ عامل میرے پیش نظر نہیں ہے لیکن یہ حروف ستہ مشبہ بالفعل کے ضمن میں ہی ہوگا اور جس قاعدے کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف اس صورت میں متحقق ہوگا جب ایک موصوف کی کئی صفات مجردہ ہو جیسے: ''ھذا العالم العامل العاقل الماھر'' اس مثال میں تمام صفات میں باہم تقدیم و تاخیر جائز ہے؛ کیوں سب ایک درجے کی صفات ہیں اور ھذہ الحروف الخمسة/ الستة میں خمسہ ھذہ کی راست صفت نہیں ہے بلکہ حروف کی صفت ہے، پھر موصوف صفت مل کر اسم اشارہ کی صفت بنتے ہیں، لہذا خمسہ کی تقدیم حروف پر جائز نہیں ہے۔ اور عربی زبان میں کوئی تا تذکیر کے لیے نہیں ہوتی۔ دونوں مسئلے بالکل واضح ہیں

صوفی ادب کے تینوں مقالے خوب ہیں، گرامی قدر پروفیسر عبد الحمید اکبر صاحب مملکت اردو میں تصوف کے سفیر کی مانند ہیں۔ الاحسان میں اردو ادب اور تصوف کے حوالے سے ان کے

طویل مقالے شائع ہونے چاہیے۔ ''امیر خسرو کی عربی نثر نگاری'' ضیاء الرحمن علیمی صاحب کی اچھ
کوشش ہے۔ خسرو کی عربی شاعری پر بھی کام ہونا چاہیے۔ اس کالم میں شامل تیسرا مضمون جومو
ارشاد عالم نعمانی کے رشحات قلم کا شاہ کار ہے، ایک عمدہ کاوش ہے۔

کالم زاویہ کو اس عدد کی جان قرار دیا جا سکتا ہے اور اس میں شامل تمام مقالے سرمۂ ا
نظر بننے کے قابل ہیں۔ اس میں مقالہ نگار حضرات نے حضرت شیخ احمد سرہندی کی حیات وخدما
پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے شیخ مجدد کے افکار اور آج کے دور میں ان
معنویت پر ایک اچھا مضمون قلم بند کیا ہے۔ جناب رفعت رضا نوری نے بھی ایک گراں قدر کوش
کی ہے، البتہ حاشیہ نمبر آٹھ میں بطور حوالہ اخبار الاخیار کا ذکر کیا گیا ہے، اخبار الاخیار میں شیخ مجد
ترجمہ موضوع اور الحاقی ہے، اصل فارسی کتاب میں موجود نہیں ہے۔ حضرت شیخ محقق دہلوی
حضرت مجدد کا ذکر اپنے اس تذکرے میں نہیں کیا ہے، کسی نے پوری کتاب کے خاتمے کے بعد
کا اضافہ کر دیا ہے۔ مشہور مؤرخ ومحقق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب ''حیات شیخ ع
الحق'' میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی کا مقالہ شیخ مجدد کے تجدیدی ک
ناموں کا خوبصورتی سے احاطہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر قمر الھدیٰ فریدی صاحب نے مکتوبات میں تصو
کے رموز ونکات کے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے اور موضوع کا حق ادا کیا ہے۔ پروفیسر یٰسین مظ
صدیقی صاحب کا مقالہ جس میں شیخ مجدد اور شاہ ولی اللہ کے افکار کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے،
نہ صرف حاصل زاویہ ہے بلکہ بادہ وساغر اور بادۂ کہنہ کو چھوڑ کر حاصل عدد ہے۔ یہ تحریر ایک بے
طویل وعمیق مطالعے کا حاصل ہے جس کے ذریعے تصوف کے حوالے سے ہندوستان کی دو عبقر
شخصیات کے افکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مقالہ بار بار پڑھے جانے کا سزاوار ہے۔ اس کا
کا آخری مقالہ بھی کارآمد اور معلوماتی ہے جسے مولانا ابرار مصباحی نے سپرد قرطاس کیا ہے۔

پیمانہ اور مکتوبات کا کالم بھی عمدہ ہے (خاکسار کے مکتوب کے استثنا کے ساتھ) پیمانہ ک
بارے میں پھر عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ کسی کو خوش کرنے یا مجلہ کی T.R.P. بڑھانے کے لیے نہ ہ
بلکہ قرار واقعی ریویو کی طرح ہو، جس میں موضوع، مادہ اور پیش کش سبھی کو پیش نظر رکھا جائے۔

کچھ ایسے غیر مستقل ابواب یا کالم بھی بنائے جائیں کہ اگر ان سے متعلق مقالے دستیاب
ہوں تو انھیں شامل مجلہ کیا جائے ورنہ نہیں، تاکہ وصفی مطالعے، نثری منقبتیں اور تبصرے وغیرہ
تحقیق وتنقید جیسے ابواب میں شامل کرنا مرتبین کی مجبوری نہ ہو۔ ان اردت الا الاصلاح
استطعت، واللہ تعالیٰ نسال ان یحسن الیکم ووفقکم وسدد خطاکم وجعل منکم روادا فی
خدمۃ التصوف والدعوۃ الیہ فی مطلع ھذا القرن الجدید۔

ڈاکٹر نورالدین محمد رضانوری (خانقاہ عالیہ نوریہ جلالیہ، کبیر پور، بھاگلپور، بہار)

الاحسان کتابی سلسلہ کا تیسرا شمارہ، اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے ہے دیکھا پڑھا، دل وزبان نے اس کی خوبیوں کا برملا اعتراف کیا۔ اپنے وقت کا نمائندہ جریدہ ہے جو بجاطور پر ہشت پہلو ہے۔ یہ بجاطور پر فارسی وعربی میں موجود سرمائے کو اردو قالب میں ڈھال کر اردو ادب میں لانے کی پیہم سعی بلیغ کا نمونہ ہے۔ اس سلسلے کی خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ مختلف النوع مضامین اس میں شامل ہیں۔ جملے ایسے بستہ، شستہ، شائستہ کہ آمد کی کیفیت کی ترجمانی کرتے ہیں جس موضوع پر بھی بحث کی گئی ہے کافی وشافی انداز میں بحث کی گئی ہے۔ مضامین خاصے معلوماتی ہیں جو اس دور ترقی کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں اور قارئین کے فہم وادراک کی تسکین اور ذوق علمی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اس ادبی ودینی کتابی سلسلے کو قبولیت عام کے شرف سے مشرف فرمائے اور قائم ودائم رکھے اور اس کے تمام شرکا کو اجر عظیم فی الدنیا والآخرۃ سے مالامال فرمائے، اس رائی کے دانے سے پربت کا کام لینے کی توفیق رفیق عطا فرمائے کہ کام تو دو چند حضرات انجام دیتے ہیں مگر ایک بڑے معاشرے کی اصلاح وفلاح کا ہوتا ہے اور جس سے بڑے پیمانے پر انسانیت کی اصلاح ہو جاتی ہے۔

احمد جاوید (ایڈیٹر: انقلاب، میرابائی مارگ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱)

خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں کے علمی تحقیقی و دعوتی مجلہ 'الاحسان' کا تیسرا شمارہ پیش نظر ہے۔ آپ کی محبتوں کا کس منھ سے شکریہ ادا کروں، الفاظ کہاں سے لاؤں کہ اس نوازش کے شایان شان ہوں جو خانقاہ عارفیہ نے اس کتابی سلسلہ کی صورت میں تشنہ لبوں پر کی ہے۔ جسموں کو جھلساتی اور روحوں کو پارہ پارہ کرتی گرمی کے اس موسم میں جب نفرتوں کے جھکڑ چل رہے ہیں، کوئی ایک جام کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا، یہ تو تین تین جام مسلسل ہیں اور بجائے خود دور مسلسل کا پیام۔ اس قدر وقیع، معلومات افزا، فکر انگیز، دستاویزی اور ہمہ خانہ روشن ومجلی کہ ہر گوشہ دامن قلب ونظر کو کھینچ لے اور ہر ورق پکارے یہاں سے پہلے یہاں سے پہلے، وہ بھی اس زمانے میں جب مطبوعات ومسموعات کی بھیڑ میں کوئی قابل مطالعہ چیز بہ مشکل ہی دستیاب ہوتی ہے، کون کافر ہوگا جو خود کو روک سکے۔ دل کے ہاتھوں مجبور قلم کا یہ مزدور اس بار بھی روز اول سے ہی کوشاں ہے کہ ایک مکتوب ہی سے سہی عجوزۂ مصر کی طرح یوسف کے خریداروں میں شامل ہو جائے لیکن لکھتا ہوں پھاڑ دیتا ہوں، کئی مہینے اسی کیفیت میں گزر گئے، یقین جانیے نطق ونوا بانجھ اور الفاظ گونگے ہو جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر دن کئی ہزار الفاظ سیاہ کرتا ہوں، قلم کی کاشت اپنا وظیفۂ حیات جو ٹھہرا لیکن ہر چند کہ تہی دست نہیں ہوں، تنگ دست پاتا ہوں، وقت ہے نہ دماغ۔ گزشتہ

شمارے میں کئی مقام پر نظریں ٹھہر ٹھہر گئیں۔ بالخصوص پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کا مضمون پڑھتے ہوئے بار بار قلم بے چین ہوا۔ یاد آتا ہے کہ مولانا یٰسین اختر مصباحی کے مضمون میں بھی بعض محرکات موجود تھے لیکن دل چاہتے ہوئے بھی حوصلہ نہ کر سکا۔ سرسری گفتگو سے بات بنتی نظر نہ آئی۔ زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر علیم اشرف جائسی کا مکتوب پڑھ کر اطمینان ہوا اور احساس ہوا کہ ہر کاری را مردی، جو جس کا منصب ہے اسی کو زیب دیتا ہے۔ اچھا ہوتا کہ دس صفحات کے اس تفصیلی مکتوب کو مقالہ کی طرح نمایاں عنوان کے ساتھ شایع کرتے۔ اس مکتوب کے وہ حصے بے حد باوزن ہیں جن میں پروفیسر موصوف کی تسامحات و تضادات کی نشاندہی یا علامہ ابن تیمیہ کے تعلق سے وضاحت کی گئی ہے۔ محققین کا ایک طبقہ آج کل ابن تیمیہ کو ٹھوس شواہد سے تصوف کا حامی ثابت کرنے میں لگا ہے جبکہ مخالفین تصوف صدیوں سے ان ہی کے افکار و نظریات سے روشنی پا کر تصوف کا رد کرتے آئے ہیں۔ مولانا جائسی نے اس تضاد کو جس خوبصورتی سے دور کیا وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ یہ کام ان جیسا وسیع المطالعہ عالم و محقق ہی کر سکتا تھا۔ ویسے عزیز گرامی ضیاء الرحمن علیمی نے پہلے علامہ ابن جوزی، پھر ابن تیمیہ اور اب زیر نظر شمارہ میں ابن قیم کے تعلق سے گرانقدر تحقیق پیش کی ہے۔ یہ ہمارے ان ہونہار علماء و محققین میں ہیں جن کی جدید و قدیم علوم اور اصول تحقیق پر یکساں نظر ہے اور ان سے مستقبل کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

تصوف پر جب بھی اور جہاں بھی گفتگو ہوتی ہے محسوس ہوتا ہے کہ اس تاریخی صداقت کی ایک کڑی ٹوٹ رہی ہے یا شاید جان بوجھ کر نظر انداز کی جا رہی ہے اور تاریخ کے اس ادنیٰ طالب علم کو یہ بات بے چین کر دیتی ہے، احساس ہوتا ہے کہ ٹھوس تاریخی شواہد اور زمانی و مکانی تسلسل کے ساتھ بتانے کی ضرورت ہے کہ آج جن معنوں میں تصوف یا بیعت و ارادت معروف ہے (میری مراد پیری مریدی کے اس کاروبار سے ہرگز نہیں جس کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں) اس کی دو سطحیں ہیں۔ ایک شیخ و مرید یا معلم و مربی اور طالب کا رشتہ جو دوسرے علوم (حدیث، تفسیر، فقہ، اصول، منطق، فلسفہ وغیرہ) کی طرح علم سلوک و طریقت یا علم اخلاق و تزکیہ میں بھی روز اول ہی قائم ہو چکا تھا۔ دوسری سطح بیعت و امارت ہے جس کے بغیر اسلام قائم ہی نہیں ہوتا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس دونوں حیثیتوں میں کامل و جامع تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت کے مربی و معلم بھی ہیں اور امام و اولوالامر بھی۔ ابتداءً آپ کے خلفاء راشدین بھی دونوں ذمہ داریاں ادا کرتے تھے لیکن جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور وہ اکناف و امصار عالم میں پھیلتے گئے یہ ممکن نہ رہا کہ ایک ہی شخص امارت و حکومت کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے اور تعلیم و تربیت بھی کرے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی موجودگی میں مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے نائبین مقرر

فرما کر یہ سنت کریمہ قائم فرمادی تھی۔اس طرح بیعت و امارت سے الگ درس حدیث وقرآن کے حلقے اور ارشاد وارادت کے سلاسل قائم ہوئے۔ پھر اس بحرانی دور میں جب امارت راشدہ کے زوال کے بعد کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ امت مسلمہ کیا کرے، کس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنے اسلام کی حفاظت کرے اور کس کو اپنا امیر بنائے تو علمائے حق و مرشدین کاملین کے ہاتھوں پر بیعت کر کے بندگان خدا نے ارادت وارشاد اور بیعت و امارت کو جمع کر دیا۔ سلاطین فاسق و فاجر کی بیعت کی بجائے صوفیۂ کاملین کی بیعت کا یہ طریقہ اس قدر مقبول ہوا کہ سلاطین وقت بھی ان کی بیعت کرنے اور ان کے آستانوں پر سر جھکانے لگے۔ ویسے تو اس عمل کو اس دور میں بھی بعض حلقوں کی جانب سے مطعون کیا گیا، بعض حکمرانوں نے صوفیہ کو ستایا، ان کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ محسوس کیا لیکن بغور دیکھیں تو علمائے ربانیین وصوفیۂ کاملین نے اس طریقہ سے امت کو ایک بہت بڑے بحران سے بچالیا، متبادل نظام مہیا کرانے کا فریضہ انجام دیا۔ اس نکتے کو سامنے رکھیں تو بہت سی غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں۔ اکثر حامیان تصوف بھی اس نکتہ کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ان بوریہ نشینوں نے اپنے اپنے حلقوں میں مسجد نبوی ﷺ کا نمونہ پیش کیا۔ ارادت وارشاد اور بیعت و امارت کو جمع کر کے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی، ایک ایسا انقلاب برپا کیا جس سے مشرق ومغرب میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ماورائے حکومت واقتدار دلوں پر حکمرانی کا وہ نمونہ سامنے آیا جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ انسانی قاصر ہے۔ اللہ نے توفیق بخشی تو کسی فرصت میں اس پر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ فی الحال آپ کے تقاضہ کی تکمیل میں 'مغرب میں تصوف کے بڑھتے رجحانات اور اس کے مثبت ومنفی پہلو' کے موضوع پر یہ چند سطور سپرد قرطاس کر رہا ہوں، پسند آئے اور قابل اشاعت ہو تو شامل کرلیں ورنہ بلادریغ ضائع کر دیں۔

'الاحسان' نے علماء و محققین کو چونکایا ہے۔ اسی مختصر مدت میں بہت سی دوریاں اور غلط فہمیاں دور کی ہیں۔ ڈاکٹر جائسی نے بالکل سچ اور حق بات کہی ہے کہ 'شاید کاتب تقدیر نے ہندوستان جنت نشان میں تصوف کے عہد نو کے لیے تمہید اور راہ کی ہمواری کا اعزاز خانقاہ عارفیہ کے لیے مختص کر دیا ہے'۔ اس گرانقدر خدمت کو اسی معیار کے ساتھ جاری رکھیں، ممکن ہو تو وقفۂ اشاعت کو گھٹا کر شش ماہی یا سہ ماہی تک لے آئیں۔ آپ حضرات سے دین وملت کی بے شمار امیدیں وابستہ ہیں۔ مجلہ کے ایک ایک ورق سے آپ کا حسن ذوق وسلیقہ جھلکتا ہے، اللہ نظر بد سے بچائے اور اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ حضرت داعی اسلام قبلہ مدظلہ العالی کی خدمت میں سلام مسنون عرض فرمادیں۔ جملہ احباب و پرسان حال سے بھی سلام ودعا کہیں۔ والسلام

شمیم طارق (سینیر صحافی، ممبئی)

''الاحسان'' کے لیے ایک مضمون ''تصوف اور بھکتی'' ارسال خدمت ہے۔ اس میں دونوں کا تقابلی اور تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ مضمون میری کتاب میں شامل ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو کتاب کے کچھ مزید ابواب مثلاً سریت اور نئے فرقوں کا ظہور بھجوا سکتا ہوں۔ کتاب آپ کو ارسال کی جا چکی ہے۔ ای میل سے مضمون بھجوانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ ٹائپ کرنے کی زحمت سے محفوظ رہیں۔ ناقابل اشاعت سمجھیں تو نہ شائع کریں، کوئی ملال نہیں ہوگا۔

مولانا محمد ولی اللہ قادری (جامعہ مخدومیہ تیغیہ، معین العلوم سمستی پور، بہار)

تصوف پر مبنی خانقاہ عارفیہ الہ آباد کا علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ ''الاحسان'' کا تیسرا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ ۴۰۸ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ مجموعی اعتبار سے بھرپور ہے۔ پہلی نظر کے بعد ہی یہ تاثر سامنے آجاتا ہے کہ یہ شمارہ خانقاہوں، مدرسوں اور عصری درس گاہوں کے بالغ نظر افراد کا علمی و فکری گل دستہ ہے۔ مشمولات کی ترتیب میں ایک خاص انوکھا پن اور علمیت جھلک رہی ہے۔ کتاب کا آغاز شعری تخلیقات سے کر کے شاید ایک تاریخی ثبوت پیش کیا گیا ہے کہ اردو کا ابتدائی سرمایہ شعری شکل میں ہی موجود ہے۔ بہر کیف حضرت آسی غازی پوری قدس سرہ اور اصغر گونڈوی کے غزلیہ اشعار ہمیں خاص طور سے متاثر کرتے ہیں۔ ابتدائیہ اور واردات بھی بہت خوب ہیں۔

واردات میں مولانا ذیشان احمد مصباحی نے تصوف کے سلسلے میں اپنی جس فکر کو منطقانہ طرز پر سپرد قرطاس کیا ہے، اس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے، یہ تحریر کچھ الگ انداز سے مطالعے کی دعوت دے رہی ہے، ''بادۂ کہنہ'' کی جملہ تحریریں الباقیات الصالحات کا درجہ رکھتی ہیں۔ شیخ ابونصر سراج، شیخ علی بن عثمان ہجویری اور شیخ احمد سرہندی کی تحریروں کا انتخاب بہت عمدہ انتخاب ہے، البتہ یہاں مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کی تحریر بھی شامل ہوتی تو نور علیٰ نور ہوتا، کیوں کہ مذکورہ بالا تحریروں کے مطالعے کے بعد مخدوم جہاں کے مکتوبات، ملفوظات اور تصنیفات ذہن میں گردش کرنے لگتی ہیں۔ مجدد الف ثانی کی تحریر ''علمائے دنیا اور علمائے آخرت'' کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ مجدد الف ثانی کی اس تحریر پر مخدوم جہاں کے مکتوبات کے خاص اثرات پڑے ہیں۔

''تذکیر'' میں شامل شیخ ابوسعید صفوی اور مولانا عبدالمبین نعمانی کی تحریریں اصلاحی ہیں بایں وجہ اس کی اہمیت وافادیت ہر دور میں یکساں ہوگی اور ہے بھی۔ محمد ساحل سعیدی (سروبجیت سنگھ) اور رابعہ (رجنی) کی تحریر میں عصر حاضر کے لیے خاص پیغام ہے اور تحریر کی دل پذیری اپنا جواب نہیں رکھتی۔

''تنقید و تحقیق'' کے تحت آٹھ مقالات شامل ہیں اور سب کے سب موضوع کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ خاکسار کی معلومات کی حد تک اس میں شامل بعض مقالات اپنے موضوع میں اولیات کا درجہ رکھتے ہیں۔ ''حضرت جنید بغدادی کے علمی تبحر اور روحانی مشاغل'' پر، پروفیسر بدیع الدین صابری کا مضمون ''حافظ ابن قیم جوزی اور ان کا ذوق تصوف'' کے عنوان سے جناب ضیاء الرحمن علیمی کا مضمون اس بات کا بین ثبوت ہیں، جناب علیمی کا مضمون بہت سے منفی نظریات کا سد باب ہے۔ مولانا کوثر امام قادری اور مولانا طفیل احمد مصباحی کے مضامین اگر ایک طرف موضوع کا حق ادا کرتے ہیں وہیں ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی اور ڈاکٹر ساحل سہسرامی کے مضامین بالترتیب مطالعے کی دعوت دے رہے ہیں، اس طرح کے مضامین بہت کم پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مولانا ساجد رضا مصباحی نے ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تصنیف ''الغزالی بین مادحیہ وناقدیہ'' کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح مولانا وارث مظہری کا مضمون ''غزالی اور مسئلہ تکفیر: ایک جائزہ'' بھی حسب موضوع ہے، البتہ یہ مضمون بہت احتیاط سے پڑھنے کا متقاضی ہے۔

''بحث و نظر'' کی محفل میں اس بار مفتی محمد نظام الدین رضوی، پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی کی شمولیت ہوئی ہے، تینوں حضرات کی آرا اپنے اپنے لحاظ سے وزن و وقار رکھتی ہیں۔ بالخصوص مفتی صاحب قبلہ نے جو اصولی بات کہی ہے کہ ''مدارس کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں تصوف کی کتابیں بھی شامل کریں اور ساتھ ہی طلبہ کی علمی تربیت بھی ہو اور خانقاہوں کو چاہیے کہ مکمل طور پر اپنی اصلاح کریں، خود علم شریعت سے آراستہ ہوں اور وابستگان کو علم شریعت دیں۔'' (ص:۱۹۶) ہر نوعیت سے نمونہ عمل ہے۔ اگر مفتی صاحب قبلہ کی نصیحت پر عمل کیا جائے تو امید قوی ہے کہ خانقاہ اور مدارس کے مابین جو خلا ہے، وہ ایک حد تک پر ہو سکتا ہے۔

''شناسائی'' کے تحت مفتی عبید الرحمن رشیدی کا تحریری انٹرویو ہے، مفتی صاحب نے جناب حسن سعید صفوی کے چوبیس سوالات کا تشفی بخش جواب سپرد قرطاس فرمایا ہے اور مفتی صاحب قبلہ نے تصوف کے موافقین ومخالفین کو جو نصیحت فرمائی ہے، وہ قابل تقلید ہے۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور کی علمی وروحانی خدمات پر مشتمل جناب مجیب الرحمن علیمی کا مضمون طویل ہونے کے باوجود قابل مطالعہ ہے۔ اس مضمون میں حوالے کے طور پر بار بار ایک ہی کتاب ''سمات الاخیار'' کو پیش کیا گیا جو اصول تحقیق کے مطابق نہیں، اس بات پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔

''صوفی ادب'' کے ضمن میں تین مضامین شامل ہیں: ''تعلیمات تصوف اور مولانا روم'' از پروفیسر عبد الحمید اکبر ''امیر خسرو کی عربی نثر نگاری'' از ضیاء الرحمن علیمی اور ''امیر خسرو کی فارسی نعتیہ شاعری'' از مولانا ارشاد عالم نعمانی اس حصے کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ تینوں مضامین اگرچہ

مفید اور معلوماتی ہیں مگر یہ مضامین مزید وسعت چاہتے ہیں۔ اسی طرح عربی فارسی عبارت واشعار کا ترجمہ کردیا جاتا تو اس کی اہمیت وافادیت میں چار چاند لگ جاتے۔ کہ عربی وفارسی کے اس قحط زدہ ماحول میں اہل علم کو اس کا خود بہ خود اندازہ ہوگا۔

اس شمارے کی ایک خاص خصوصیت وانفرادیت یہ بھی ہے کہ اس میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی حیات وخدمات پر ایک گوشہ شامل ہے ۹۵ رصفحات پر مشتمل یہ گوشہ کئی نوعیت سے اہمیت کا حامل ہے۔ گوشے کے آغاز میں ''آئینہ حیات حضرت مجددؒ'' کے عنوان سے جو سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ مختصر مگر جامع ہے۔ یہاں پروفیسر اختر الواسع، رفعت رضا نوری ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اور مولانا ابرار رضا مصباحی کے مضامین حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات اور علمی وفکری نظریات کو بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ البتہ گوشہ مکررات سے محفوظ نہیں کہ اکثر مضمون نگار نے اپنے مضمون میں سوانحی حصہ شامل کیا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا کہ سوانحی حصہ کو حذف کردیا جاتا کہ شروع میں ہی اجمالی سوانحی خاکہ پیش کیا جاچکا ہے۔

''پیمانہ'' کے تحت پانچ کتابوں پر تبصرہ شامل ہے، سب تبصرے روایتی طرز کے ہیں، یہاں مبصر حضرات بھی پردہ خفا میں ہیں، خاکسار کی نظر میں یہ حصہ مجلہ کا سب سے کم زور پہلو ہے۔ مدیران سے میری گزارش ہوگی کہ اس حصے کو بھی تحقیقی وتنقیدی بنانے کی کوشش کریں تاکہ تنقید و تحقیق کا مکمل حق ادا ہوسکے۔

شمارے کا مکتوباتی حصہ کافی وقیع ہے، اس میں ادبی دنیا کا معتبر ومستند نقاد شمس الرحمن فاروقی کی شمولیت خوش آئند ہے۔ اس میں شامل بعض مکتوبات یقیناً مقالے کا درجہ رکھتے ہیں۔ عام طور سے مکتوب نگار اپنے خطوط میں حوصلہ افزا یا توصیفی باتیں لکھتے ہیں مگر یہاں ویسی باتیں نہیں، مکتوب نگار حضرات نے حتی المقدور توصیفی وتحسینی جملوں سے گریز کرتے ہوئے، اپنی گفتگو تخلیقات ومشمولات تک ہی مرکوز رکھی ہے۔ بعض مکتوب تحقیق وتنقید کا بھی مزا دیتے ہیں۔ اخیر میں عرض یہ ہے کہ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیہ کرام کا جو کردار اور حصہ ہے، خاکسار اسی روایت سے جوڑ کر اس مجلے کے مطالعے کی سفارش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ یہ مجلہ اہل علم کے مطالعے کا حصہ بنے اور اس کے قارئین اس کے فیضان سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ومستفید ہوں، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

مولانا طفیل احمد مصباحی (نائب مدیر: ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ)

میکدۂ تصوف کے تیسرے جام لبالب سے شاد کام ہوا جو قلب ونظر کی سیرابی کا باعث بنا۔ مجلہ ''الاحسان'' کا یہ تیسرا شمارہ گذشتہ دونوں شماروں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی پرکشش اور

جاذب نظر ہے۔ اسے ظاہری ومعنوی حسن سے آراستہ کرنے میں آپ حضرات کی کاوشیں لائق تحسین اور قابل تقلید ہیں۔ مضامین کا حسن انتخاب اور پیش کش میں عصریت رسالہ ''الاحسان'' کا طرۂ امتیاز ہے، میں اس بات کا شروع سے قائل ہوں۔ یہ سوال عرصۂ دراز سے دہرایا جارہا ہے کہ ''تصوف'' اب حقیقت کے بجائے محض ایک نام رہ گیا ہے مگر الحمدللہ! الاحسان نے دنیا کو یہ باور کرانا شروع کردیا ہے کہ ''تصوف محض نام ہی نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے، تصوف پر لگائے گئے الزامات بے بنیاد ہیں اور پہلے سے کہیں زیادہ آج تصوف کی ضرورت ہے۔

یہ سلسلہ جاری رہا تو ان شاء اللہ بہت جلد تصوف مخالف مہم اپنی موت آپ مرجائے گی اور مخالفین بھی اس کی حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے۔ بس وقت کا انتظار ہے اور اس کارواں کو منظم طریقے سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر علاء الدین خاں (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ تاریخ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، یوپی)

آج کی اس مادی دنیا میں علمی کام کرنا خصوصاً علمی رسالوں کا اجراء بڑا ہی صبر آزما کام ہے۔ کسی رسالے کو معیاری اور علمی بنانے کے ساتھ ہی تسلسل بنائے رکھنا بھی مشکل امر ہے لیکن آپ کا یہ علمی مجلہ الحمدللہ! تسلسل کے ساتھ ہی تحقیقی اور علمی معیار پر قائم ہے۔

اس مجلّے کا تیسرا شمارہ محترم مجیب الرحمن صاحب کے بدست دہلی میں ملا، میں نے جستہ جستہ اس کا مطالعہ کیا، میں تاریخ کا طالب علم رہا ہوں اور تصوف کی ابتدا و ارتقا سے متعلق اپنے طلبہ کو بتاتا رہتا ہوں۔ اس رسالے نے میرے اندر تحریک وتشویق پیدا کی اور تصوف سے متعلق میرے علم میں اضافہ کیا۔ اس کے مشمولات میں تنوع ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ تنوع کے باعث قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ حضرت آسی غازی پوری اور اصغر گونڈوی کی غزل پسند آئی۔ پروفیسر اختر الواسع، مولانا وارث مظہری، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کے تحقیقی مضامین سے اس رسالے کی وقعت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ اس کے تمام مضامین معیاری ہیں۔ اللہ کرے اگلا شمارہ اس سے بھی بہتر ہو۔

ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی (مالیگاؤں ناسک، مہاراشٹر)

مکرمی! تصوف ومعرفت پر آج جب کہ چاروں طرف سے تہمتوں اور بے بنیاد الزامات کی یلغار جاری ہے۔ تصوف کے مخالفین اتنے جری اور بہادر ہو گئے ہیں کہ ان کے نزدیک تصوف ایک ایسی قبیح اور مذموم چیز تصور کی جارہی ہے جس سے شہادت ساقط اور عدالت زائل ہوجاتی ہے۔ ثقاہت مجروح اور خبر نامقبول ہوجاتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہورہا ہے؟ اس سوال کا جواب جب ہم تلاش کرتے ہیں تو ہمارے سامنے جو منظر نامہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ فی زمانہ تصوف ومعرفت کی اصل اور اس کے حقائق ومعارف سے یک سرنا آشنا جاہل اور نام نہاد صوفیہ نے تصوف کو بازیچۂ اطفال بنا

کررکھ دیا ہے، جس کی وجہ سے معاندینِ تصوف، تصوف ہی کو مسلسل مشق ستم بنا رہے ہیں۔

ایسے پُرآشوب دور میں علم وفضل کی دھرتی الٰہ آباد سے ''الاحسان'' جیسے تصوف ومعرفت کے حقائق ومعارف پر مبنی علمی، تحقیقی ودعوتی مجلّے کا اجرا ایک مہتم بالشان کارنامے سے کم نہیں۔

محب گرامی مولانا مظہر حسین علیمی صاحب کے توسط سے ''الاحسان'' کا تیسرا شمارہ نظرنواز ہوا۔ پہلا شمارہ دیکھنے کو ملا تھا، لیکن دوسرے شمارے سے ناچیز محروم رہا۔ خیر! ''نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد زاول'' کے مصداق اس رسالے کی آب وتاب اور دل کشی میں جو اضافہ دیکھنے کو ملا وہ ہر لحاظ سے سراہے جانے کے قابل ہے۔ موضوع ومواد کے اعتبار سے یہ رسالہ جامعیت کا آئینہ دار ہے۔

''الاحسان'' کے وسیلے سے مادہ پرستی کے اس دور میں روحانیت وتصوف کا علمی وتحقیقی اور دعوتی نہج پر جو پاکیزہ کام آپ حضرات نے شروع کیا ہے وہ یقیناً قابل تقلید بھی ہے اور باعث تحسین بھی۔ اور کیوں نہ ہو کہ اس رسالے کو قیادت حاصل ہے مخلص ومدبر حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ کی، جن کے مخلصانہ اور محبت آمیز رویے کے بارے میں کئی دوستوں سے سنا ہے۔ سبحان اللہ! دعا ہے کہ حضرت قبلہ کی قیادت میں ''الاحسان'' کا یہ روحانی وعرفانی کارواں اکناف عالم میں تصوف وروحانیت کی شمعیں اسی طرح روشن کرتا رہے۔ (آمین)

''الاحسان'' کی بزم محبت میں اپنے گراں قدر مضامین ومقالات کے ساتھ جو حضرات شرکت کررہے ہیں، ان کے نام آج علمی وادبی دنیا کے افق پر محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ایسی شخصیات کے رشحاتِ خامہ کا کسی رسالے کی زینت بننا ہی اُس رسالے کے بلند معیار کا پتا دیتا ہے۔ جملہ مشمولات اپنے موضوع کا حق ادا کرتے ہیں۔ بادۂ کہنہ کا انتخاب کافی عمدہ ہے۔ تذکیر میں حضرت مولانا محمد عبدالمبین نعمانی صاحب کا مضمون کافی پسند آیا۔ حضرت نعمانی صاحب قبلہ کی تحریریں اصلاحِ معاشرہ کے زیور سے آراستہ ہوتی ہیں اور وقت کے تقاضوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ تحقیق وتنقید میں تمام مضامین بہتر ہیں۔ ان اہل قلم نے جس طرح تحقیق کے موتی چن کر خوان قرطاس پر سجایا ہے اس کی حوصلہ افزائی نہ کرنا غیر مناسب ہی ہوگا۔ مولانا ضیاء الرحمن علیمی صاحب نے حسب سابق ایک ایسے موضوع پر تحقیقی انداز میں روشنی ڈالی ہے جس پر قلم اٹھانا ضروری بھی تھا، تاکہ فی زمانہ تصوف کے مخالفین اس بات کو سمجھ سکیں کہ تصوف کی اصل سے ان کے پیشوا بھی منکر نہیں تھے۔

پیر طریقت محقق عصر حضرت علامہ مفتی محمد عبیدالرحمن رشیدی صاحب قبلہ دام ظلہ العالی اور خانقاہ رشیدیہ سے ناچیز ذاتی طور پر متاثر ہے۔ حضرت کا انٹرویو اور خانقاہ کا تعارف پیش کر کے ''الاحسان'' کے عملے نے ایک بڑا کام انجام دیا ہے۔ یقین ہے کہ تزکیۂ نفس اور طہارت قلبی کے ایسے دوسرے روحانی مراکز کے سجادگان اور خانقاہوں کا تعارف آیندہ شماروں کی زینت بنتا رہے

گا تا کہ تصوف پسند طبقہ ان خانقاہوں اور ان کی زریں خدمات سے واقف ہوتا رہے۔

''الاحسان'' کا یہ تیسرا شمارہ چوں کہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مقدس نام سے منسوب ہے۔ اس لیے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ پر خصوصی گوشہ بھی ''زاویہ'' کے تحت پیش نظر رسالے میں جگمگا رہا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کے حوالے سے یہ مختصر ترین گوشہ حضرت کے کارناموں کا اجمالی منظر نامہ سہی لیکن وقیع اور معلومات بخش ہے۔

مبارک باد کے مستحق ہیں محترم حسن سعید صفوی صاحب اور ان کے جملہ اعوان وانصار جنھوں نے مادہ پرستی کے عروج واقبال کے اس دور میں روحانیت وتصوف کا چراغ روشن کیا ہے۔ ان شاء اللہ اس چراغ کی روشنی رفتہ رفتہ اکنافِ عالم میں پھیل کر بے چینیوں کے شکار طمانیتِ قلب کے متلاشیان کے دلوں کو تصوف ومعرفت کی روحانی کرنوں سے منور ومجلی کرنے میں یقینا کامیاب وکامران ہوگی۔

مولانا محمد اسلم رضا قادری (باسنی، ناگور شریف، راجستھان)

ایسے حالات میں جہاں ہر شخص حبِ جاہ ومال میں گرفتار ہے، تصوف اور افکار صوفیہ پر علمی وتحقیقی مجلّہ شائع کرنا خانقاہ عارفیہ سیّد سراواں الہ آباد (یوپی) کا ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے جس سے یقیناً مردہ دل روشن ہوں گے، حقیقت ومعرفت کے در وا ہوں گے، اذہان اوامر ونواہی کی جانب مائل وراغب ہوں گے، قلوب منہیات شرعیہ سے دور رہنے کی کوشش کریں گے۔ بلاشبہ آپ کا یہ علمی کارنامہ تاریخ میں یاد رکھا جائے گا، اس وقت معاشرے کو اسی قسم کے اصلاحی رجحانات بڑھانے والے تحقیقی وعلمی جریدوں اور مجلّوں کی اشد ضرورت ہے، اس پر مستزاد تصوف کے موضوع پر یہ احسان پر احسان ہے۔ جزاھم اللہ جزاءً خیرا۔

الاحسان کے اس تیسرے شمارے میں آپ نے مجدّد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدّس سرُّہٗ کی حیات وخدمات اور ان کی اصلاحی وتجدیدی کارناموں سے ہزاروں قارئین کو متعارف کرا کے بڑا اہم کارنامہ انجام دیا ہے جو وقت کی ضرورت ہونے کے ساتھ اسلاف کرام سے ہماری سچی عقیدت ومحبت کی دلیل ہے کیوں کہ آج اسلاف بیزاری کی بلا عام ہوتی جا رہی ہے، ضروری ہے کہ ہم تمام اکابر علما ومشائخ اور صوفیۂ عظام کی خدمات جلیلہ کا دل سے احترام کریں، نکتہ چینی اور نشتر بازی سے باز آئیں، اسی میں سرخ روئی اور کامیابی ہے۔ حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں:

نام نیکو رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت برقرار

ماہر رضویات ڈاکٹر مسعود احمد نقش بندی صاحب نے حضرت مجدد صاحب کے حوالے سے ''جہان امام ربانی'' کی شکل میں ایک تحقیقی شاہ کار تیار فرما کر جماعت اہل سنت پر عظیم احسان فرمایا ہے، اس عظیم علمی شاہ کار کا تعارف ہی شامل ہو جاتا تو بہت مفید ہوتا۔ مکتوبات میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی مدظلہ کا خط، مبسوط و مفصل اور بڑا ہی جامع اور معلومات کا خزانہ ہے۔ شیخ محترم حضرت ابوسعید شاہ احسان اللہ صفوی محمدی صاحب مدظلہ کی بارگاہ میں نیاز مندانہ سلام پیش کر دیں۔ مولیٰ تعالیٰ آپ کے کاروان تحقیق و ادب کو مزید فروغ و ترقی عطا فرمائے، آمین۔

محمد ابرار رضا مصباحی (پرنسپل، الجامعۃ الاسلامیہ جیت پور نئی دہلی)

علمی، دعوتی اور تحقیقی مجلہ ''الاحسان'' عصری حالات کے اعتبار سے مسائل تصوف کی توضیح وتشریح نیز اس فن منیف کی تبلیغ و توسیع میں اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا، اس کی مقبولیت و معنویت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے اور علمی و تحقیقی تمام حلقوں میں بھی اس کو کافی سراہا جا رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مجلہ تصوف کے ذوق رکھنے والوں کو ایک عمدہ سامان فراہم کرتا ہے، بلکہ ایمانی و روحانی حرارت پیدا کر کے ان کے اندر دعوتی مزاج اور تحقیقی منہاج عطا کرتا ہے، جس کا سہرا بلا شبہ داعی اسلام شیخ طریقت حضرت شاہ احسان اللہ محمدی صفوی صاحب قبلہ دامت برکاتہم القدسیہ زیب سجادہ خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں الہ آباد کو جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ارکان و اعوان ادارہ بھی مستحق تحسین ہیں جو حضرت داعی اسلام مدظلہ العالی کی نگرانی اور ہدایات کے مطابق اپنی ذمے داریوں کو بہتر طریقے پر انجام دیتے ہیں۔

اس بار ''شناسائی'' کے کالم میں ملک کی ایک قدیم اور تاریخی خانقاہ، خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور اور اس کے زیب سجادہ جامع علوم عقلیہ و نقلیہ شیخ طریقت حضرت مفتی شاہ محمد عبید الرحمٰن رشیدی صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ کی خدمات اور کارنامے کے تعلق سے بڑا تحقیقی و معلوماتی تعارف و تذکرہ ہے جو یقینی طور پر دستاویزی حیثیت رکھتا ہے، خانقاہ عالیہ رشیدیہ جون پور، جس نے خاموش مزاجی اور زمانے کی ہنگامہ آرائیوں سے بے نیاز ہو کر مخلوق خدا کو خالص تصوف و روحانیت اور عمدہ اخلاق و محبت کا درس دیا ہے اور علمی و روحانی سطحوں پہ قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے، ''الاحسان'' نے تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے اس کی اور اس کے مشائخ و بزرگان کی تعلیمات و خدمات کو بڑے مؤثر طریقے سے تعارف کرایا ہے جو حضرت داعی اسلام مدظلہ کے مخلصانہ ایماء و انتخاب اور مولانا مجیب الرحمٰن علیمی صاحب کی محنت و کاوش اور عقیدت و محبت کا نتیجہ ہے، اس کے لیے ہم خانقاہ عالیہ رشیدیہ کے تمام وابستگان کی طرف سے حضرت داعی اسلام اور اصحاب و ارکان ادارہ کے انتہائی شکر گزار ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت انہیں اس کا بہترین اجر عطا

فرمائے، ہمیں اور آپ تمام حضرات کو تمام حاسدین کے حسد اور معاندین کے عناد سے محفوظ رکھے اور دائرہ کار کو وسیع وفزوں فرمائے۔ آمین۔

محبان گرامی مولانا مجیب الرحمٰن علیمی اور مولانا ذیشان احمد مصباحی صاحبان کی طرف سے راقم الحروف کو صوفی کامل عارف طریقت حضرت شاہ محمد عبد العلیم آسی رشیدی غازی پوری قدس سرہ کی صوفیانہ شاعری پر قلم بند کرنے کا حکم تھا جس کا میں قطعی طور پر اہل نہیں ہوں لیکن صرف تعمیل حکم کی خاطر میں نے ''حضرت آسی غازی پوری کی صوفیانہ شاعری'' کے نام پر ایک ناقص و بے وقعت تحریر ''الاحسان'' کو ارسال کر دیا ہے۔

سید تالیف حیدر (جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی)

'الاحسان' شمارہ نمبر ۳ نظر سے گزرا۔ اپنی تمام تر معلومات کی روشنی میں میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سرزمین ہندوستان پر تصوف کے فلسفیانہ اور علمی مباحث پر اس سے بہتر پرچہ شاید ہی کہیں اور سے نکلتا ہو جس کا اعزاز سرزمین الہ آباد کو حاصل ہے۔ اس میں وہ تمام مباحث یکجا کیے جا رہے ہیں جن سے ناامید تصوف میں اس بات کی امید دوبارہ پیدا ہو رہی ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اصل تعلیمات تصوف کو اجاگر کرنے میں کوشاں ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ الاحسان نے بلا تمہید و تکلف ان باتوں کو اپنا ہدف بنایا ہے جن کی بنا پر ایک بڑی جماعت مخالفین تصوف میں شمار کی جانے لگی، حالاں کہ انھیں صرف اور صرف تصوف کی کچھ خاص جہات سے اختلاف ہے۔ ذکر نکل ہی آیا ہے تو ترتیب وار بیان کرنے سے قبل میں اس شمارے میں موجود ذیشان احمد مصباحی کی 'واردات' کے متعلق صرف اتنا کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ اگر صرف ان چند اقتباسات کو ہی پڑھ لے تو تصوف کی موافقت و مخالفت میں اسے اعتدال کی سمت مل سکتی ہے۔ بہر کیف! امام ربانی، شیخ مجدد الف ثانی سے منسوب گوشے پر مشتمل اس شمارے میں کئی اہم مضامین موجود ہیں جن سے طالبین تصوف کے ذہن و قلوب کو تسکین میسر آتی ہے۔

حسب روایت اس شمارے کے سرورق پر موجود قرآنی آیت مومنین سے خطاب و استفسار پر مشتمل ہے۔ (الحدید:۱۶) اس آیت کا سرورق پر چسپاں کرنا اور مرتبین کا انتخاب آیت کچھ یوں ہی نہیں، بغور جائزہ لیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں مومنین کے لیے پیغام موجود ہے اور ان کے قلوب کو مصفی کرنے کے لیے ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی یاد کی طرف مزید متوجہ ہوں اور اس کے لیے قرآن کریم سے کسب ہدایت کی تلقین کی جا رہی ہے، تاکہ ان کا شمار محسنین میں ہو سکے کیونکہ اگلا درجہ وہی ہے۔ الاحسان کے سرورق پر یہ آیت باب محسنین کا کام انجام دے رہی ہے کہ جب آپ اس ورق کو الٹ کر اس شہر میں داخل ہوں گے تو سوائے احسان کے اور کچھ نہ پائیں

گے۔اس شمارے کے ابواب ومشمولات بھی تقریباً وہی ہیں جو گزشتہ شمارے کی زینت تھے۔

بادہ وساغر: ہر بار کی طرح اس بار بھی اس باب کے ذریعے ہم تک عشق حقیقی سے لبریز کچھ غزلیں پہنچیں جن میں، حضرت آسی غازی پوری، عزیز صفی پوری، اصغر گونڈوی، شیخ ابو سعید صفوی اور علی ظہیر عثمانی صاحبان کا کلام شامل ہے۔میری ذاتی رائے میں اصغر گونڈوی کی جس غزل کا انتخاب اس شمارے کے لیے کیا گیا خود انھیں کی اس سے کچھ اور بہتر غزلیں موجود ہیں جن کی طرف شاید مرتبین کی نگاہ نہ جاسکی، چونکہ قدیم شعرا کے کلام کا انتخاب ہمارے اپنے مذاق کا ترجمان ہوتا ہے اس لیے مرتبین کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں ہم اعلیٰ کی جگہ متوسط کا انتخاب تو نہیں کر رہے ہیں۔اسی طرح حضرت آسی غازی پوری کی جس غزل کا انتخاب کیا گیا ہے وہ نہایت معیاری ہوتے ہوئے الاحسان کے لیے تنازع کا باعث بھی بن سکتی ہے۔اس غزل میں موجود ان کا یہ شعر:

اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشم بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز

کی خالص صوفیانہ تشریح میں مخالفین تصوف روڑے اٹکانے کی کوشش کریں گے، وہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ مخبر کون ہے صرف خبر کی بنیاد پر ایک صوفی کے ساتھ ساتھ الاحسان کے خالص تصوف کی تعلیمات کو اجاگر کرنے کے مشن پر بھی حرف زنی کریں گے۔مرتبین کو چاہیے کہ ایسے کلام سے اس وقت تک پرہیز کریں جب تک عوام وخواص کو تصوف کی صحیح تصویر نظر نہ آجائے۔علی ظہیر عثمانی صاحب کا کلام پہلی مرتبہ اس شمارے کے ذریعے پڑھنے کو ملا میں محو حیرت ہوں کہ اس اعلیٰ معیار کا کلام ابھی تک ہماری نظروں سے کیوں اوجھل تھا، ہوسکتا ہے کہ یہ صرف میرے لیے نیا ہو لیکن میری طرح یہ کلام جن جن حضرات کے لیے نیا ہوگا وہ بھی اس بات کے خواہش مند ہوں گے کہ ان کے متعلق کچھ مزید معلومات ہم تک پہنچے تاکہ ان کے کلام سے مزید استفادہ کیا جاسکے۔میں برادر عزیز حسن سعید سے التجا گذار ہوں کہ وہ اس طرح کے گم نام شعرا کو جب جب ہم سے متعارف کرائیں تو دو چار سطروں میں ان کا تعارف بھی پیش کردیں جس سے شاعر کے کوائف جاننے میں آسانی پیدا ہوسکے گی۔میں اس باب کے متعلق اتنا اور کہنا چاہوں گا کہ ادارہ الاحسان کو چاہیے کہ وہ تبرکاً قدیم شعرا میں سے کسی ایک کی غزل کا انتخاب ضرور کریں لیکن زیادہ توجہ اس بات پر صرف کریں کہ جدید عہد میں ایسی شاعری کون کر رہا ہے، تاکہ ان کے کلام کو اس پلیٹ فارم کے ذریعے شناخت مل سکے۔

احوال: اس باب کے ذریعے ذیشان احمد مصباحی کی پر مغز گفتگو سے مجھے امید ہے کہ تصوف کے تئیں متعصب سے متعصب شخص بھی محظوظ ہوا ہوگا، یہ وہ اہم نکات ہیں جن پر ہم سب

کو ٹھہر کر سوچنا چاہیے، میں اس تحریر کے لیے ادارہ الاحسان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ یہ ایک زندہ جاوید تحریر ہے جس سے ان شاءاللہ آئندہ نسلیں مستفید ہوں گی۔

بادۂ کہنہ: شیخ ابونصر سراج علیہ الرحمہ جیسے صوفی کی کتاب، 'کتاب اللمع' کے جس باب کو اس شمارے کے لیے منتخب کیا گیا وہ ضرورت وقت کے لحاظ سے بہت جامع اقتباس ہے۔ میں اپنی بات کی دلیل میں اسی اقتباس سے صرف ایک سطر پیش کروں گا۔ فرماتے ہیں، 'اس دنیا میں ہر علم کی ایک حد ہے اور یہ حد تصوف پر آ کر ختم ہو جاتی ہے، جب کہ تصوف کی حد کسی دوسرے علم پر ختم نہیں ہوتی۔' یہی وہ الفاظ ہیں جو لوگوں کو تصوف کی ماہیت سے روشناس کرائیں گے۔ اسی طرح 'شریعت وحقیت' اور 'علمائے دنیا اور علمائے آخرت' کے ضمن میں بھی شیخ علی بن عثمان ہجویری اور شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ اجمعین نے بھی کارآمد باتیں کی ہیں، جن کے مطالعے سے قدیم صوفیہ کے ملفوظات کے مطالعے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

تذکیر: یہ باب ہر طرح کی فلسفیانہ گفتگو سے مبرا خالص عمل صالح کی ہدایت پیش کرتا ہے، جس سے ہم سب میں اسلام اور ایمان کی صحیح پیروی کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور اسی کے ذریعے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ داعی اسلام شیخ ابوسعید صفوی دام ظلہ کے زیر تربیت کس رفتار سے لوگ حقیقت دین کی سمجھ حاصل کر رہے ہیں۔

تحقیق وتنقید: اس باب کے توسط سے ہم تک آٹھ تحقیقی وتنقیدی مضامین پہنچے ہیں جن میں بلامبالغہ سب اہم ہیں، لیکن ضیاالرحمٰن علیمی کا مضمون ہر بار کی طرح اس بار بھی امتیازی اہمیت کا حامل ہے، جب کہ گزشتہ شمارے کے مقابلے میں اس شمارے میں موجود ان کے مضمون کی ضخامت میں کچھ کمی آئی ہے، پھر بھی انھوں نے اہم دلائل کی روشنی میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے، اب اس سے کس کو کہاں تک اتفاق ہے یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے۔ مولانا کوثر امام قادری اور پروفیسر بدیع الدین صابری صاحبان نے بھی اہم موضوعات پر جامع تحریریں رقم کی ہیں لیکن مولانا طفیل احمد مصباحی صاحب نے جس عالمانہ بصیرت سے علامہ ابن حجر ہیتمی کی نظر میں تصوف اور صوفیہ کی اہمیت کو پیش کیا ہے اس سے دسویں صدی ہجری کے ایک بڑے صوفی کے خیالات سے ہم کو متعارف ہونے کا موقع نصیب ہوا۔ صوفی خواتین ایک جائزہ بھی متوازی مضمون ہے جب کہ ڈاکٹر ساحل شہسرامی کا مضمون زبان کے لحاظ سے پر تکلف ہے۔

بحث ونظر: عصر حاضر میں احیاے تصوف کا کام کن اصولوں پر ممکن ہے؟ کے جواب میں ہمارے تین اہم علماے کرام نے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن ان تینوں حضرات میں نوشاد عالم چشتی صاحب کی تجویز زیادہ قوی اور موثر معلوم ہوتی ہے۔ مفتی

نظام الدین صاحب نے بہت محتاط انداز میں اس سوال کو حل کرنے کی صلاح پیش کی ہے، جب کہ ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ صرف مدارس اور خانقاہوں کے نظام کو تبدیل کر کے احیاے تصوف کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں اس مشورے کو احیائے تصوف کے کام کو انجام دینے کی ایک کڑی تو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے کلیتاً اپنے مقصود تک رسائی میری دانست میں ناممکن ہے۔ رہی بات پروفیسر اختر الواسع صاحب کی تجویز کی تو اس سے مظلومین کے دکھوں کا علاج تو ممکن ہے لیکن اصل تعلیمات تصوف کا احیا ممکن نہیں، تصوف حقیقتاً اصلاح باطن کا نام ہے جس کی شروعات یا جس کے احیا کے لیے ہمیں اجمیر یا دہلی کی درگاہوں کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصلاح خودی کی ضرورت ہے۔ تصوف یا پھر جدید نظریہ تصوف اس کا نام نہیں ہے کہ ہم عوام میں لنگر تقسیم کر کے یا ان کے دکھ درد کا مادی یا روحانی ذریعے سے علاج تجویز کر کے تصوف کا احیا کریں۔ اس کے برعکس ہم ایسی تعلیمات کو عام کریں جن سے ہر شخص میں ایمان کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ خود اعتمادی پیدا ہو اور ہر شخص ایمان کامل اور فقہی بصیرت سے آراستہ ہو کر اپنے اپنے طور پر مستقلاً احیائے تصوف کے کام میں مصروف و مشغول رہے۔

شناسائی: ہر بار کی طرح اس بار بھی شناسائی کے توسط سے ایک خانقاہ سے کماحقہ شناسا ہونے کا شرف حاصل ہوا جس میں حسن سعید صاحب کی صاحب سجادہ سے گفتگو اور پھر مجیب الرحمٰن علیمی صاحب کا تعارفی مضمون، جس نے اس دفعہ خانقاہ رشیدیہ کی اہمیت اور تاریخی حیثیت کو پوری طرح اجاگر کیا۔ یہ سلسلہ اتنا کارآمد ہے کہ جس سے ایسی خانقاہوں سے ہر شخص متعارف ہو رہا ہے جو خود کو ہر طرح کے نام و نمود سے پاک رکھتی چلی آئی ہیں اور جن خانقاہوں کے سجادگان کو بھی اس بات کی ہوس نہیں ہوئی کہ ہمارے دروازوں پر بھی دوسری درگاہوں کی طرح جم غفیر امنڈے اور ساتھ ہی ساتھ ایک اہم خانقاہی انسائکلو پیڈیا بھی تیار ہو رہا ہے جو مستقبل میں بہت اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

صوفی ادب: صوفی ادب کے زمرے میں تین مضامین آتے ہیں، پروفیسر عبدالحمید اکبر صاحب کا مضمون 'تعلیمات تصوف اور مثنوی مولانا روم' کے لیے جو ضخامت درکار ہے اس کے بالکل برعکس پروفیسر صاحب نے بہت اجمالاً اس کو تحریر کر دیا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس پر میں ان کے انداز اختصار کی داد دوں یا عنوان کا حق نہ ادا ہو پانے پر ماتم کروں۔ ضیا الرحمٰن علیمی صاحب کا مضمون میری اہلیت سے ورا ہے، اس لیے اس پر کسی قسم کی گفتگو نہیں کر سکتا۔ ہاں! میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے، اس لیے ان کے انداز تحریر کو ضرور سراہوں گا کہ معیاری ادبی مضامین اسی طرز کے ہوتے ہیں۔ مولانا ارشاد عالم نعمانی نے 'امیر خسرو کی فارسی نعتیہ شاعری' پر بہت بصیرت

افروز مضمون لکھا ہے۔ مجھے ان کی کچھ باتوں سے اتفاق ہے مگر کچھ سے اختلاف، مثلاً وہ اپنے مضمون میں ایک مقام پر رقم طراز ہیں کہ 'ارباب ادب جس طرح اردو شاعری میں نعتیہ شاعری کو ادبی مقام دینے اور اس کا ادبی تجزیہ کرنے سے دانستہ صرف نظر کرتے ہیں، اسی طرح فارسی شعرا کے کلام کے تجزیے میں دوسرے اصناف و عناصر کو تو بطور خاص ملحوظ رکھتے ہیں جب کہ نعتیہ شاعری سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔' میں ان سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے ارباب ادب ہیں اگر وہ اردو ادب کے مورخین کی بات کر رہے ہیں تو انھیں یہ پتہ ہونا چاہیے کہ نعت کو بحیثیت صنف ہر مورخ نے تسلیم کیا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہوا ہو گا کہ دیگر اصناف کے مقابلے میں نعتیہ شاعری پر ان مورخین نے کم گفتگو کی ہو گی لیکن اس کے لیے آپ کن ارباب ادب کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے؟ اگر آپ کو اس بات کا حقیقۃً قلق ہے تو خود ایک تاریخ رقم کیجیے جس میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ نعتیہ شاعری پر بھی سیر حاصل گفتگو موجود ہو۔ اس امر کے لیے سوائے ہمارے کوئی ارباب ادب ذمہ دار نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس خط کے مطالعے کے بعد جلد ہی اردو اور فارسی نعتیہ شاعری پر ان کا ایک وقیع کام منظر عام پر آئے گا۔

زاویہ: اس باب کے تحت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی پر نہایت عالمانہ گوشہ ترتیب دیا گیا ہے، جس میں سات مضامین ہیں۔ فہرست مضامین سے معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ آئینۂ حیات مختصر مگر جامع ہے۔ اختر الواسع صاحب کا مضمون اقبالؔ کے ایک مصرعے پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر اقبال نے شیخ مجدد کے لیے کہا تھا۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبالؔ کے اس مصرعے میں جتنی روانی ہے اختر الواسع صاحب کے مضمون میں اتنی ہی جاذبیت پائی جاتی ہے۔ بہت مربوط انداز میں 'وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان' کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ ہر جملے سے صدائے اقبال مترشح ہو رہی ہے۔ اساتذہ سے ہمیں یہ ہی سیکھنے کو ملتا ہے کہ اگر کسی بڑے شاعر کے مصرعے کو اپنے مضمون کا عنوان بناؤ تو کلیتاً اس کا حق بھی ادا کرو۔ دیگر مضامین پر گفتگو سے پہلے میں ایک بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ایسے گوشوں کو شائع کرنے کا جب بھی التزام کیا جائے تو عناوین کا انتخاب کر کے انھیں پہلے ہی تقسیم کر دیا جائے۔ اس سے بہتر صورت یہ نکل کے آتی ہے کہ ہر مضمون کی ابتدا میں صاحب گوشہ سے متعارف ہونے کی حاجت نہیں رہ جاتی اور صفحات کی گنجائش سے ایک آدھ مضمون کا اضافہ اور کیا جا سکتا ہے۔ رفعت رضا نوری کی تحریر اہم ہے جب کہ قمر الہدیٰ فریدی اور پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحبان کے مضامین گوشے کی زینت کو دوبالا کر رہے ہیں۔ بلا مبالغہ شیخ مجدد اور شاہ ولی اللہ کے کارہائے نمایاں نے احیائے دین کا کارنامہ انجام دیا۔ اگر شیخ مجدد نے وحدۃ الوجود سے آگے بڑھ کر وحدۃ الشہود کے فلسفے سے ہمیں متعارف کروایا تو وہیں شاہ صاحب نے وحدۃ

الوجود کو تنزلات خمسہ کی بنیاد پر واضح انداز میں سمجھانے کی کوشش کی، لیکن ساتھ ہی ہمہ اوست کے فلسفے سے ابتدائے سلوک کی منزلوں میں بچنے کی تلقین بھی کی۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے 'مکتوبات امام ربانی میں تصوف کے رموز و نکات' میں مکتوبات کے اقتباسات سے فلسفۂ وجود و شہود اور فنا و بقا کے متعلق جو گفتگو پیش کی ہے وہ بہت اہم اور معلوماتی ہے۔ فنا و بقا کے سلسلے میں جہاں سے انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا ہے، اس میں امام ربانی کے ایک مکتوب کے ذریعے لطائف کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بیان کرنا برمحل ہوگا کہ مشائخ نقشبندیہ کا لطائف کے متعلق اپنا موقف کیا ہے۔ امام ربانی نے جن سات لطائف کا ذکر کیا ہے اصلاً وہ مشائخ نقشبندیہ کے نزدیک دس ہیں جنہیں لطائف عشرہ سے موسوم کیا جاتا ہے، وہیں بعض مشائخ نقشبندیہ نے اس کی تعداد کو چھ قرار دیا ہے، جسے وہ لطائف ستہ کہتے ہیں اور ان میں عناصر اربعہ کو شمار نہیں کرتے۔ لیکن امام ربانی نے عالم خلق کے پانچوں لطائف کو دو جگہ تقسیم کر دیا ہے، وہ تمام عناصر اربعہ (قالب) کو ایک لطیفہ قرار دیتے ہیں اور نفس کو دوسرا اور عالم امر کے پانچوں لطائف یعنی قلب، روح، سرّ، خفی اور اخفی کے اسرار سے بتدریج قالب کے لطائف کے اسرار کا ذکر نہیں کرتے، جب کہ اس خاکسار کے پاس ایک غیر مطبوعہ (خطی نسخہ) رسالہ حضرت فیض عالم نگینوی رحمۃ اللہ علیہ کا بعنوان 'کنز المعارف عرف مصباح العوارف' موجود ہے جس میں حضرت فیض عالم علیہ الرحمہ نے تفصیلی انداز میں لطائف کے تعلق سے گفتگو فرمائی ہے۔ امام ربانی اور حضرت فیض عالم علیہما الرحمہ کی گفتگو کو یکجا کر دیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی تکمیل ہو گئی ہے۔

اخیر میں ابرار رضا مصباحی صاحب کے مضمون کے متعلق صرف اتنا کہنا ہے کہ تذکیر و تانیث اور انشا کی اغلاط سے قطع نظر مضمون معلوماتی ہے۔

پیمانہ: ہر بار کی طرح اس بار بھی تبصروں کے لیے اہم کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مبصرین نے کم جگہ میں پوری بات کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مکتوبات: شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر علیم اشرف جائسی، محمد بدر الدین فریدی اور ڈاکٹر کوثر مظہری وغیرہ کی آراء اہم ہیں۔

نوٹ: آخر میں یہ عرض کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ رسالہ کسی عام ادبی یا مذہبی رسالے کی طرح غیر ضروری فلسفیانہ مباحث میں الجھانے کے لیے نہیں نکلتا، بلکہ اس کا تمام تر علمی مواد اور فلسفیانہ مباحث جریدے کے عنوان کی روشنی میں صرف اور صرف ایک حدیث کو زندہ کرنے کے درپے ہیں، تاکہ 'الاحسان' کے ذریعے ہم سب احسان کی راہ کو حاصل کر سکیں۔ گزشتہ تینوں شماروں کے مطالعے سے میں نے یہ ہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ والسلام

یاور اقبال (ذاکر نگر، نئی دہلی)

الاحسان کا تیسرا شمارہ نظر سے گزرا۔ اولاً میں اس رسالے کی اشاعت سے متعلق تمام اراکین کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے وقت کی ضرورت کے تحت بہت جامع اور معتبر رسالے کو جاری کرنے کا عزم کیا۔ الاحسان بلا مبالغہ برصغیر ہندو پاک میں اس وقت اپنی نوعیت کا ایک ہی پرچہ ہے اور میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بیک وقت تصوف کے تمام قدیم وجدید نظریات کی ترجمانی اتنے موثر انداز میں اب تک کوئی رسالہ نہ کر سکا تھا۔ یہ بات ہم تمام لوگوں کے لیے باعث شرم بھی ہے کہ حامیان تصوف کی اتنی بڑی جماعت کے ہوتے ہوئے ہمارے پاس صوفیانہ ادب کے نام پر اکّا دُکّا پرچے ہی ہیں۔ یہ لمحۂ فکر یہ ہے کہ ہم اپنے ادبی وعلمی سرمائے سے دن بدن دور ہوتے جا رہے ہیں۔ بہر کیف رسالے کے تمام مشمولات قابل ستائش ہیں۔ فرداً فرداً کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی لیکن کچھ نام لینا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے مجھے دوسرے مضامین کی نسبت زیادہ متاثر کیا، جن میں واردات از ذیشان مصباحی، مقصد حیات انسانی از شیخ ابوسعید صفوی، حافظ ابن قیم از ضیاء الرحمٰن علیمی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ از پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی اور مجدد الف ثانی کے چند ممتاز خلفا از ابرار رضا مصباحی وغیرہم کی تحریریں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بحث ونظر کا پورا باب بہت کارآمد ہے۔

اخیر میں میں سرزمین الہ آباد کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اسے اس بیش قیمتی شمارے کا مقام اشاعت ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

○○○

الاحسان - ۳ پر اخبارات ورسائل کے تبصرے

اردو بک ریویو، نئی دہلی، اپریل، مئی، جون ۲۰۱۲ء/ عارف اقبال

'الاحسان' کا یہ کتابی سلسلہ یقینی طور پر نئے حالات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اردو دنیا میں ایک اچھی علمی کوشش ہے۔ تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مکالمہ کے لیے مستقبل میں یہ مجلہ اردو دنیا کے حوالے سے امتی سطح پر عالمی پلیٹ فارم بن سکتا ہے۔ بشرطے کہ اس کے ادارتی امور سے وابستہ حضرات وسیع القلبی اور وسیع النظری کے ساتھ ہر طرح کی آرا کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اردو دنیا میں اس نوعیت کا منفرد مجلہ فی الحال دوسرا نظر نہیں آتا۔ اللہ کرے یہ سلسلہ دراز ہو۔

روزنامہ انقلاب، ۸/ اپریل ۲۰۱۲ء/ سید عینین علی حق

'الاحسان' خانقاہ عارفیہ الہ آباد کا ترجمان، تصوف پر علمی و تحقیقی مضامین پر مبنی مجلہ ہے، جس کا یہ تیسرا شمارہ منظر عام پر آچکا ہے۔ مجلّے کے مدیر حسن سعید صفوی ہیں۔ عرصۂ دراز سے تصوف، شریعت، طریقت جیسے اہم موضوعات پر مشتمل رسائل اور مجلوں کا فقدان نظر آرہا ہے مگر اس خلا کو پر کرنے اور ان موضوعات پر اعلیٰ معیار کے مضامین پیش کرنے کا کام خانقاہ عارفیہ نے الاحسان کے ذریعے انجام دیا ہے، جو اہل تصوف پر ایک احسان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۲۹/ اپریل ۲۰۱۲ء/ ڈاکٹر منور حسن کمال

تصوف پر علمی اور تحقیقی کتابیں اردو دنیا سے ناپید سی ہوتی جارہی تھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تصوف پر کتابیں بالکل ہی نہیں آتیں، لیکن ان کی تعداد کسی فیصد میں شمار نہیں ہوسکتی۔ اس کمی کو شاہ احسان اللہ محمدی صفوی نے بڑی حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی سرپرستی میں تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلہ 'الاحسان' شائع ہورہا ہے۔ اس کتابی سلسلے کے مدیر حسن سعید صفوی ہیں اور مرتبین مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی اور رفعت رضا نوری ہیں۔ مدیر، مرتبین اور معاونین نے 'الاحسان' کو خوب سے خوب تر بنانے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ 'الاحسان' ہر شمارے کے ساتھ مزید نکھرتا جارہا ہے اور اپنے جلو میں نت نئے مضامین اور تحقیقی مقالے لیے ہوئے ہے۔

روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی/ وصیل احمد خان

اسلامی نشاۃ ثانیہ کے حصول کے لیے اس تصوف کا احیا ضروری ہے جو اپنی اصل حالت اور یکسر بے آمیز صورت میں موجود ہو جس کی نشان دہی کتب احادیث میں 'احسان' کے حوالے سے کی گئی، نہ کہ تصوف کی بگڑی ہوئی وہ شکل جو آج کی بیشتر خانقاہوں میں رائج ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ''خانقاہ عارفیہ'' سید سراواں الہ آباد کے روح رواں اور سجادہ نشیں داعی اسلام شیخ ابو سعید احسان اللہ صفوی دامت برکاتہم کے زیر تربیت ایک ایسی جماعت تیار ہوئی ہے جس نے مجلہ ''الاحسان'' کے ذریعے اس خاص تصوف کی ترویج واشاعت کا بار گراں مایہ اپنے دوش پر اٹھایا ہے۔ زیر تذکرہ مجلہ 'الاحسان' اسی سلسلۃ الذہب کا تیسرا تحفۂ جاں فزا ہے جس میں شامل مضامین خالص اسلامی تصوف کی روشنی میں نہ صرف حیات بخش ہیں بلکہ معاشرتی اور سماجی سطح پر روح پرور انقلاب سے آشنا کرنے والے ہیں۔

ماہنامہ جام نور، دہلی، جون ۲۰۱۲ء/ پروفیسر اختر الواسع

چار سو آٹھ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ صرف رسالہ نہیں ہے بلکہ تصوف کی بازیافت کا ایک دائرۃ المعارفی نقیب ہے۔ اس رسالے کی ایک نمایاں خوبی تو یہ ہے کہ یہ خالص خانقاہی مزاج یعنی وسیع المشربی اور کشادہ دلی کی زندہ تصویر ہے۔ اس میں نہ کسی خاص مکتبۂ فکر کی ترجمانی ہے اور نہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری، بلکہ اس کے لکھنے والوں میں اتنا تنوع ہے کہ کسی رسالے کے لکھنے والوں میں اتنا تنوع اور اتنی فکری جہت نہیں ملیں گی۔ اس میں مختلف مسالک اور مختلف رجحانات کے نمائندہ اہل علم ودانش کی متوازن اور اچھی تحریریں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔

ماہنامہ 'سنی دعوت اسلامی، ممبئی، جون ۲۰۱۲ء/ توفیق احسن مصباحی

خانقاہ عارفیہ نے 'الاحسان' کو سال نامہ کی شکل میں حقائق ومعارف کے جس انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے وہ اسی کا حصہ ہے جس کی دور دور تک کوئی مثیل ونظیر نہیں ملتی۔ سرپرست ادارہ داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ کی توجہ خاص، مدیر حسن سعید صفوی کے حسن انتخاب اور مرتبین مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی اور رفعت رضا نوری صاحبان کی رفاقت ومحنت شاقہ نے اس جریدے کو ہندو پاک کے نمائندہ جرائد میں ایک امتیازی شان بخش دیا ہے۔

ماہنامہ ماہ نور، دہلی، جولائی ۲۰۱۲ء/ نورین علی حق

'الاحسان' کا ہر شمارہ پچھلے شمارے سے زیادہ بہتر، محقق، پراثر ہوتا جا رہا ہے اور اس کا حلقہ بھی روز افزوں ہے۔ آثار یہ بتاتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں مذہبی انقلاب جو آئے گا اس میں 'الاحسان' اور 'خانقاہ عارفیہ الہ آباد' کا بڑا اہم کردار ہوگا۔

شاہ صفی اکیڈمی کی اہم ایجنسیاں

اترپردیش: ○**ابومیانزشاھی اسٹور**، نور اللہ روڈ، الہ آباد-9839457055 ○**حجاز بک ڈپو**، سیف آباد، پرتاپ گڑھ-839112969 ○**مدرسہ فیض العلوم صابریہ**، گاندھی نگر، آگرہ-9286192523 ○**نور نبی بک سیلر**، ڈالمنڈی، وارانسی ○ **بہار:** ○**بک ایمپوریم**، اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ-9304888739 ○**انصار بک ڈپو**، بارہ پتھر، ڈہری اون سون-8603741579 ○**مدرسہ عارفیہ سعید العلوم**، نہوٹا شیر گھاٹی، گیا-9939479919 ○**رضابک سیلر**، کمپنی باغ، مظفر پور، بہار-9709634293 ○**دار العلوم تاج الشریعہ**، مصری گنج، مدھوبنی-9931431786 ○**خواجہ بک ڈپو**، مٹیا محل، جامع مسجد-9313086318 ○**راجا اسٹیشنری**، شاہین باغ Ext روڈ، نئی دہلی-9891590739 ○**مولانا شفیق**، مسجد عمر فاروق، شاہین باغ، دہلی-9716559786 ○**الجامعۃ الاسلامیہ**، جیت پور II، دہلی-9650934740 ○**شاہ صفی اکیڈمی**، بٹلہ ہاؤس، دہلی-9910865854 **کرناٹک:** ○**محمد سلمان**، سلاگٹہ، چکبالم پور 9880095263 ○**مولانا مشتاق**، بیلگام 8147449067 ○**مدرسہ بیت القرآن**، وینگل راؤ نگر، نیلور-9849647618 ○**برکاتی بک ڈپو**، عمران گیسٹ ہاؤس کمپلیکس، خواجہ بازار کے پیچھے، چھوٹا روضہ، گلبرگہ 9739752587 **کولکاتا:** ○**نیوز پیپر ایجنٹ**، رابندرا سارانی، کولکاتا-9748210140 ○**بک اسٹال**، نیئر مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا، 16_ 9330643486 ○**خانقاہ نعمتی**، مٹیابرج، کولکاتا-09831746380 ○**نسیم بک ڈپو**، کولوٹولہ، کولکاتا-9339422992 ○**رضا بک سینٹر**، روشن گلدار لین، تکیہ پارہ، ہاوڑہ-9330462827 **جھارکھنڈ:** ○**امدادیہ بک ڈپو**، جامع مسجد روڈ، ہزاری باغ-9835523993 ○**دار العلوم غریب نواز**، جھلوا، گڑھوا، جھارکھنڈ- ○**محمد اجمل**، جپلا، پلامو، جھارکھنڈ-9430003405 ○ **دلکش بک ڈپو**، رام گڑھ، جھارکھنڈ-9798306353 **مہاراشٹر:** ○**قاری سرفراز**، دھاراوی، ممبئی-9819291874 ○**شیخ جاوید اقبال**، شیلیس نگر، ممرا 9322865066 ○**محمد ابراہیم**، شولا پور 9421067863 **آندھرا پردیش:** ○**گلشن میڈیکیئر**، سکندر آباد، حیدر آباد 27716760 ○**میگھالیہ** ○**آمر نانگبری**، ہاویل روڈ، لابان، شیلانگ-8794042067 ○**حافظ شبیر شاداب**، دُرگ، چھتیس گڑھ-7869230382 **اڑیسہ:** ○**قریشی نیوز ایجنسی**، رجک سنیما روڈ، راورکیلا، اڑیسہ 9439499458 **گجرات:** ○**عادل نورانی**، الامین مسجد، سلطانیہ جمخانہ، سورت-9879657766 **راجستھان:** ○**غلام ذوالنورین**، حسینی مسجد، بیکانیر 9460172623

جمهورية مصر العربية

دار الإفتاء

مكتب المفتي

بسم الله الرحمن الرحيم

السادة جامعة عارفيه ـ الهند

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته . . وبعد :

فبإشارة إلى خطاب سيادتكم الوارد إلينا بتاريخ ٢٠١٣/١/٢٧م المتضمن : طلب موافقة فضيلة الأستاذ الدكتور/ علي جمعة ـ مفتي جمهورية مصر العربية على الانضمام لمجلس الشورى للمجلات الذي يتكون من هيئة علماء الكبار وذلك للاستفادة برأي فضيلة المفتي في إصدارات مجلة الإحسان التي تصدر عن أكاديمية شاه صفي التابعة للجامعية العارفيه.

فنحيط سعادتكم علما أنه بعرض الأمر على فضيلة المفتي أفاد بأنه ليس لديه مانع من الانضمام لمجلس الشورى للمجلات الذي يتكون من هيئة علماء الكبار .

شاكرين لكم ولكم تحياتي

وحيد أحمد عبد الجواد

مدير مكتب فضيلة

مفتي جمهورية مصر العربية

العنوان حديقة الخالدين ـ الدراسة ـ القاهرة ص.ب ١١٦٧٥
المكتب ٥٨٨٧٠٢٩ ـ ٥٨٨٧٠١٣ ـ ٢٠٢ ـ ٠٠
فاكس ٥٨٩٩٦٥٢ ـ ٠٢
تليفون الأسئلة ١٠٧ ـ ٢٠٢ ـ ٠٠
Web Site : http://www.dar-alifta.org , .com , .net
Email : Fatawa@dar-alifta.org

March 2013

Alehsaan

Issue : 4

(A Journal on Islamic Spirituality)

آؤ ایک نئی دنیا آباد کریں

امن وسلامتی کی دنیا، روحانیت اور دین داری کی دنیا

اور ایک ایسا انقلاب برپا کریں جو صوفیہ صافیہ کے منہاج پر ہو

کیوں کہ

صوفیہ کا طریق عمل ہی سب سے بہتر اور ان کی سیرت ہی سب سے پاکیزہ ہے

وہ عین شریعت پر قائم، چشمۂ وحدت سے سیراب اور مشکات نبوت سے روشن ہیں

اس لیے

مجھے صرف وہی انقلاب پسند ہے جو صوفیہ کے نقش قدم پر ہو

داعی اسلام شیخ

ابو سعید شاہ احسان اللہ

محمدی صفوی

Shah Safi Academy, Jamia Arifia
Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P. (India) 212213
973121 (India), +20-1140010981 (Egypt), Email:alehsaan.yearly@gmail.com

Edited, Printed and published by Hasan Saeed on behalf of Shah Safi Academy, Jamia Arifia
at Kainat Publication & Printers 14-H, South Housing Scheme, Tulsipur, Allahabad